"موت... مجھے تمہارے قریب لے آئی ہے... ڈیتھ!"

کسی بھی ایک موت کا ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے.. عمر رسیدہ' کچی' ناگہانی' حادثاتی' بے وجہ... کسی بھی موت کا... زمین کی پہلی موت پر جب کوے اترے تھے' چونچ سے مٹی کھود کر تدفین کی بجھارت سلجھاتے تھے' تب سے اب تک لمحۂ موجود کی آخری موت تک.. وہی ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے..

بُو ہوتی ہے۔

اگر یہ موت ایک چاردیواری' ایک کمرے کے اندر' ایک چارپائی پر ہوتی ہے جس کا بان درمیان میں سے ڈھیلا پڑ چکا ہوتا ہے اور بوجھ کو ظاہر کرتا ہے کہ مرگ وزن بڑھا دیتی ہے بے جان بدن کو بھاری کر دیتی ہے اور اسے کندھا دینے والے ہمیشہ محسوس کرتے ہیں کہ جب وہ سانس لیتا تھا تو اتنا بھاری ہرگز نہ تھا.. تو اس ایک کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک ٹھنڈی' نتھنے جس سے آشنا نہیں ہوتے' ایک ناگوار بُو ہوتی ہے' جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بدن کتنی دیر پہلے ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوا تھا۔ بھاری ہو گیا تھا.. مرنے والے کے آخری سانسوں کی' اس کے اعضاء کی گرفت ڈھیلی اور بے جان ہونے پر اس کے اندر جو کچھ تھا' اس کے بے اختیار خارج ہونے پر.. گلے میں بجنے والے آخری گھنگھرو کی صدائیں معلق.. اور بُو ہوتی ہے جو کمرے کی ہر اِک شے پر حاوی ہو چکی ہوتی ہے...

اور بُو کے سوا بین ہوتے ہیں..

فہیم سرونٹوں' سرکنڈوں' کاہاں' سر' کوندرے' لائی اور لہنا کے بوٹوں اور جھاڑیوں

میں سے راستہ بناتا... اور سروٹوں پر اب پچھلے جنم کے سائے جھومر نہ ڈالتے تھے' سویر کی دھند میں گھلی ہلکی روشنی تھی.. ملاحا ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساڈھے یار دو نجناں... گنگناتا... آخری ناشتہ... آخری پراٹھے اور غروب کی زردی والے دیسی انڈوں کی زردی کو سنبھالتا اترتا ہے' سروٹوں کے گھنے وجود میں سے نکل کر ریتلے کنارے پر اترتا ہے اور ریت پر اوس کی ٹھنڈک اور جماؤ ہے جس پر پاؤں رکھتا وہ سندھ سائیں کے پانیوں میں ٹھہری کشتی کی جانب چلتا جاتا ہے... اور اپنے گھر واپسی کی مسرت میں ومکتا گنگناتا آتا ہے کہ آج پانی کی قید کا آخری دن تھا... آخری ناشتہ تھا..

صاحب رات کشتی میں ہی رہ گیا تھا..

ان سے جدا ہو کر ادھر آیا تھا اور ادھر ہی رہ گیا تھا..

سویرے' ناشتے کے لیے وہ سروٹوں کے ذخیرے کے درمیان پوشیدہ اس آخری پڑاؤ میں واپس نہیں آیا تھا' جہاں پچھلی شب آگ کی سرخ توانائی کی بھڑکتی' لپکتی اور پھر ٹھنڈی ہوتی زبانوں کے گرد وہ تینوں جھومر ڈالتے تھے.. اسی لیے وہ صاحب کا ناشتہ لے کر ادھر آ رہا تھا..

ابھی ہلکی دھند تھی جو پانیوں پر تیرتی تھی..

جیسے تخلیق کے پہلے دن تیرتی تھی.. لیکن ابھی یہ حکم نہیں اترا تھا کہ روشنی ہو جا... صرف طلوع کا ضیالا سونا تھا' جو سندھ سائیں کی آبی چادر پر بچھا ہوا دکھائی دیتا تھا' جس کے کنارے وہ کشتی فہیم کے آخری ناشتے کی ٹرے کے قریب آتی جاتی تھی' جس کے اندر صاحب ابھی تک سوتا تھا...

کشتی کے تختوں پر جو گل بوٹے نقش تھے' وہ بھی ہلکی دھند میں دھندلاتے تھے پر آہستہ آہستہ قربت میں آنے پر دکھائی دیتے جاتے تھے..

فہیم نے چھابے میں دھرے پراٹھے کو اپنی پوروں سے چھوا... ابھی تک گرم تھا' انڈے کی زردی میں بھی ایک نامعلوم سی حدت قائم تھی اور پھر اپنا گنگنانا موقوف کر کے کشتی کے اندر جھانکا...

"ناشتہ کریں گے سائیں.."

سائیں... اپنے سلیپنگ بیگ میں منہ کھولے... بے سدھ پڑا تھا..

بارہ کہو کے مسمار شدہ کھنڈر میں ملبے تلے دبے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی چلی جاتی تھی..

"خاور... کیا یہ آپ ہیں؟"

سائیں جاگتا نہ تھا... اور فہیم آوازیں دیتا تھا کہ صاحب.. ناشتہ تیار ہے..

صاحب' منہ کھولے اپنے سلیپنگ بیگ میں بے سدھ سوتا تھا.. اور اس کے چہرے پر ایک مکھی تھی' جو بار بار بیٹھتی تھی... کچھ دیر بیٹھتی تھی.. اور پھر بھنبھنا کر اڑتی اور پھر بیٹھ جاتی تھی..

یہ کسی بھی موت کا... سب سے پہلی یا آخری.. موت کا ماحول تھا یا نہیں... صرف وہ ایک مکھی جانتی تھی جو سائیں کے ادھ کھلے منہ کے ہونٹوں پر... کبھی ماتھے پر اور کبھی بالوں پر بیٹھتی تھی اور پھر بھنبھنا کر اڑ جاتی تھی اور پھر آ بیٹھتی تھی۔

اس نے اسوا پر سوار اونچی ناک والے آریاؤں کی نظروں سے بچ کر ادھر سندھ ساگر کے کناروں پر تین ہزار برس گزار دیے تھے..

اس کا چہرہ مہرہ دراوڑی تھا. چوڑا جنوروں ایسا جبڑا... بڑے نتھنوں والی پھیلی ہوئی ناک۔ سیاہی میں سلگتی سیاہ لشکیلی آنکھیں اور اٹھی ہوئی لچکدار چھاتیاں جن پر.... اگر وہ سندھ میں ڈبکی لگا کر ابھرتی تھی تو ان پر پانی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے..

وہ اپنا میلا کچیلا جھگا گریبان میں اڑسے اپنے بچے کے منہ میں ایک تنی ہوئی چھاتی دیئے اسے دودھ پلا رہی تھی.. اور بار بار اپنے بچے کو آگے کرتی تھی تاکہ دباؤ سے دودھ بڑھے.. اور بچے کی چپٹی ناک اس کے زور سے مزید چوڑی ہوتی تھی اور اس کا دم گھٹتا تھا.. اور وہ ایسے اطمینان سے اور لاپروائی سے دودھ پلاتی تھی' جیسے کوڑے کے ڈھیر پر دراز ٹانگیں پھیلائے ایک کتیا اپنے پلّے کے ہونٹوں کو اپنے تھن پر پچکتے اور اس کے اندر سے ماں جائی کا رس چوستے ہوئے... نہایت اطمینان اور کسی شرم کے بغیر لیٹی رہتی ہے..

وہ اپنے سیاہ لوتھڑے کو دودھ پلانے میں مگن تھی جب وہ دونوں سندھ ساگر کے کنارے ڈولتی اس کشتی کے قریب آئے' جس میں وہ بار بار آگے ہو کر بچے کے منہ میں دباؤ بڑھاتی تھی..

"سائیں اس کشتی میں اتریں گے.." سرور کے سیاہ ماتھے پر پسینہ دکھائی نہ دیتا تھا.

دودھ پلاتی سیاہ فام عورت کے سوا ایک سات آٹھ برس کی اسی کی نسل کی ایک بھورے بدرنگ بالوں والی نہایت غلیظ ننھی سی بچی تھی' جو کشتی کے فرش پر رکھے مٹی کے چولہے پر چڑھی ہنڈیا میں بے دلی سے ڈوئی ہلاتی تھی... سرور نے جب یہ کہا کہ سائیں اس

کشتی میں اتریں گے تو اس نے ان بدیشیوں پر اپنی جنوروں ایسی کالی بھور آنکھیں پل بھر کے لیے اٹھا کر مرکوز کیں اور پھر ان کی موجودگی سے غافل ہو کر ڈوئی چلانے لگی۔

یہ کشتی... ایک کٹیا تھی..

پانیوں کے جنگل میں ایک بسیرا تھا.. اس کے اندر تام چینی کے پچکے ہوئے دھوئیں کی سیاہی میں پوچے ہوئے برتن تھے.. میلے کچیلے بستر' گھی کے خالی ٹین' کچھ اُپلے اور ایک کونے میں ڈھیر ایک جال تھا.. اور عورت کے کچے دودھ کی مہک تھی..

"سرور..." عباس برمانی نے دھیمے غصے میں اس کا نام لیا.. وہ دھیمے مزاج کا دھیمی بات کرنے والا شخص تھا اور اپنی آواز کو بلند کرنے پر قادر نہ تھا..

سرور اس سائیں کے دھیمے پن سے آشنا تھا اس لیے فوراً چوکنا ہو گیا..

"ابھی خالی ہو جاتی ہے سائیں... اوئے پکھیے.." اس نے دودھ پلاتی عورت کو ایک للکارا مارا...

عورت نے اس للکار کا کوئی اثر نہ لیا.. آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون ہے... صرف اپنا میلا کچیلا جھگا جو گریبان میں اڑسا ہوا تھا' نیچے کر لیا تاکہ اس کی چھاتی اور اس پر بیتابی سے منہ مارتا بچہ زیادہ دکھائی نہ دے' اسے ان غیروں کی نظر نہ لگے.. یہ اونچی ناک والے جدھر دیکھتے تھے... ہڑپہ یا موہنجو کو جدھر دیکھتے تھے اسے کھنڈر کر دیتے تھے.. ان کی نظرِ بد سے اگر وہ آج تک بچتی آئی تھی تو آج بھی بچ جائے..

"یہ تو ابھی خالی کھڑی ہو جاتی ہے سائیں.." سرور اس عورت کی بے اعتنائی سے بہت واقف تھا اور شرمندگی کا پسینہ اگرچہ اس کے ماتھے پر دھوپ کی حدت سے قل کر پھوٹا جاتا تھا' لیکن دکھائی نہ دیتا تھا.

غازی گھاٹ کے ناقص اور دراڑوں سے بھرے ڈولتے پل کے نیچے... سندھ ساگر کے بائیں کنارے پر مہانوں کی تین کشتیاں.. تین کٹیائیں.. تین بسیرے.. ہولے ہولے ڈولتے تھے اور ان کے قریب ریت پر کڑی دھوپ میں سرکنڈوں کے چند چھپر تھے' جن کے سائے میں سرور اور پکھی کی نسل کے مہانے.. بوڑھے' بچے اور عورتیں... کابھاں کی شاخوں سے ٹوکرے بنتے تھے اور لائی کی لکڑی سے پنکھوں کی ڈنڈیاں تراشتے تھے اور پسینے میں نہاتے تھے اور ان کے سیاہ بدنوں پر جو دھاریں بہتی تھیں' وہ نظر نہ آتی تھیں اور فوراً

خشک ہو جاتی تھیں۔

اُن سب نے.. جو چھپروں کے سائے میں سر جھکائے بیٹھے تھے اُن دونوں کی آمد میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی.. ایک بار توجہ کی کہ غازی گھاٹ پل سے اُتر کر کون آیا ہے اور پھر سر جھکا کر سندھ ساگر کے بیلوں میں سدا سے اُگنے والے سرکنڈوں... لائی اور کانہاں کے سرکنڈوں سے.. تب سے اُگنے والے جب اونچی ناک والوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا.. ان سے ٹوکرے باندھنے اور پنکھیوں کی ڈنڈیاں بنانے اور تراشنے میں محو ہو گئے..

اگرچہ ابھی سردرُتیں رخصت نہ ہوئی تھیں لیکن دوپہر کی شدت پانیوں کی نزدیکی کے باوجود کم نہ ہوتی تھی... بلکہ پانی دھوپ کو دوچند کر کے چہروں کو چندھیاتے تھے..

ادھر نیچے سندھ ساگر کی قربت میں مہانوں کی کشتیاں.. تین کشتیاں ڈولتی تھیں..

برمانی سامان کو ترتیب دینے کے لیے اوپر بند پر جا چکا تھا۔

اور اوپر... غازی گھاٹ کے مخدوش پل کے داخلے پر... ملتان سے مظفر گڑھ کے راستے پر.. مسافر بسوں' ویگنوں' ٹریکٹر ٹرالیوں اور پرائیویٹ کاروں کی ایک لمبی... بے چین اکتائی ہوئی ایک کسمساتی ہوئی قطار تھی' جو مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک کے خاتمے کی منتظر تھی.. بار بار انجن سٹارٹ ہوتے تھے اور پھر لاچارگی سے بند ہو جاتے تھے... اور ہارن بے وجہ اور مسلسل بجتے چلے جاتے تھے.. دوسری جانب سے آنے والی ٹریفک کا بہاؤ کم ہی نہ ہوتا تھا.. وہ آخری ویگن یا ٹریکٹر ٹرالی آتی ہی نہ تھی' جس کے بعد وہ اپنی سواری کو حرکت میں لا کر پُل پر دوڑ سکتے تھے۔

پُل کی تعمیر کو اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن وہ اب دوطرفہ ٹریفک کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں تھا..

گنڈیریاں بیچنے والے.. مقامی کھویا اور نمکین دالیں فروخت کرنے والے بچے اس رکے ہوئے ٹریفک کے اژدہام میں سے اپنی روزی کشید کرتے تھے..

اوپر... شوروغل کی یہی کیفیت مسلسل تھی..

اور ادھر نیچے...

پُل کے آہنی ڈولتے ہوئے وجود کے عین نیچے.. مہانوں کی یہ چھپر بستی

تھی.. سندھ ساگر کے کنارے.. ان کے گھر.. ان کی تین کشتیاں تھیں.. ہزاروں برس پیشتر جانے وہ کس سرسوتی کے کناروں پر آباد تھے جس کے سوکھنے پر... وہ ادھر آ نکلے تھے.. اونچی ناک والوں کی نظر بد سے بچ کر.. اور زمین کو تیاگ کر پانی کو گھر بنا لیا تھا..

اور ان ڈولتی کشتیوں میں سے ایک ایسی تھی جس کے اندر... اپنا جھگا نیچے کیے اپنے بچے کو چھپائے دودھ پلاتی ایک عورت تھی' ایک ہانڈی میں بے دلی سے ڈوئی چلاتی بچی تھی اور ان دونوں کو اب صرف اس کے لیے.. ایک اونچی ناک والے کے لیے... اس گھر سے بے گھر ہونا تھا.. صرف اس کے دھن کے لیے.. اپنا بوریا بستر سمیٹنا تھا.. چولہا بجھانا تھا. پچکے ہوئے تام چینی اور سلور کے دھواں لگے برتن اٹھانے تھے.. اور اُسے چھاتیوں میں سے بہتے بچے دودھ کی مہک سے خالی کر دینا تھا.. صرف دھن کی خاطر... کنارے کے کسی چھپّر میں جا رہنا تھا اور تب تک رہنا تھا جب تک یہ غیر لوگ کشتی میں گھوم پھر کے پرندے مار کر واپس نہیں آ جاتے.. سندھ ساگر میں کیا تھا جو یہ لوگ اپنے شہر چھوڑ کر ادھر آ جاتے تھے.. ہمیشہ کلیجہ دھڑکتا تھا کہ یہ کشتی لے کر جائیں گے اور پھر کبھی نہیں لوٹیں گے.. زور زبردستی سے اس پر اپنا حق جتائیں گے.. اس میں آباد ہو جائیں گے.. اونچی ناک والوں کو دیکھ کر اسی لیے ہمیشہ کلیجہ دھڑکتا تھا.

بہت بعد میں.. جب وہ اس کشتی میں کئی روز پانیوں پر سفر کر چکا تھا.. آج کی اس عورت کی دودھ پلاتی اٹھی ہوئی چھاتیوں کو بھول چکا تھا.. اس گدلے پانیوں ایسے بالوں والی بچی کے آگے چولہے پر دھری ہانڈی اور اس میں چلتی ہوئی ڈوئی کو یکسر فراموش کر چکا تھا.. اور اس کشتی کے سوا اپنے وہ سب گھر' جن میں اس نے زندگی بتائی تھی' وہ فلیٹ وہ کمرے وہ سب چھتیں اس کی یاد سے محو ہو چکی تھیں جن میں اس نے یہ ساٹھ برس بسر کیے تھے.. ان گھروں اور کمروں میں اس کی ماں تھی اسے گرائپ واٹر پلاتی ہوئی... شانے سے لگا کے اس کی ننھی سی پیٹھ تھپکتی ہوئی تاکہ وہ دودھ ہضم کر کے ڈکار لے.. بہن بھائی تھے.. اور آوارہ گرد باپ تھا جو یکدم کسی بھی صبح اپنے بستر پر نہ ہوتا' کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر غائب ہو جاتا.. مہینوں اس کی خبر نہ ملتی.. ایک بار وہ پورے تین برس تک لاپتہ رہا.. واپس وہ بہرحال آ جاتا اور جب واپس آتا تو اس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہوتی' لاغر اور لاچار ہوتا' عجیب لباسوں میں ہوتا اور کبھی نہ بتاتا کہ وہ کہاں تھا' کدھر تھا اور کیوں تھا.. بس کسی ایک شام وہ

دروازے پر دستک دیتا... بچوں کو ایک نظر دیکھتا' جو اس کی غیر موجودگی میں بڑے ہو چکے ہوتے اور پھر ماں سے کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا.. دو تین روز بعد کسی صبح بیدار ہو کر کمرے سے باہر آتا اور صرف یہ کہتا "آج ناشتے کے لیے کیا ہے؟" اور پھر ویسا ہی گھریلو اور پُر شفقت ہو جاتا جیسا کہ وہ گم ہونے سے پیشتر ہوا کرتا تھا... ماں بڑے اہتمام سے اس کی غیر موجودگی کے دنوں میں اس کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتی اور بستر کی چادر تبدیل کر دیتی... اور ان کمروں اور چار دیواریوں میں کچھ محبتیں تھیں' بہت ساری اذیتیں تھیں' شرمندگی تھی.. اس کی بیوی تھی.. اور اولاد تھی.. لیکن وہ ان سب کو پانیوں کے طویل سفر کے دوران بھول چکا تھا اور اس کے لیے گھر صرف ایک کشتی تھی جس میں ابھی ایک دودھ پلاتی عورت اور ہانڈی میں ڈوئی چلاتی بچی تھی..

جب وہ سدا سے اس کشتی میں تھا.. ہمیشہ سے پانیوں پر بسیرا کرتا تھا.. سب کچھ بھول چکا تھا سوائے اپنے ساٹھ برسوں کے تب ایک روز اس نے دیکھا کہ سرور اگرچہ اس کشتی کو اپنے اسباب اور بوریا بستر سے خالی کر چکا تھا لیکن ایک زنگ آلود کیل سے ٹنگا نیلے پلاسٹک میں جڑا ایک آئینہ رہ گیا تھا.. اس کے ساتھ شاپر بیگ کی ایک پوٹلی بھی رہ گئی تھی جس میں تبت سنو کی ایک تقریباً خالی شیشی' ایک شکستہ دندانوں والی کنگھی اور نیلے رنگ کی ہی ایک سستی لپ سٹک کا ٹکڑا رہ گیا تھا.. یہ جانے کس کا سامان آرائش تھا.. پکھی کا نہیں کہ وہ ان کے ہمراہ سفر کرتی تھی.. شاید یہ ڈوئی چلاتی بچی کی سب سے قیمتی متاع تھی.. کیل سے ٹنگے اس بجھے ہوئے آئینے نے اسے سحر سے بھرے بہت سے آبی منظر دکھائے... وہیں کشتی کے فرش پر لیٹے ہوئے' اسے دریا تو نظر نہ آتا لیکن سرور کے میلے گدّوں پر لیٹے ہوئے جب اس کی نظر اس آئینے پر جا ٹھہرتی تو ایک خاص زاویے سے اس میں سندھ ساگر کا ایک حصہ بہتا ہوا دکھائی دینے لگتا.. جیسے ایک پوسٹ کارڈ کے سائز کی ٹیلی ویژن سکرین پر کوئی دریائی منظر چل رہا ہو... لیکن یہ بہت دن بعد کی بات تھی.. اور ابھی سرور نے پھر ان کو تسلی دی تھی کہ کشتی ابھی خالی ہوئی کھڑی ہے سائیں اور "اوئے پکھیئے.." ذرا غصے میں آ کر کہا تھا.. عورت نے ناگواری سے بچے کا دودھ چھڑا لیا' جھگا درست کیا لیکن اٹھی نہیں وہیں گوٹھ مارے بیٹھی رہی...

سرور نے ایک بار پھر سے پکھی کو جھڑکا اور پھر ان سے اجازت لے کر ٹیلے کے

پہلو میں پتھروں کے اونچے بند پر ڈھیر اس کا سامان نیچے لانے کے لیے آہستہ آہستہ بند پر چڑھنے لگا۔

سرور گیا تو کشتی میں گوٹھ مارے بیٹھی عورت جواب بچے کے پیٹ پر تھپکیاں دے رہی تھی' ڈوئی چلاتی بچی... اور چھپروں تلے پنکھیوں کی ڈنڈیاں تراشتے اور ٹوکرے بناتے بوڑھے بچے اور عورتیں اسے سیاہ آنکھوں کے جال میں جکڑنے لگے۔ اپنا کام کاج چھوڑ کر صرف اسے دیکھنے لگے' جیسے وہ صرف سرور کی موجودگی سے ہچکچا رہے تھے اور اب ایک غیر وجود کی دخل اندازی کو ناپسندیدگی سے گھورتے تھے..

دوپہر بہت گرمی اور تیز تھی..

اور سندھ ساگر کے ریتلے کنارے پر وہ مزید گرمی اور تیز ہوتی تھی۔

حلق سوکھتا تھا۔

اس نے ماتھے پر سیلوٹ کے انداز میں ہتھیلی رکھی تو اس کے سائے میں آ کر آنکھوں کو تیز دھوپ سے سکون ملا اور وہ اوپر دیکھنے لگا جدھر سرور گیا تھا۔ وہ بند کے اوپر پہنچ کر جانے کیا کر رہا تھا' سامان باندھ رہا تھا نیچے لانے کے لیے یا دم لینے کی خاطر کیکروں کے سائے تلے سستا رہا تھا.. یہاں سے کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا..

وہ اب بھی اس سفر کو ترک کر سکتا تھا.. اس کا جواز کچھ بھی نہ تھا... عمر اور محبت سے فرار ہونا تو کوئی جواز نہیں۔

یہ سفر اب بھی منسوخ کیا جا سکتا تھا..

اوپر بند پر پہنچ کر وہ برمانی کو کہہ سکتا تھا کہ ڈاکٹر.... نہیں!

لیکن یہ روانگی سفر کا پہلا خوف پہلا وسوسہ تھا جسے اس نے دبا دیا.. اب تو کنڈی پانی میں ڈال دی گئی تھی بھلے اس کے ساتھ کوئی مچھلی لگے نہ لگے.. اب اسے ترک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سندھ ساگر کے پانی بہت معمولی اور گدلے.. ان میں کوئی خاصیت نہ تھی.. دور تک بہتے جاتے تھے. یہی پانی وادیٔ خپلو کے راستے میں اتر کر دریائے شیوک میں مدغم ہوتے تھے.. اگرچہ اس مقام پر شیوک کا وجود اس سے کہیں بڑا اور چوڑے پاٹ کا تھا لیکن ان دونوں کے ملاپ کے بعد... شاید اس میں نصیب کا عمل دخل تھا کہ اسے شیوک کی بجائے سندھ کا

نام ملا... گول کے قصبے سے گزر کر وہ سکردو کی عظیم وسعت میں پھیلاؤ کا ایک ایسا منظر تخلیق کرتا تھا جو دیکھنے والوں کو حیران کرتا تھا...وادیٔ شگر سے آنے والے شاہ گوری کی برفوں والے دریا برالڈو کے پانی بھی اب اس میں شریک تھے.. سکردو سے آگے وہ تنگ درّوں اور اونچی چٹانوں میں گھر کر چنگھاڑتا اور وحشی ہوتا تھا..اپنے وجود میں گرنے والی چٹانوں کو لمحوں میں پیس کر ریت بنا دیتا تھا.. بشام میں اس کی سلیٹی چادر کروٹیں بدلتی تھی..اس کی پھنکار مدھم پڑتی جاتی تھی کہ اب روانی کے دن قریب آتے تھے...پہاڑوں کے شکنجے سے نکل کر اب بہاؤ میدانوں کی جانب تھا لیکن ایک فرق کے ساتھ...وہاں یہ صرف ایک دریا تھا اور یہاں غازی گھاٹ کے پل کے نیچے وہ ایک تہذیب تھا..وہاں اس کے کناروں پر جو لوگ رہتے تھے' تو اس کے پانیوں سے کہیں بلند اپنے کوہستانی گھروں میں رہتے تھے..اس سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے..ان کا آپس میں کوئی میل نہ تھا..وہ کہیں نیچے تھا اور وہ کہیں بہت اوپر... لیکن یہاں وہ دونوں ایک دوسرے میں رہتے تھے..یہاں وہ اس کے پانیوں میں رہتے تھے اور ان میں بسیرا کرتے تھے..یہ رزق تھا' جواز تھا اور وجود تھا..یہاں پہنچ کر سندھ معتبر ہو گیا تھا..

اس نے آنکھوں کے آگے ہتھیلی کے چھجے کو ذرا اوپر کیا اور بند کے پتھروں کی جانب وہاں دیکھا جہاں سرور شائد کیکروں کے سائے میں سو رہا تھا اور برمانی سامان کو ترتیب دے رہا تھا..

گردن گھما کر اس نے اُدھر دیکھا جدھر "انڈس کوئین" تھی..

اس کشتی بستی اور تیز دھوپ میں تقریباً سلگتے سکوت میں آئے سرکنڈوں کے چھپروں سے پرے... سندھ کے ریتلے کنارے سے پرے' جہاں سے ہریاول اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا وہاں..ان کھیتوں میں "انڈس کوئین" تھی..

ابھی جب وہ ایک کھڑکھڑاتی اپنے اور مسافروں کے انجر پنجر جھنجھوڑتی ٹویوٹا ہائی لیکس میں اس آبی سفر کے سامان لادے برمانی کے ہمراہ چوئی زیریں سے آغاز کر کے اوپر غازی گھاٹ کے پل پر اترا تھا' اپنے آپ کو مسافت کے جھولنے سے جھٹک کر قائم کیا تھا اور چہرے پر سے گرد پونچھی تھی تو پل پر سے اس نے نیچے کشتی بستی اور چھپروں اور مُہانوں کے ننگ دھڑنگ سیاہ بچوں کو اس نے بعد میں دیکھا تھا..اس کی نگاہ سیدھی "انڈس کوئین" پر جا ٹھہری

تھی..اس نے خیال کیا کہ ادھر سائیں انڈس کی کوئی شاخ نکلتی ہے... بہاؤ سے جدا ہو کر الگ ہوتی ہے جس میں یہ پرانی وضع کا سٹیم شپ مسافروں کی آمد کا منتظر لنگر انداز ہے اور عین ممکن ہے کہ جتنی دیر میں وہ ٹویوٹا سے سامان اتروا کر پل سے نیچے اترے وہ اپنا بھونپو بجا کر دھواں چھوڑتی سندھ میں داخل ہو کر رواں ہو جائے..وہ دریائے مسس پی میں چلنے والے کسی قدیم سٹیم شپ کی کوئی عزیزہ تھی جو بھٹکتی ہوئی ادھر آ نکلی تھی..اپنے کسی مارک ٹوین کے ساتھ..سونے کی تلاش میں سرگرداں ایک کاؤبوائے' غلاموں کے کسی سوداگر اور دربدر ہونے والے ایک ٹریمپ ایک آوارہ گرد کے ساتھ...

لیکن وہ...دریائے مسس پی میں چلنے والے بھونپو بجاتے' سفید دھواں چھوڑتے کسی سٹیم شپ کی عزیزہ نہ تھی..

اور انڈس کی کسی ذیلی شاخ میں لنگر انداز نہ تھی۔

وہ خشکی پر ویران پڑی تھی...اس کے پانیوں کے سفر کے دن پورے ہو چکے تھے..

زنگ آلود شکستگی سے دوچار ڈھانچہ سندھ کے پانیوں سے دور ہرے بھرے کھیتوں میں جلاوطن تھا..اس کا وسیع اور بھاری وجود موسموں اور مدتوں سے اپنا توازن ڈانواں ڈول کر چکا تھا اور وہ سندھ کی جانب ہلکے جھکاؤ میں تھی جیسے ان کی آرزو میں ایسی ہو گئی ہو..اور یہی جھکاؤ اس کے بے جان ہونے کی دلیل تھا۔

وہ تنہا کھڑی تھی.. سندھ کے پانیوں پر حکمرانی کرنے والی اجڑ چکی ملکہ...

جیسے ایک سفید وہیل سمندر کے زور آور پانیوں کے ریلے میں بے اختیار بہتی ہوئی کنارے سے دور ریت پر رہ جاتی ہے اور پانی سمٹتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں' اسے تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔اگرچہ وہ تڑپتی ہے.. کھسکتی ہے.. گلپھڑے پھلا پھلا کر دُم پٹختے ہوئے سعی کرتی ہے کہ اپنے پانیوں میں واپس چلی جائے..اور بالآخر بے جان ہو جاتی ہے۔

"انڈس کوئین" بھی جانے کن زمانوں میں اپنے پانیوں سے بچھڑی تھی اور اب مدت سے بے جان پڑی تھی..ایک ڈھانچہ ہو چکی تھی..اب اگر وہ پانی کسی طور اس تک پہنچ بھی جائیں' اس کے آہنی وجود کو بھگو بھی دیں تب بھی اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ ان پر تیرتی ہوئی سندھ کے بہاؤ میں جا شامل ہو...وہ ہمیشہ کے لیے کھنڈر ہو چکی تھی..

اس ورا وڑ مہاندرے کی عورت پکھّی سے.. بچی کی ہانڈی میں مسلسل چلتی ڈوئی سے.. اور چھپروں تلے گھومتی مرغیوں اور ٹوکرے باندھتے ڈنڈیاں تراشتے لوگوں سے.. وُہ شرمندگی کی نظریں بچائے.. کہ ان سب کے چہروں پر اس کے لیے ناپسندیدگی کے سوا کچھ نہ تھا.. وہ ان سے پرے ہوا.. اور وُہ یہاں بے مقصد کھڑا کرتا بھی کیا.. اس نے ان سے منہ موڑا اور چلنے لگا.. ریت جو بہت لُو ستی گرم تھی اس میں سے پاؤں مشکل سے کھینچتا... پسینہ پونچھتا اس مردہ وہیل کی جانب چلنے لگا... سرورا ابھی تک اوپر تھا' سامان باندھتا یا سوتا تھا.. وہ اس ڈھانچے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے گرم ریت پر چلنے لگا.. اس کے قریب ہوتا گیا.. اور قریب ہوا تو وہ زنگ آلود ہواؤں اور موسموں کا کھایا ہوا وجود جو دُور سے ایک معمولی دو خانی جہاز لگتا تھا کھیتوں میں پھنسا ہوا تو وہ ایک ٹائی ٹینک کا حجم اختیار کرتا گیا... پانی کی گہرائی میں ڈوبنے کی بجائے خشکی پر غرق شدہ.. کھنڈر ہوتا.. کھیتوں کے بیچ وہ ایک آہنی کرسمس کیک کی طرح پڑا تھا.. جس کی چادر پچکی ہوئی تھی اور سفید پینٹ کی پپڑیاں اتر رہی تھیں..

اس کے دامن میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھنے سے اس کے وجود کا بے پناہ انبار گرتا ہوا محسوس ہوتا تھا.. ترچھا ہو کر جھکا ہوا جیسے برسوں کی تپسیا کے بعد ایک نیم جان جوگی پہلو بدلتا ہے تو توازن قائم نہیں رکھتا ضعف سے ایک جانب جھک جاتا ہے۔

ایک آہنی اور سالخوردہ زینہ اوپر عرشے کے ساتھ جڑا ہوا تھا..

زینے کا سہارا لرزش میں تھا' راؤ جسے تھامتا وہ اوپر جاتا تھا دھوپ کی حدت جذب کیے اس کی مٹھی میں چھالے ڈالتا تھا.. وہ آہستہ آہستہ بلند ہو کر عرشے پر آ گیا...

جیسے میکسیکو کے قدیم انکا اہرام میں کوئی ماہر آثار قدیمہ کھوج لگاتا پہلی بار داخل ہو.. باہر رہ گئے استوائی جنگلوں کے بعد پہلا سانس اس ہوا میں لے جو ہزاروں برسوں سے ٹھہری ہوئی ہو.. اور اس میں تادم ہنوز ان تمام لوگوں کے سانس ابھی تک موجود اور محفوظ ہوں.. پجاریوں اور غلاموں کے سانس جو یہاں اپنے سونے کے دیوتاؤں کے سامنے جھک کر اس زیر زمین تاریک دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں.. وہاں ظروف ہوں سونے کے اور نقاب ہوں بادشاہوں اور ملکاؤں کے.. جو اندھیرے میں بھی لو دیتے ہوں.. تو وہ شخص جھجک جاتا ہے.. کہ میں مخل ہوا ہوں مجھے ہزاروں برس کا یہ سکوت نہیں توڑنا چاہیے تھا...

خاور نے بھی یہی محسوس کیا.. اسے مخل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

کیونکہ "انڈس کوئین" کے ڈھانچے کے اندر ان تمام مسافروں کے سانس اور وجود موجود تھے جنہوں نے کبھی اس کے عرشے پر قدم رکھا.. اس میں سفر کیا.. کوٹ مٹھن تک... پولیٹیکل ایجنٹ.. برٹش راج کے وفادار فیوڈل.. اس کے رکھوالے مقامی سپاہی اور انگریز افسر... یسوع کی روشنی سے نیٹوز کے غیر تہذیب یافتہ مہاندروں کو چندھیانے والے مشنری... سیاہ فام نرز.. جو بھیل دراوڑوں کی بستیوں سے نکل کر یسوع کی دولہنیں بن گئی تھیں اور معتبر ہو گئی تھیں.. انہوں نے اپنے آپ کو برتر سمجھنے والے ہزاروں برسوں سے دھتکارنے والے ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں سے بدلہ لیا تھا اور راج کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے ان سے بلند ہو گئی تھیں.. اور طالع آزما آوارہ گرد یورپی جن کے سفر نامے فوجی مہمات کے دوران راج کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتے تھے.. یہ سب غیر مرئی طور پر یہیں انڈس کوئین کے ڈھانچے میں موجود تھے اور سانس لیتے تھے۔

کچھ کے سانسوں میں برانڈی اور سکاچ مہکتی تھی۔

عرشے کے دھول آلود اور دیمک کے چاٹے ہوئے چوبی تختے جا بجا اکھڑے ہوئے تھے اور ان پر پاؤں دھرتے خیال کرنا پڑتا تھا.. البتہ لوہے کے بھاری زنگ کھائے ہوئے لنگر ابھی جوں کے توں تھے اور عرشہ انہیں ابھی تک سہار رہا تھا..

عرشے کے بعد ایک راہداری آتی تھی' جس کے بائیں ہاتھ پر جھکی ہوئی کہیں کہیں سے شکستہ وہ ریلنگ تھی' جسے تھام کر سندھ میں ڈبکیاں لگاتی اندھی ڈولفن کو گئے وقتوں کے مسافر دیکھتے تھے اور اس کی نابینائی کو سمجھ نہ پاتے تھے.. اور بائیں جانب وینیشن بلائنڈز کی ایک عمودی قطار کے پیچھے انڈس کوئین کے مختصر وی آئی پی لاؤنج کے آثار دکھائی دیتے تھے.. ٹوٹا ہوا دروازہ مقفل تھا.. خاور نے انگلی سے ایک بلائنڈ کے لچکیلے پلاسٹک کو بائیں طرف کیا اور اپنی ناک قریب لا کر اندر جھانکا.. دھول اندر کی ہر شے کو کاٹھ کباڑ کو بے رنگ کرتی آرام کرتی تھی.. وکٹورین صوفوں کے ڈھانچے گرد میں اٹے چپ میں تھے۔ پوشش کے دامن میں دھجیوں کے سوا کچھ باقی نہ تھا اور ان میں سے زنگ خوردہ سپرنگ آہنی سکتے میں آئے ہوئے مرغولوں کی طرح ڈھانچے میں سے اٹھتے تھے.. ایک سپرنگ پر چھینٹ کی ایک دھجی اٹکی ہوئی تھی جو شاید کسی میم صاحب کے فراک کی تھی جس نے آخری بار اس پر بیٹھنے کی کوشش کی اور سپرنگ کی چبھن سے فوراً ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی.. فرش پر بوسیدگی اور بدرنگی

میں ڈوبا ہوا ایک قالین تھا جو صوفوں کے ڈھانچوں کے آگے جہاں پاؤں آرام کیا کرتے تھے بالکل گنجا ہو چکا تھا۔ ایک سائیڈ ٹیبل پر ایک گلاس کی کرچیاں اور ایک ایش ٹرے تھی جس میں راکھ اور گرد محفوظ ہو رہی تھی۔۔

اس نے انگلی پیچھے کی تو وینشن بلائنڈ اپنی جگہ پر آ گیا اور لاؤنج کی بے پردگی ختم ہو گئی۔

صاحب لوگوں کے اس مختصر لاؤنج کے برابر میں عرشے میں سے ایک زینہ اترتا تھا جو شاید کیپٹن کے کمرے اور انجن روم تک جاتا تھا۔۔ نیچے جانا دشوار اور خطرناک تھا۔۔ کیونکہ زینے کے تختے اکھڑے ہوئے تھے اور وہ ایک بچی ہوئی کنگھی کی طرح اٹکا ہوا تھا۔۔ دو چار دندانے باقی تھے جو یقیناً اس کا بوجھ نہیں سہار سکتے تھے۔۔ اس میں اترا تو نہیں البتہ ریلنگ تھام کر جھانکا ضرور جا سکتا تھا۔۔ یہ ایک فراموش شدہ خشک کنواں سا تھا جس کی تہہ میں بکھرے کاٹھ کباڑ کی دھول میں سے ایک پچکی ہوئی ایک ایسے غبارے کی طرح جس میں سے ہوا ایک عرصے سے خارج ہو چکی ہو ایک لائف جیکٹ دکھائی دیتی تھی' ایک مردہ مچھلی کی طرح جس کے گلپھڑے سوکھ چکے ہوں۔۔ البتہ اس کی پچکی ہوئی مردہ گولائی پر "QUEEN...." کے حرف اگرچہ پھیکے پڑ چکے تھے لیکن پڑھے جا سکتے تھے۔۔ ان سے پیشتر جو "INDUS" تھا اسے دھول اور زمانہ چاٹ چکا تھا۔۔

کنوئیں میں ایک لیمپ شیڈ اوندھا پڑا تھا۔۔ زمانے اور وقت نے اسے بھی ناک آؤٹ کر دیا تھا۔۔

راہداری سے آگے جہاں عرشہ پھیل کر انڈس کوئین کے پچھلے حصے میں اس ریلنگ تک جاتا تھا جسے تھام کر کھڑے ہونے والے مسافر پیچھے رہ جانے والے انڈس کے کھولتے پانیوں کو دیکھتے تھے اس آبی ہلچل کا نظارہ کرتے تھے جو ان کی نظروں کے سامنے بہاؤ کا ایک حصہ بن کر پھر سے پرسکون ہوتی جاتی تھی وہاں ایک کونے میں عرشے میں گڑا ایک سفید کموڈ تھا۔۔ ایک اجڑی ہوئی لیٹرین کی برہنگی عیاں ہو رہی تھی۔ اس کموڈ کے گرد جو چوبی دیواریں وال پیپر سے ڈھکی ہوئی ان لوگوں کو پوشیدہ کرتی تھیں جو اس پر بیٹھتے تھے مسمار ہو چکی تھیں اور ان کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔۔

صرف ایک سفید کموڈ تھا عرشے کے چوبی فرش میں ندامت کی کیلوں سے گڑا

ہوا۔۔ ہزاروں بار فلش ہونے کے باوجود کموڈ کے اندر "شینکس۔ لیڈز" کے الفاظ ابھی تک واضح تھے۔

صرف ایک کموڈ۔۔ عرشے پر رکھا نہایت عجیب اور بے موقع لگ رہا تھا۔۔

اگر "انڈس کوئین" میں ابھی تک وہ سب تھے جنہوں نے کبھی بھی اس کے عرشے پر قدم رکھا تو ان میں وہ گورے بھی موجود تھے جو بیئر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس کموڈ پر جھومتے تھے۔۔

ایک وکٹورین اخلاقیات کی وہ میم صاحب بھی تھیں جو یہ سمجھتی تھیں کہ لیٹرین کی دیواریں انہیں عرشے پر ٹہلنے والے ایک اجنبی سے چھپاتی ہیں اور وہ بے دھڑک اپنا فراک اٹھا کر۔۔ انڈرویئر کے سٹاکنگ کے کلپ کھول کر یہ پروا نہ کرتے ہوئے کہ ان کی "سلپ" دکھائی دیتی ہے۔۔ بے دھڑک اس پر بیٹھتی تھیں۔۔

اس کموڈ نے راج کے وہ حصے دیکھے تھے جو دیکھنے والے نہیں ہوتے۔۔

ایک ماڈرن سٹل لائف پینٹنگ کی طرح سفید کموڈ ایک ویرانے میں تنہا تھا۔۔

"انڈس کوئین"۔۔۔ کے اگلے حصے میں لاؤنج اور انجن روم میں اترتی سیڑھیوں کے ساتھ اس سٹیم شپ کو سندھ ساگر میں چلانے اور سمت درست رکھنے والا لوہے کا وہ گرانڈیل وہیل تھما ہوا تھا جس پر کپتان کی گرفت اسے ریتلے ٹاپوؤں پر چڑھ جانے اور پایاب پانیوں میں اٹک جانے سے بچاتی تھی۔۔ یہ ابھی تک مضبوط اور توانا تھا' لوہے کی سختی اور دوام قائم رکھے ہوئے۔۔ اس پر موسموں اور گرد کے جھکڑوں اور نمی کا کوئی اثر نہ ہوا تھا زنگ کی ہلکی تہہ کے سوا۔ "ہیملٹن ونڈسر۔ بلڈنگ پائینئر۔ لیورپول 1868" کی عبارت لوہے میں کندہ تھی۔ راج کا لوہا زنگ زدہ ہونے کے باوجود ابھی تک قائم اور مضبوط تھا۔

"انڈس کوئین"

"شینکس۔۔ لیڈز"

"....کوئین"

اور "ہیملٹن ونڈسر۔ بلڈنگ پائینئر۔۔"۔۔ اس کھنڈر ڈھانچے کی چار عبارتیں۔۔ اس کے ماضی کے نامکمل نشان۔۔

گرانڈیل وہیل تلے عرشے پر گنّے کے پھوک کی ڈھیریاں سوکھتی تھیں۔۔

"انڈس کوئین" اس سے بڑھ کر بے توقیر کیا ہو سکتی تھی کہ اسے راستے پر ڈالنے والے اس آہنی وجیل کو اب ایک بیلنے کے طور پر گنے کا رس نکالنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا.. شاید یہی کشتیوں والے مہانے یا اوپر سے آئے ہوئے منچلے راتوں کو ادھر آتے تھے.

یکدم "انڈس کوئین" کا ڈھانچہ سکوت سے یوں لگا کہ حرکت میں آنے کو ہے.. اس کے قدموں تلے عرشے میں لرزش سی محسوس ہوئی۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے ریلنگ کو تھام لیا.. اور پھر فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ ایسا ہو نہیں سکتا.. دھوپ کا اثر تھا شاید..

ریلنگ سے پرے ریتلے علاقے کے آخر پر سندھ کے پانیوں میں ڈولتی کشتی کے قریب سرور اس کا سامان بند سے اتار کر لے آیا تھا اور اب آنکھوں پر ہاتھ رکھے اسی کی جانب "انڈس کوئین" کے ڈھانچے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا لیکن الجھن میں تھا کہ صاحب ادھر گیا ہے یا کسی اور جانب چلا گیا ہے.. بکھی اپنے گھر کو خالی کر رہی تھی اور بھورے بالوں والی بچی اپنی ہانڈی کے کناروں پر ایک چیتھڑا لپیٹے اسے اٹھائے ہوئے کشتی سے باہر آنے کو تھی.

چھپروں تلے مُہانے ڈنڈیاں تراشتے تھے' ٹوکروں پر جھکے تھے اور ان کے سیاہ جثے ریت سے الگ نظر آتے تھے.

ایسے لوگوں کو اس نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا...

وہ پانی کے باسی تھے اور وہ زمین سے آیا تھا..

سندھ ساگر کے کنارے یہ پانیوں کا ٹوٹم تھے. پانی کے پروردہ... آبی جنور... آسٹریلوی ابورجینز ایسے بھورے گدلے بالوں اور منحنی پست قد جثوں والے کیڑے مکوڑے جو سندھ کی اس پہلی بوند کے ساتھ جو جھیل مانسرو ور میں سے ٹپکی تھی.. اس پہلی بوند کے یہاں تک پہنچنے کے لمحے میں ہی کسی انسانی بوند کے کسی کوکھ میں ٹھہرنے سے وجود میں آئے تھے اور ان کی کشتیوں اور چھپروں سے پرے کھیتوں میں خشکی پر لاچار پڑی یہ انڈس کوئین تھی جو.. وقت کا ایک لمحہ تھی.. راج کی ایک لہر تھی جو آئی اور گزر گئی.. وہ تب بھی انہی کشتیوں اور چھپروں کے باسی تھے' انہوں نے اس لہر کو ذرا جھک کر گزر جانے دیا.. اور اب وقت کا ایک اور لمحہ تھا..

اور میں اس لمحہ' موجود کا پروردہ تھا.. بیتے ہوئے تمام لمحوں سے غافل اور

لاپروا.. میرے لیے یہی لمحہ حقیقت تھا باقی جو گزرا محض سراب تھا.. اور میں سمجھتا تھا کہ یہ ہمیشہ رہے گا.. یہیں ٹھہرا رہے گا.. یہ سرحدیں' یہ نظریے' عقیدے کی پختگی.. تا ابد یونہی اٹل اور قائم رہیں گے' اسی ایک لمحے کا تسلسل جاری رہے گا لیکن ان مہانوں کو دیکھ کر لمحہ' موجود میں دراڑیں پڑتی تھیں' خدشہ بڑھتا تھا کہ یہ سب کچھ بھی بہاؤ میں بہہ جائے گا لیکن دریا کے اس ٹوٹم نے.. بھورے بالوں اور لشکیلے بدنوں والے مہانوں نے البتہ یہیں رہنا تھا.. یہ کہیں سے نہیں آئے تھے اور انہوں نے کہیں نہیں جانا تھا. سندھ کے پانیوں کی آخری بوند تک یہیں رہنا تھا.. ہاں اگر آخری بوند بھی خشک ہو جاتی ہے تو پھر ان کی کوکھ میں گرنے والی انسانی بوند بھی ثمر آور نہیں ہو گی.. ہر شے آنی جانی تھی ابس یہی لوگ ابد تھے..

اوپر غازی گھاٹ کے پل پر ٹریفک بے چین اور پر شور ہوتی تھی۔ پریشر ہارنز اور بار بار تھمتے پھر سے سٹارٹ ہوتے انجنوں کی آوازیں نیچے اتر کر انڈس کوئین کے عرشے تک آتے آتے مدھم ہو جاتی تھیں ہوا ان کے شور کو بہالے جاتی تھی اور ان کا وجود ایک شائبہ ایک شبہ لگنے لگتا تھا۔

اس نے ریلنگ پر جمی مٹھی کو کھولا تو پھر اسے ایک دھچکا سا لگا.. انڈس کوئین کے زمانے سے گھگھیائے ہوئے بھونپو میں سے روانگی کی کوئی اطلاع تو برآمد نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی برسوں کی بے آباد کھنڈر سکونت کو ترک کر کے کھسکتی ہوئی مُہانوں کے چھپروں کو روندتی ان کی کشتیوں کو اپنے وجود سے دھکیلتی سندھ میں اترنے کو تو نہ تھی.. تو پھر کیا تھا کہ اس نے ریلنگ پر کھلی مٹھی کو پھر سے مضبوطی سے بند کر لیا اور لمحہ' موجود کی دہشت میں آگیا..

ایک جنگجو کو اگر میدانِ جنگ کی بجائے موت بستر میں آگھیرے تو اس سے بڑی حرماں نصیبی اور کیا ہو گی.. "انڈس کوئین" ایک ایسا ہی جنگجو تھا جو برس ہا برس تک میدانِ سندھ میں رہا اور موت نے اسے خشکی پر آگھیرا تھا.. اپنی تضحیک کی تاب نہ لا کر... کھیتوں کے اس بستر میں مرنا نہیں چاہتا تھا اور اپنے میدان کی جانب جانے کی خواہش میں شاید ہولے ہولے جی اٹھتا تھا.. آہستہ آہستہ متحرک ہوتا تھا..

اور اس کے تحرک کے ساتھ اس میں سوار مسافروں میں بھی جان پڑتی تھی..

انڈس کوئین میں جمع چیدہ اور منتخب مسافروں کے قدموں تلے' ان کے فل بوٹس

اور اونچی ایڑھی کی گرگابیوں تلے عرشے کے تختے نئے نکور اور اتنے پالش شدہ تھے کہ ان میں ان پر کھڑی پُر تکبر میم صاحبان کے انڈر ویئر بھی عکس ہوتے تھے۔ انجن روم کی گڑگڑاہٹ اوپر عرشے تک آتے آتے اتنی مدھم ہو جاتی تھی کہ ان کی راج گفتگو میں مخل نہ ہوتی تھی.. ریلنگ کے ساتھ آویزاں لائف جیکٹس پر "انڈس کوئین" کے حرف شوخ اور واضح تھے..

برانڈی اور سکاچ کی گہری تہذیب یافتہ مہک عرشے کے چوبی پالش شدہ تختوں اور مسافروں کے بدن میں سرایت کرتی تھی۔

وی آئی پی لاؤنج کے صوفوں میں دھنسے پولیٹیکل ایجنٹ اور کونے میں ٹیبل لیمپ کے برابر اکڑوں بیٹھے راج دلارے ابھی حال ہی میں کچلی گئی بغاوت کے تذکرے کرتے تھے اور نیٹیوز کے مظالم پر نفرین بھیجتے تھے۔ ان میں جو نیٹو تھے وہ جھک کر پولیٹیکل ایجنٹ کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتے تھے اور آیندہ بھی کسی غدر کے دوران اپنی مکمل حمایت کے وعدے کرتے تھے.. عرشے کے کسی اور حصے میں بلوچ سرداروں کی سرکوبی کرنے یا انہیں خریدنے کے منصوبوں پر پائپ کے کش لگاتے برانڈی کے گھونٹ بھرتے صاحب بہادر' ان لوگوں کے ساتھ مشورے کرتے تھے جو اطاعت گزار ہو چکے تھے..

لاٹ صاحبان اور میم صاحبان کی حضوری کی خواہش میں وفادار بلوچ فیوڈل تاک میں رہتے تھے کہ کب نظر کرم ان کی جانب اٹھے.. اگر کوئی ایسی نظر اٹھتی تھی تو وہ بڑے گھیرے کی شلواریں سنبھالتے' ازار بند اڑستے' اپنی جہازی پگڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے گرنے سے بچاتے لوٹ پوٹ ہوتے اس آس میں آگے بڑھتے کہ شاید یہ میم صاحب مجھے اپنے پوڈل یا سکاٹش ٹیریئر کو پچکارنے کی اجازت مرحمت فرما دیں' اسے نہلانے کا مقدس فریضہ مجھے سونپ دیں۔ یا لاٹ صاحب مجھے برانڈی کا ایک پیگ بنانے کی سعادت بخش دیں... اور ان کی گھنی مونچھوں تلے کاسہ لیسی بجی تھی اور عنایت شدہ جاگیروں کے چھن جانے کا خدشہ منڈلاتا تھا۔

ان وقتوں پر راج کرتی "انڈس کوئین" سندھ کے سینے پر گورا لوگ کی برتری اور کالا لوگ کی کمتری کے بوجھ کے باوجود تیرتی تھی۔

تو اس وقت... برتری اور کمتری کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی ایک ایسا لمحہ' ایسا

دن... ایسی دوپہر آئے گی... اس لائف جیکٹ اور ہیملٹن ونڈسر کے یارڈ میں ڈھلے گرانڈیل وہیل کی آہنی توانائی کو خدشہ بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی دوپہر آئے گی.. ایک وقت آئے گا جب یہ رائل سٹیم شپ غازی گھاٹ کے نیچے کھیتوں میں کھنڈر ہو گا... ایسے نیٹیوز آئیں گے جو وہیل کو بیلنے کے طور پر استعمال کر کے گنے کے پھوک کے ڈھیر یہاں چھوڑ جائیں گے.

کموڈ کے گرد کوئی چار دیواری نہ ہو گی..

لائف جیکٹ پر سے "انڈس" کے حرف ہوائیں اڑا دیں گی۔

وینیشن بلائنڈز کے پیچھے انہی صوفوں کے... جن پر راج کی اہم ترین پشتوں نے آرام کیا تھا' بسرام کیا تھا.. سپرنگ ساکت زنگ آلود بگولے ہوں گے.. اور جس لیمپ کی روشنی میں وہ اپنے آگے جھکے سرداروں کے نام جاگیریں کرتے تھے وہ خاک میں اوندھا اور اندھا پڑا ہو گا..

ایک جنگجو کی مانند... ایک سٹیم شپ کے لیے اس سے بڑی ہتک اور کیا ہو گی کہ وہ نہ تو پانی میں ڈوبے اور نہ اپنی عمر پوری کر کے کسی شپ بریکنگ یارڈ میں ہتھوڑوں تلے آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے بلکہ... پانی سے دور خشکی پر بے آسرا اور گمنام پڑا رہے... ایک ایسا شخص جس نے بھرپور زندگی بسر کی ہو اور پھر وہ بیکار ہو کر کھنڈر ایسا ہو کہ کہیں دفن ہونے کی بجائے صحرا کی کھلی فضا میں پنجر ہوتا جائے.. ایک شخص کی' ایک سٹیم شپ کی ہتک اور کیا ہو گی۔

کسی پاؤں کے دھرنے اور اس کے بوجھ سے اس کے عقب میں جو تختے تھے ان کے چرچرانے نے اطلاع کی کہ کوئی ہے..

"سائیں..."

اس نے فوراً ریلنگ پر جمی ہتھیلی کھول دی اور مڑ کر دیکھا۔

سرور تھا۔

صرف ایک دھجی سی لنگی میں... اس کا سیاہ چھریرا منحنی بدن.. اور یہ لنگی بھی غیر ضروری تھی وہ اس کے بغیر زیادہ قدرتی لگتا' جیسے کسی جانور کے نچلے دھڑ کو ڈھانپ دیا جائے.. کالے سیاہ جثے میں صرف اس کی آنکھیں تھیں' جو دو چنگاریوں کی طرح بھڑکتی اور پھڑ پھڑاتی تھیں۔

خاور نے اس عجیب سے جانور کو بہت غور سے دیکھا اور اسے ایک جھر جھری سی آئی.. ایک انجانا خوف اس کے اندر ایک بگولے کی طرح اٹھا اور اس کی آنتوں کے گرد لپٹ کر ان کا دم گھونٹنے لگا.. اس جانور کی قربت میں اسے ایک آبی تنہائی میں اترنا تھا.. اس کے ماماں جعفر اور گھر والی پکھی کے ہمراہ دن اور رات کرنے تھے۔ وہ سیاہ جونکوں کی طرح چکیلے اور بدہیئت بدصورتی والے بدن تھے.. اس خیال نے اسے بہت بے آرام کیا.. یہ بے جواز سفر اب بھی موقوف ہو سکتا تھا.. ان لوگوں کی طویل رفاقت قبول نہ ہوتی تھی۔

"سائیں.. آپ کا کل مال اسباب.. بھانڈا انڈرا اور کھان پین کشتی میں لگا کھڑا ہے.. آپ آجاؤ تو ٹھلتے ہیں..."

"ٹھلتے ہیں؟"

"خواجہ خضر سائیں کے سہارے چلتے ہیں ناں ادھر سے... سامان لگا کھڑا ہے"

"انڈس کوئین" کی بوسیدگی بھری وقت کی ماری موجودگی میں اس نے ایک گہرا سانس بھرا... یہاں اب اور کوئی سانس نہ تھا.. برانڈی کی مہک نہیں تھی. دریا کی نیم گرم اور نم ہوا تھی جس میں چھپروں کے سرکنڈوں کی خشکی تیرتی آتی تھی..

"چلیں سائیں.."

"یہ... یہاں کب سے ہے سرور؟"

"یہ تو..." سرور مخمصے میں پڑ گیا.. ران پر دیر تک کھجلی کرتا رہا" مجھے تو نہیں یاد سائیں.. پر میرا باپ تھا ناں سائیں.. وہ کہتا تھا کہ ہم پونگ لوگ ہیں.. پونگ تو سمجھتے ہو ناں سائیں.. مچھلی کے بچے... ہم لوگ خشکی پر جتنی دیر ٹھہریں ناں تو اتنے ہمارے ساہ کم ہو جاتے ہیں.. تو وہ جو میرا باپ تھا ناں تو وہ ہمیش پانیوں میں رہتا تھا' خشکی پر آتا تھا تو صرف ٹانڈے کاٹنے کے لیے اور بوٹی پینے کے لیے.. تو وہ بولا کرتا تھا یہ کشتی تو تب سے ادھر برباد کھڑی ہے جب وہ ابھی گیلا گیلا اپنی ماں سے باہر آیا تھا.."

"اس نے یا کسی اور نے اسے اس زمانے میں نہیں دیکھا جب یہ پانیوں میں چلتی تھی؟"

"نہیں سائیں.. یہ تو مدھ قدیم سے ادھر پڑی ہے.. ہم مہانے اس میں قدم نہیں دھرتے.. کبھی کبھار اوپر سے لوگ آتے ہیں. کچھ گنے چوس کر ادھر پھوک ڈھیر کر جاتے

ہیں اور کبھی کوئی دارو اور بوٹی لے کر بھی اترتے ہیں اور چاند جب پورا ہو تب آتے ہیں اور پھر مست ہو کر ادھر شور مچاتے ہیں... پھر ہمارے ناں مہانوں کے ان داتا وڈیرے بھی تشریف کرتے ہیں تو حکم فرماتے ہیں کہ اپنی عورت لاؤ.. تو ہم لا دیتے ہیں۔"

"زبردستی کرتے ہیں؟"

"ناں سائیں زبردستی کس بات کی.. یہ ہمارے بھاگ کہ وہ حکم فرمائیں.. ہمارا کیا جاتا ہے سائیں.. عورت کا کیا جاتا ہے.. نہا دھو کے پھر سے کھڑی ہے.... جدھر ہمارے چھپر اور کشتیاں ہیں یہ کنارا ملکیت میں ہے ان کی.. ہم سے کوئی لگان تو نہیں لیتے سائیں' مہربانی کرتے ہیں.. چلتے ہیں سائیں نہیں تو سورج تو جاتا کھڑا ہے.."

"چلو..."

اور وہ انڈس کوئین کے وجود سے جڑے آہنی زینے کو تھامتے نیچے کھیت میں اتر آئے.. دھوپ کی تپش میں کمی آچکی تھی..

"ویسے ایک بات ہے سائیں.. میرا باپ جب بوٹی پی کر مست ہوتا تھا تو بولتا تھا کہ یہ جو کشتی برباد کھڑی ہے.. ہمیشہ ادھر نہیں ہوتی... بہت برس گزرتے ہیں ناں تو ادھر سے نکل کر سندھ سائیں میں اتر جاتی ہے.."

"کیا؟"

"ہاں سائیں.. میرا باپ بوٹی پی کر جھوٹ نہیں بولتا تھا۔"

دو پاؤں جو مرغابی کے سیاہ پنجوں کی طرح چپٹے تھے کشتی کے کنارے پر دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

بس دو پاؤں.. جیسے ان کے اوپر کوئی دھڑ نہ ہو صرف دو پتلی چھمک ڈبلی ٹانگیں ہوں۔

صرف دو پاؤں جو کشتی کے بالشت بھر چوڑے فٹ پاتھ پر دوڑتے جا رہے تھے۔

یقیناً ان دو پتلی چھمک ڈبلی ٹانگوں کے اوپر سرور کا سیاہ لشک مارتا بدن' اس کی پسلیاں' روشن دیئے جلتی آنکھیں اور وہ مختصر لنگی بھی تھی جو اس کے جثے کو چھپاتی نہ تھی' بچوں ایسی چھوٹی پیٹھ کی تختی کو چھپاتی نہ تھی کہ وہ ایک جنور کا بدن تھا جو چھپائے نہیں چھپتا..

ان پاؤں کے پہلو میں ایک لمبا بانس ترچھا ہوتا تھا اور اس پر سرور کی انگلیاں سیاہ کیکڑوں کی طرح پیوست تھیں' جونکوں کی مانند چمٹی ہوئی تھیں۔

بانس سندھ کے پانیوں کی تہہ میں ٹھوکر کھا کر مضبوط ہوتا تھا قائم ہو جاتا تھا تو سرور کے بدن کے زور سے کشتی آگے آگے ہوتی چلی جاتی تھی..

اس کے پاؤں کا جوڑا کشتی کے چوبی کناروں پر جمتا اگلے حصے سے دوڑتا ہوا پچھلے حصے تک پہنچتا تھا وہاں سرور بانس کو پانی سے نکالتا تھا اور پھر اطمینان اور دھیرج کے ساتھ سانس درست کرتا واپس ہو جاتا تھا..

کشتی کے تختہ فرش کو مہمانوں کی پھٹی ہوئی دریاں اور غلیظ گدّے ڈھکتے تھے اور خاور ان پر لیٹا ہوا کہ بہر حال وہ اس کی سخت ہوئی کمر کو کسی حد تک آرام میں رکھتے تھے اوپر دیکھتا تھا تو اسے کشتی کی چھت اور نچلے حصے کے درمیان میں بس یہی دو پاؤں دوڑتے پھر

اطمینان سے لوٹتے نظر آتے تھے..اور کبھی کشتی ذرا ڈولتی تو ان کے درمیان میں سندھ کے پانی جھلک دکھا کر پھر نیچے ہو جاتے تھے..

کشتی کی پشت پر جو چوبی تکون پانیوں سے بلند ہوتی تھی اس پر سرور کا ماماں جعفر گوٹھ مار کر بیٹھا ایک چوڑے چپو کی مدد سے اس کے بہاؤ کی سمت سیدھی رکھنے کی سعی کرتا تھا۔ اگلے حصے میں وہ دکھائی تو نہ دیتی تھی لیکن پکھی تھی جو اب بھی اپنے سیاہ لوتھڑے بچے کے گنجے سر کو اپنی چھاتیوں میں دیئے بیٹھی تھی اور کبھی کبھار "ہو سرورا.." کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دیتی اور پھر اپنی زبان میں اسے کبھی ڈانٹتی اور کبھی نرمی سے پکارتی۔ کشتی کی چھت سرکنڈوں کی تھی جسے ایک ترپال سے ڈھانپا گیا تھا تاکہ دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو..

اور وہ بُو دیتی خستہ حال دریوں اور گدّوں پر دراز... سر تلے بازو رکھے دراز... سرور کے پنجہ نما پاؤں کو دوڑتے واپس آتے ایک تسلسل کے ساتھ دیکھتا جا رہا تھا اور کشتی کے پانی پر سرکنے کا احساس اس کے پورے بدن میں آہستہ آہستہ سرکتا تھا۔

گہرے پانی میں داخل ہونے پر سرور بانس اٹھا دیتا اور کشتی بہاؤ کے زور میں بہنے لگتی..

کشتی کے اندرون میں وہ نہ آتے تھے نہ ہی جھانکتے تھے..

یہ صاحب کا علاقہ تھا' اس کا کمرہ اس کی خلوت گاہ تھی..

کھلی فضا' دھوپ اور پانی کی قربت ان کی تھی..

نہ وہ صاحب کو جانتے تھے کہ وہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے' کیا کرتا ہے..اور نہ وہ ان سے واقف تھا..وہ چند روز کے لیے اس کے کامے تھے' کتنے روز کے لیے.. یہ وہ نہیں جانتے تھے.. کشتی سمیت وہ اس کی ملکیت میں تھے..وہ صرف سائیں برمانی کو جانتے تھے جس نے انہیں مناسب پیشگی دی تھی اور حکم دیا تھا کہ صاحب کو سائیں سندھ کے اندر لے جاؤ... سرونٹوں کے ذخیروں اور ریت کے ٹاپوؤں میں جہاں سائیں بولے اودھر رات کرو' اس کے روٹی پانی کا دھیان رکھو اور خدمت کرو..

کتنے روز کے لیے؟.. سرور نے پوچھا تھا۔

یہ مجھے بھی نہیں معلوم... سائیں برمانی نے کہا تھا..جب تک صاحب نہ کہے تب تک تم نے پانیوں میں ہی رہنا ہے' واپس نہیں آنا۔

صاحب شکار کا شوق رکھتا ہے اس لیے جاتا ہے تو ہم اسے خوش کر دیں گے.. بندوق تو رکھی کھڑی ہے کشتی میں اور کارتوس بھی ہیں..

ناں.. صاحب کو شکار کا شوق نہیں...

پر ہم صاحب کو مرغابی' جل ککڑ اور سرخاب کھلائیں گے مار کر....

ناں... سائیں برمانی نے سر ہلایا تھا..

یہ عجیب ڈھنگ کا صاحب تھا.. اگر شکار میں شوق نہیں ہے تو اپنا گھر بار چھوڑ کر ادھر کشتی میں فضول رہنے کو کیوں آگیا ہے... جب پالا پڑنے لگتا تھا تو سندھ کے بیلے اور ٹاپو پرندوں سے بھر جاتے تھے.. اور پھر اکثر کوئی وڈیرہ سائیں اور اس کے یار بیلی رات دو رات کے لیے اسے اور اس کی بیڑی کو دریا کے اندر لے جاتے تھے.. دن کے وقت پرندے مارتے تھے اور رات کو دارو اور بوٹی پی کر مست الست ہوتے تھے... اور پھر وہ پکھی پر نظر رکھتے تھے اور وہ انہیں رکھنے دیتا تھا..

غازی گھاٹ واپسی پر وہ اسے کبھی کچھ انعام دے دیتے تھے اور کبھی اس کے ہاتھ خالی رہ جاتے تھے پر وہ دانت نکالتا ان کے سامنے اپنے پورے بدن کو کتے کی دم کی طرح ہلاتا انہیں رخصت کرتا تھا' شکایت نہیں کرتا تھا.. وڈیرے سائیں جو تھے ان کی برکت اور مہربانی سے ہی تو وہ ادھر چھپر بنائے کھڑے تھے.. کشتیوں کے گھر پانیوں میں رکھتے تھے.. وہ اسے اور اس کے قبیلے کو بے گھر بھی کر سکتے تھے.. پر وہ ڈھیر مہربان اور خدا ترس لوگ تھے ایسا نہ کرتے تھے۔

اگر وہ خالی ہاتھ رہتا تو پکھی خالی نہ رہتی.. وہ اسے کچھ نہ کچھ دے کر جاتے... کبھی روپیہ پیسہ اور کبھی کوئی جھگا یا لنگی...

یہ صاحب جو ہے تو شکار کا شوق نہیں رکھتا.. پر پکھی کا شوق تو رکھے گا رب چاہے..

پکھی نے بچے کے سر پر دباؤ ڈال کر اس کے منہ کو اپنے تھن کے قریب کیا..

سندھ سائیں پرے آنے والی ہوا اس کے گریبان میں اڑسے ہوئے جھگے میں سے گزرتی اس کی چھاتیوں کے ماس پر پھیلتی تھی تو ان کے ٹوں کونپلوں کی طرح پھوٹتے تھے اور

پورا بدن دودھ بھرا اور پانیوں کی باس سے رچ جاتا تھا.. یہ پانی کی نمی میں گندھی ہوئی ہوا ایک جاندار وجود کی مانند اس کی ڈھیلی شلوار کے پائینچوں میں سرسراتی جاتی تھی اور اس کی ٹانگوں پر اپنا لمس پھیلاتی اس کی کوکھ میں ہریالی بھرتی تھی..

سندھ سائیں کی ہوا اس کے گھر والے کی طرح اس کے بدن پر نچھاور ہوتی تھی اور اسے مست کرتی تھی اور اسی مستی میں وہ اپنے بچے کے سر پر مزید دباؤ ڈال کر اسے اور قریب کرتی تھی...

سرور کے ہاتھوں میں تھاما ہوا بانس سندھ سائیں کے سینے میں اترتا جاتا تھا' تہہ کو جا لگتا تھا اور سرور اپنا پورا بوجھ ڈال کر اسے دھکیلتا کشتی کو کھیتا جاتا تھا.. پھر اس بانس کو پانیوں سے نکال کر کناروں پر آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس آ رکتا تھا..

صاحب کشتی کے اندر لیٹا ہوا تھا..

جانے آنکھیں نوٹ کر سوتا تھا یا آلکس میں لیٹا سرور کے دوڑتے پاؤں کو دیکھتا تھا..

صاحب ذرا وڈیری عمر کا تھا.. اس کا جثہ شہریوں کی طرح بے ڈھنگ اور ایک کُلہن کی طرح ذرا بے ڈول تھا.. سرور یا ماماں جعفر جیسا پتلا چھمک چھریرا نہ تھا.. مہنگی مہنگی خوراکوں سے پلا ہوا تھا.. صاحب ہر روز مرغی اور پلاؤ کھاتا ہوگا ناں... ہماری طرح مرچیں کوٹ کر سوکھی روٹی تو نہیں کھاتا ہوگا.. پتلے چھمک جثے والے مرد کا تو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ تم پر ہے یا نہیں.. پر یہ شہری بہت بوجھ ڈالتے ہیں..

صاحب نے ابھی تک اس پر وہ نظر نہیں ڈالی تھی..

اس لیے تو نہیں کہ وہ وڈیری عمر کا تھا... عمر کے بڑھنے سے طبع حرص سے خالی تو نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے..

اسے یقین تھا کہ وہ اس پر وہ نظر ڈالے گا.. نہیں تو اس کے پھیرے کا فائدہ... پر آج تک اس کا کوئی پھیرا خالی تو نہیں گیا تھا..

گہرے پانیوں کے بعد یکدم کشتی کا وجود تہہ کو جا لگا اور اس کی ریت پر گھسٹنے لگا اور سرور نے پھر بانس اٹھالیا..

اس جھٹکے کی وجہ سے خاور نے اپنا بازو سمیٹا اور اٹھ کر بیٹھ گیا..

کشتی تہہ کی ریت میں اٹکتی اور گھسٹتی ہولے ہولے آگے ہوتی تھی...

سرور کے پاؤں اب بھی چوبی چوڑائی پر جمتے دوڑتے تھے لیکن ان کی رفتار گہرے پانیوں کی نسبت اب بہت کم ہو چکی تھی بلکہ وہ دوڑنے کی بجائے چلتا تھا.. اٹھ کر بیٹھ جانے کی وجہ سے اب وہ سندھ کے ریتلے کناروں کو دیکھ سکتا تھا جن پر اُگے سروٹ اور جنگلی جھاڑیاں کشتی کے بہاؤ کی مانند اٹک اٹک کر پیچھے رہتے جاتے تھے۔

اس سفر کا جواز کیا ہے؟

کشتی کی ہر اٹک ہر جھٹکے کے ساتھ یہ سوال دوہرایا جا رہا تھا.. کیا ہے... کیا ہے...

غازی گھاٹ کے کناروں سے جدا ہوتے ہی اس سوال نے ہزاروں بار اپنے آپ کو دوہرایا تھا.. گھڑی کی ٹک ٹک کی مانند مسلسل دستک دیتا تھا اور دروازہ کھلتا نہ تھا کہ اس کے پیچھے جھانک کر پتا چلے کہ جواب کیا ہے.. شاید زندگی کا جو جواز ہے.. اگر ہے.. تو وہی اس آبی سفر کا جواز ہے.. اگر ہے۔

آج دوپہر وہ ایک کھڑکھڑاتی ٹویوٹا میں چوٹی زیریں کے گاؤں سے.. کوہ سلیمان کے دامن سے.. غازی گھاٹ تک آئے تھے..

چوٹی زیریں میں عباس برمانی کا ڈیرا تھا جسے وہ کُنج کہتا تھا.. ایک جوہڑ نما تالاب کے کناروں پر سفیدے اور کھجور کے درخت اونچے ہوتے چلے جاتے تھے اور ان کے سائے میں اگرچہ ان کا سایہ بے برکت ہوتا ہے اناروں اور مالٹوں کے گھنے پیڑ تھے جن کے پھولوں کی کھٹی مہک شام کو تیز اور تند ہو کر اس تالاب کے ایک کونے میں.. انگور اور بکن ولیا کی بیلوں سے ڈھکے اس ایک کمرے کے اندر تک آتی تھی جس میں کتابوں کے ڈھیر تھے' قدیم کھنڈروں میں سے جمع کردہ منکے' چوڑیوں کے ٹکڑے' سکے اور دھرتی ماتا کے مٹی کے شکستہ مجسمے تھے' جس میں برمانی اپنے آبائی گھر سے اپنے خاندان سے الگ... رہتا تھا.. اور وہ تنہا نہیں رہتا تھا۔ ایک چھوٹی سی چوہیا جب وہ نیند میں ہوتا تو اس کی انگلیوں کی پوروں اور ناک پر اپنا بے دانت منہ رکھ کر انہیں چبانے کی کوشش کرتی اور وہ بے دھیانی میں اور نیند میں کروٹ بدلتا تو چوہیا بمشکل اپنے آپ کو بچا کر ذرا الگ ہو کر دبک جاتی اور ایک اور موقع کا انتظار کرنے لگتی.. اوپر چھت کے کڑیوں میں ایک بے ضرر سانپ کا بسیرا تھا جو زیادہ تر اپنے آپ کو پوشیدہ ہی رکھتا۔ صرف سال میں ایک بار اس کی کینچلی یہ ظاہر کرتی کہ وہ ابھی تک وہاں ہے.. اور برمانی ایک چوہیا اور ایک سانپ کے ہمراہ اپنے بیوی بچوں کی نسبت زیادہ

ہم آہنگی سے رہتا تھا اور اس نے کبھی بھی انہیں کوئی گزند پہنچانے کا سوچا بھی نہ تھا..

برمانی دراصل اس کے آوارہ گرد باپ کا ایک تسلسل تھا..

وہ عمر میں اس سے کہیں... بلکہ بہت پیچھے تھا... لیکن وہ ایک بزرگ کی طرح اس کی تعظیم کرتا تھا.. اس میں وہ اپنے آوارہ خصلت باپ کی پرچھائیاں دیکھتا تھا.. یہ پرچھائیاں اس کے بدن پر پڑتیں تو وہ پھر سے بچپنے کی جانب لوٹ جاتا.. شاید یہی اُن کی دوستی کی بنیاد تھی..

برمانی بھی اپنی روزمرہ کی آسودگی اور تہذیب یافتہ زندگی سے یکدم خارج ہو کر غائب ہو جاتا.. اس کے بال بچوں اور ماں باپ کے ماتھوں پر صرف ایک سلوٹ ابھرتی اور وہ اس کی گمشدگی سے سمجھوتہ کر کے پھر سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں الجھ جاتے.. اس کے دوست اسے ملنے کے لیے کُنج تک آتے اور کمرے کا دروازہ مقفل پا کر جان جاتے کہ دیوانگی اسے کسی اور صحرا میں لے گئی ہے..

اس کی گمشدگی کا سب سے زیادہ قلق اس چوہیا اور سانپ کو ہوتا.. وہ اس کی غیر موجودگی سے بہت دکھی اور بے حد تنہا ہو جاتے... ان انسانوں کی نسبت جو اس کے رشتے میں تھے وہ اس کی غیر حاضری کو زیادہ محسوس کرتے..

چوہیا اس کے خالی بستر کے قریب اپنا بے دانت منہ چلاتی رہتی اور شہتیروں میں بسیرا کرنے والا سانپ کچھ روز کے لیے اپنی کینچلی اتارنے کا ارادہ ترک کر دیتا..

پھر کسی شام دھول میں اٹا ہوا بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں میں دیوانگی۔سفر کے آثار لیے برمانی واپس آ جاتا مگر گھر کی بجائے اپنے کُنج میں آ کر سو جاتا.. اور کئی روز بعد گھر والوں کو خبر ہوتی کہ وہ واپس آ چکا ہے..

برمانی نے ہی اُس کی اس آب نوردی کا بندوبست کیا تھا۔

دونوں میں تنہائی قدر مشترک تھی..

وہ بال بچوں کے باوجود الگ تھا.. اور اُسے زندگی کے نشیب و فراز اور عمر کے بہاؤ نے تنہائی کے جزیرے پر لا پھینکا تھا... نہ برمانی اپنے اکلاپے کے ڈیرے سے باہر قدم رکھنا چاہتا تھا اور نہ ہی وہ اس جزیرے کی قید سے رہا ہونے کے لیے کسی کشتی کی خواہش کرتا تھا.. یہ تنہائی عذاب نہ تھی ان کی خصلت تھی جو رخصت نہ ہو سکتی تھی..

"بگڑی سائیں..."

یکدم مرغابی کے پنجوں ایسے پاؤں رُکے' ان کے اوپر کا دھڑ جھکا اور سرور کا سیاہ مہاندرہ اس کے عین سامنے نمودار ہو گیا..

"بگڑی؟"

"مرغابی سائیں..."... اور یہ لفظ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں جل اٹھیں' روشن ہو گئیں.. اس کے بقیہ وجود سے الگ ہو کر دہکنے لگیں۔

"آؤ سائیں.. باہر آؤ" سرور نے ہاتھ آگے کر دیا..

اس کا ہاتھ تھام اس نے کشتی کے ڈولتے ہوئے کنارے پر قدم رکھا اور قدرے مشقت سے کہ لیٹے رہنے سے اس کے بدن میں جو تھوڑی بہت لچک باقی تھی وہ بھی جامد ہو چکی تھی' وہ باہر آ گیا.. سرور نے اس کا ہاتھ تب تک نہ چھوڑا جب تک وہ کشتی کے اگلے حصے کے تختوں پر نہ آ گیا.. دھوپ میں جو تیزی تھی وہ رخصت تو ہو چکی تھی لیکن کشتی کے اندرون کی عافیت بھری چھاؤں کے بعد اب اسے پوری آنکھیں کھول کر دیکھنا دشوار لگ رہا تھا..

پکھی نے سر اٹھا کر اسے نظر بھر کر دیکھا.. اس کا بچہ دودھ سے سیراب ہو کر کشتی کے خالی تختوں پر اوندھا پڑا سو رہا تھا پر اس نے اپنا جھگا نیچے نہیں کیا تھا.. صاحب کو فریب دینے کے لیے نہیں.. بلکہ سندھ سائیں کی پُرنم ہوا کی ٹھنڈک کو اپنے تن پر ہولے سے چلتے جانے کے لیے.. لیکن صاحب اس کی موجودگی سے غافل رہا۔

پکھی نے دل ہی دل میں اسے "ماں چو.." کی گالی دی اور جھگا نیچے کر لیا..

کشتی رُکی ہوئی تھی.. .

اگر وُہ پکھی کے وجود سے غافل تھا تو سرور ان سب کے.. صاحب کے.. پکھی اور ماماں جعفر کے اور اپنے وجود سے بھی غافل تھا.. اس کی آنکھوں میں بگڑی کے الاؤ جلتے تھے..

اس نے ترپال کے نیچے سے لکڑی کی ایک ٹکٹکی سی نکالی' ایک صلیب نما شے... اس میں ایک کارتوس پھنسایا' پھر اس کے اوپر اپنی پرانی بندوق رکھی' ایک چاقو کھول کر اس کے بلیڈ کو زبان پر پھیر کر اس کی تیزی کی تسلی کرنے کے بعد اسے منہ میں دانتوں تلے دابا.. اور

پھر اس ٹکٹکی کو پانی میں ڈال کر بہت آہستگی سے خود بھی اُتر گیا.. اسے اپنے آگے آگے دھکیلتا' تیرتا' اپنے دھڑ کو پانی میں ڈبو کر صرف اپنا سر سطح کے اوپر رکھتا دھیرے دھیرے اُدھر حرکت کرنے لگا جدھر بگڑی تھی..

ماماں جعفر بھی اپنے بھانجے کے ہمراہ برابر تیرتا تھا..

وہ اگرچہ خاور کے برابر میں کھڑا سرور کو پانیوں میں تقریباً روپوش.. ٹکٹکی کو ایک ڈھال کی طرح ایک نقاب کی مانند دھکیلتا دیکھتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بھی بھڑک رہی تھیں اور وہ بھی جیسے سرور کے ساتھ تیرتا جاتا تھا..

"یہ ایسا کیوں کرتا ہے جعفر؟.."

ماماں جعفر نے اپنی توجہ کو ایک لمحے کے لیے ٹوٹنے نہ دیا.. سرور پر نظر رکھے اُس کے وجود سے غافل وُہ بولا "یہ لکڑی کا تولا ہے سائیں.. جس کے پیچھے پیچھے سرور تیرتا ہے.. مرغابی کے قریب جاتا ہے.."

"مرغابی کدھر ہے؟" اسے تو دور دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی سوائے پانیوں کے اور کناروں کے اور سرکنڈوں اور سروٹوں کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا..

"تم تو دیکھتے ہی نہیں سائیں.." پکھی بولی "تمہیں کیا نظر آئے گا.. مرغابی اُدھر ہے جدھر کو سرور تیرتا گیا ہے.. پر تمہیں نہیں دکھے گی.. پر پانی کے ٹونگ اسے دیکھ لیتے ہیں.."

"اُدھر ہے سائیں.." ماماں جعفر نے پکھی کے لہجے کی تلخی کو محسوس کیا اور اس کی مدد کو آیا" جدھر ٹاپو ہے پانیوں میں ابھرا ہوا... اس پر ہے.. دو ہیں... ایک بگڑی ہے اور دوسری بوبلے ہے جو پوشلی ہلاتی رہتی ہے... دیکھتے ہو؟"

"نہیں..."

اس کی اور ان کی نظر میں فرق تھا..

اسے وہ پانیوں میں ابھرا ہوا ریتلا ٹاپو جس پر چند جھاڑیاں اور کہیں کہیں گھاس کے تنکے تھے مشکل سے دکھائی دیتا تھا اور اس پر کوئی اور شے نہ تھی.. اور اس کی جانب سرور اپنے تولے کو دھکیلتا اتنی دور ہو چکا تھا کہ وہ یہاں سے دکھائی یوں دیتا تھا جیسے سندھ کے پانیوں میں ایک بے جان بے ضرر جھاڑی ہے جو بہتی ہوئی جا رہی ہے..

بہاؤ کے زور میں.. اس کے ساتھ.. آہستگی سے ایک اور جھاڑی جو کبھی کناروں پر اپنی جڑیں گہری کیے سندھ سائیں کو تکتی تھی اور پھر اس کے پانیوں نے اس کی بنیاد کو ہلا کر اسے اپنے آپ میں بے بس اور بے اختیار کر کے شامل کر لیا.. ایک اور جھاڑی بے جان اور بے ضرر بہتی ہوئی جا رہی تھی... اور یہی فریب تھا کسی بھی پکھیرو کے لیے.. کہ یہ تو ایک اور جھاڑی ہے جو بہتی ہوئی میری جانب چلی آتی ہے... نہ اس پر کوئی شست لگائے پرانی بندوق ہے جس کی نالی کا رخ اس کی جانب ہے.. نہ کوئی کارتوس اس میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی اس کے عقب میں کوئی ایسی سیاہی چھپی ہے جس کی آنکھیں بھڑکتی ہیں اور اس کے دانتوں میں اس کی گردن پر پھیرا جانے والا ایک چاقو بھنچا ہوا ہے.. اور یہی وہ فریب کا جال تھا جو بے جان اور بے ضرر دکھائی دیتا اس کی جانب بڑھتا آتا تھا.. ایک اور جھاڑی تھی..

اُسے.. خاور کو پہلی بار احساس ہوا کہ دراصل کیا صورتِ حال ہے.. تولے کو ڈھال بنا کر اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے سرور کے دل میں ایک قتل کا منصوبہ تیرتا ہے.. "یہ... مرغابیوں کو مارنے گیا ہے جعفر؟"

ماماں جعفر اس سوال سے اپنے سحر انگیز نکڑی کے جادو میں مبتلا سکوت میں سے یکدم باہر آیا اور سر ہلا کر کہنے لگا "مرغابی ہوتی کس لیے ہے سائیں.. ہم مہانے جو ہوتے ہیں تو ہم سندھ کا پونگ ہیں سائیں.. مچھلی کے بچے سمجھتے ہو ناں صاحب.. تو سندھ سائیں ہمارا اَن داتا ہے.. رزق دیتا ہے سائیں.. ہمارے اَن پانی کا بندوبست کرتا ہے.. تو یہی ہمارا اَن پانی ہے سائیں.. مرغابیاں، جل ککڑی، سرخاب، منگھ اور مچھلی.. یہی رزق ہے ہمارا... سرور جاتا ہے تو مرغابی کی چونچ دیکھنے کو تو نہیں جاتا ان ڈونگے اور ٹھنڈے سیت پانیوں میں.. اُس کے ماس کی گرمی کو اپنے لیے گھیرنے کو جاتا ہے.."

سندھ کی آبی چادر کے تناؤ میں... ڈھلتی دھوپ میں بچھی ہوئی چادر میں صرف ایک جھاڑی بہتی ہوئی اس ناپو کے قریب ہوئی جو اسے مشکل سے دکھائی دیتا تھا.. پھر ایک ہلکی سی گونج سنائی دی.. ایک مدھم سے فائر کی آواز بہت دبی دبی پانیوں پر تیرتی اس کے کانوں تک آئی اور اسی لمحے اس نے دیکھا کہ ناپو کی ریت سے.. چند جھاڑیوں اور گھاس کے تنکوں کے درمیان میں سے دو سیاہ دھبے سے اٹھتے ہیں اور پھڑ پھڑاتے ہوئے سندھ کی آبی چادر پر بلند ہوتے ہیں..

"ماں چو..." پکھی زیرِ لب بڑبڑائی..

ماماں جعفر نے غصے میں آ کر اپنی منحنی ران پر ہاتھ مارا لیکن کچھ نہ کہا..

وہ جھاڑی کچھ دیر ناپو کے قریب رُکی رہی، سکتے میں آئی رہی اور پھر رُخ بدل کر کشتی کی جانب لوٹنے لگی.. لیکن اب وہ بہت تیزی اور شتابی سے واپس آ رہی تھی.. ان کے قریب ہوتی گئی..

سرور اپنے تولے کو دھکیلتا کھیتا ہوا کشتی سے آلگا..

"نکل گئی بہن چو..." سرور پانی سے باہر آیا تو وہ بری طرح کانپ رہا تھا.. اس کی ہنسی اس کے بس میں نہ تھی اور کٹ کٹ بے اختیار بجتی جاتی تھی... جیسے اسے نمونیے کی کپکی چڑھ گئی ہو.. اس نے لرزتے ہاتھوں سے تولے کو پانی سے نکالا، چاقو جو اس کے دانتوں کا ایک حصہ بن چکا تھا اسے کھینچ کر منہ سے نکال کر کشتی کے عرشے پر پھینکا... فالتو کارتوس اور بندوق کو تولے سے جدا کر کے اسے پھر سے ترپال کے نیچے گھسیڑ دیا اور پھر ہانپنے لگا "صاحب بڑے وزن والا اور چربی دار گوشت تھا نکڑی کا.. اڑی ہے تو مشکل سے اپنا بوجھ سہارتی تھی.. نکل گئی بہن چو....."

"سرور..."

"جی سائیں.."

"پرندہ نہیں مارنا.. آئندہ!"

"ہیں؟"

"مرغابی پر فائر نہیں کرنا.. آئندہ!"

"پر کیوں سائیں؟"

"اس لیے کہ کسی ایک مرغابی کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں"

وہ جھکا اور پھر کشتی کے اندر چلا گیا..

"کیسا ماں چو.. صاحب ہے.. پرندہ نہیں مارنا کہتا ہے.. مرغابی پر فائر نہیں کھولنا کہتا ہے..." سرور بڑبڑاتا گیا اور ٹھنڈ کا مارا ہوا ٹھٹھرتا گیا.. وہ اب اس لائق نہ رہا تھا کہ کشتی کو کھے سکتا.. چنانچہ ماماں جعفر نے بانس تھاما اور تہہ کی کھوج میں اسے پانیوں میں ڈبوتا گیا..

تھوڑی دیر بعد وہ ماماں جعفر کے دو پاؤں کشتی کے چوبی کناروں پر دوڑتے ہوئے

دیکھ رہا تھا اور کشتی ہولے ہولے آگے ہوتی جاتی تھی۔

وڈیرے سائیں تو اس کی چھاتیوں کو دیکھ کر ہونٹ گیلے کرتے تھے اور یہ اس کی جانب دیکھتا تک نہیں تھا... پکھی نے مایوسی میں سر ہلایا۔

پچھلی شب بے خوابی میں گزری تھی..

برمانی کے کنج میں پچھلی شب بے خوابی میں گزری تھی..

اس لیے کہ وہاں وہ چوہیا تھی.. وہ ایک چوہیا رات بھر پریشان رہی تھی کہ یہ ناک جسے میں کترنے کی کوشش کرتی ہوں وہ ناک نہیں ہے جسے میں ہر رات کترنے کی کوشش کرتی ہوں اور یہ پاؤں بھی نہیں جن کی انگلیوں پر میں اپنا منہ چلاتی ہوں.. تو یہ ناک اور یہ پاؤں کی انگلیاں کس کی ہیں اور یہ کون ہے.. وہ جاگتا رہا تھا.. اس چوہیا کو بھگانے کی کوشش کرتا رہا تھا... پر وہ کہاں جاتی.. وہ اپنے گھر میں تھی اور وہ نہ تھا..

کشتی کے ہچکولے ایک ہموار تسلسل کے ساتھ اس کے پپوٹے بھاری کرنے لگے.. اور وہ اونگھنے لگا.. گدوں کی بدبو اور پانی کی نمی کی عادت اس کی ناک کو ہوتی جاتی تھی... وہ اونگھنے لگا... بدن کیوں ساتھ نہیں دیتا' زوال آتا ہے تو اسے قبول کرنے کا شعور اس کے ساتھ کیوں نہیں آتا... اعضاء کیوں بیگانے سے ہو جاتے ہیں.. ان کا توازن کہاں گم ہو جاتا ہے.. ساٹھ برس کی عمر تو کوئی عمر نہیں ہوتی... یا ہوتی ہے... اگر ہوتی ہے تو پھر ایک فل سٹاپ آنا چاہئے کہ بس یہاں تمہارا اکٹ ختم ہوتا ہے' یہی تمہاری حد ہے.. اُتر جاؤ.. تم آگے نہیں جا سکتے.. پر کوئی نہیں روکتا.. آگے جاتے ہیں تو چلنا پھرنا دوبھر ہونے لگتا ہے.. اپنے ہاتھ پاؤں پرائے ہونے لگتے ہیں' کہا نہیں مانتے.. سیڑھیوں کی بجائے قدم لفٹ کی جانب جاتے ہیں.. دوسروں کے بدن کی پھرتی اور بے پروائی زہر لگتی ہے.. ڈاکٹر طاہر نے کیا کہا تھا.. یو ہیو ٹو لو وِد اِٹ... توازن ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رہتا.. یہ ڈول گیا ہے تو اب کبھی درست نہیں ہو گا.. جو دردیں بے وجہ تمہارے بدن میں اٹھتی ہیں ان کے ہمراہ رہنا سیکھ لو.. یہ اب کہیں نہیں جائیں گی.. تم چلے جاؤ گے.. پاپا ہیمنگوے نے درست کہا تھا کہ جب ایک مرد کے رس کی روانی تھم جائے تو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا.. اگرچہ وہ مکمل طور پر تھمے تو نہیں تھے لیکن ان کی روانی میں خلل پیدا ہو گیا تھا..

جعفر کے دونوں پاؤں کشتی کے فٹ پاتھ پر دوڑتے جاتے تھے اور بانس تہہ کی

تلاش میں ڈوبتا جاتا تھا..

اور کشتی پانیوں کی وسیع گود میں ہمکتی ہوئی' ملاپ کی سرخوشی میں مست ہوتی.. بہتی چلی جاتی تھی۔

پکھی اپنے بھاری کولہوں پر براجمان ڈھلتے سورج میں تھی اور بچہ گہری نیند میں تھا..

مدتیں گزر گئیں اور پھر ایک شدید دھچکے نے اسے بیدار کر دیا.. سکوت تھا.. ہر شے ٹھہراؤ میں تھی.. مدھم دھوپ اندر آتی تھی اور کشتی کے کنارے جعفر کے پاؤں سے خالی تھے.. اس کی آنکھوں میں نیند سرخ ہوتی تھی..

اس نے کہنیاں کشتی کے فرش پر ٹکا کر اپنے آپ کو اونچا کیا اور باہر نظر کی.. سندھ کے پانی نہایت مدھم اور کومل سروں میں بہہ رہے تھے.. کشتی ایک بلند ریتلی ڈھلوان سے اپنی چھاتی لگائے آہستہ آہستہ ڈول رہی تھی..

وُہ اپنے نیم خوابیدہ وجود کی مستی میں ڈولتا باہر آ گیا..

کوئی ٹاپو تھا.. پانیوں کے درمیان میں..

کشتی سے ذرا فاصلے پر سرور پانیوں پر شست لگائے بت بنا بیٹھا تھا..

دریا کے کنارے ایک تکونے جال کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے وہ پانی پر نظریں جمائے ایک سحر زدہ سانپ کی طرح دم روکے بیٹھا تھا..

جال کے سوراخوں میں سے مدھم دھوپ کسمساتی ہوئی نکلتی تھی..

"ادھر رات کریں گے صاحب..." ماماں جعفر جو کشتی کھینے کی مشقت سے ذرا برے حالوں میں تھا سانس اندر کھینچ کر بولا اور اس کے مان جانے کے انتظار میں رہا' پھر قریب آ گیا" ابھی روشنائی ہے.. کشتی سے سامان اتارنے' تمبو لگانے اور روٹی پانی بنانے میں مصیبت نہیں ہو گی.. ابھی اور آگے گئے تو رات ہو جائے گی.."

اس نے سر ہلایا اور کشتی سے اتر کر... نیچے ریت کناروں پر گیلی تھی جس میں اس کے جوگر ٹخنوں تک دھنس گئے.. کشتی سے اتر کر ڈوبتے سورج کی جانب چلنے لگا جہاں سرور دھونی رمائے اپنے گیان دھیان میں گم بیٹھا تھا..

وہ دم روکے بیٹھا تھا.. پانی سے نظر نہ ہٹاتا تھا.. وہ اس کے قریب ہوا تو بھی اس

نے آنکھ اٹھا کر اس کی جانب نہ دیکھا.. وہ پانیوں کا جوگی اپنے آپ میں گم رہا.. خاور نے بھی کچھ نہ کہا اور اسے دیکھتا رہا.. اور پھر بہت دیر بعد وہ بولا تو بھی اس کی جانب نگاہ نہ کی۔

"مل گیا تو شکار نہیں تو بیکار..."

اس نے اپنے جوگر اتارے اور سرور کے برابر میں بیٹھ گیا.. ننگے تلووں تلے ریت کے ذرّے ٹھنڈک میں تھے اور پاؤں کو ایک عجب سکھ سے آشنا کرتے بُھرتے جاتے تھے "کچھ ہاتھ آیا؟"

"صاحب آپ نے پرندوں کی مناہی کر دی ہے.. مچھلی کی تو نہیں.."

"نہیں.."

"ابھی تو دیدار نہیں ہوا"

"دم روکے ہوئے بیٹھے ہو.."

"ہاں سائیں.. کسی کا دم روکنے کے لیے اپنا دم بھی روکنا پڑتا ہے.. مچھلی کو تو آنکھیں جھپکنے سے خبر ہو جاتی ہے کہ سر پر شکاری ہے جو سانس لیتا ہے.." وہ سرگوشی میں پانی پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولتا رہا..

"تمہیں دکھائی دے جائے گا جب پانی میں مچھلی تیرتی ہوئی آئے گی؟"

"نہ سائیں.. سندھ سائیں کے پانی گدلے ہیں ان میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا.."

"تو پھر کیسے جان جاؤ گے؟"

"پانی پر آنکھیں رکھتے ہیں ناں سائیں.. تو اس پر بلبلے اٹھتے ہیں جدھر سے وہ دیدار کروانے والی معشوق آتی ہے.. پانی میں بلبلے تو بنتے رہتے ہیں پر سائیں مچھلی کے سانس کا بلبلہ الگ ہوتا ہے.. ہم جانوں ہیں کہ مچھلی کے ہر سانس کے درمیان کتنا وقت ہوتا ہے اور جب اس حساب سے پانیوں پر بلبلے ظاہر ہوتے ہیں تو ہم پہچان جاتے ہیں.. اور پھر اس مقام پر جال ڈال دیتے ہیں..."

یہ خاموشی مقدس تھی.. اس میں بولنا گناہ تھا.

وہ پہلی بار کشتی سے الگ ہو کر اسے دور سے دیکھ رہا تھا.. ریتلے ٹاپو کے ساتھ اپنا وجود جوڑے وہ پانیوں کی عظیم وسعت میں حیران اور گمشدہ تھی اور اس کے باوجود اس کا مختصر

وجود ہی اس تقابل کو جنم دیتا تھا جس کی خیرات سے منظر تا حد منظر پھیلتا اور وسیع ہوتا تھا.. وہ ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی جس کی وجہ سے صحرا کی عظمت کا اندازہ ہوتا تھا..

"میرا خیال تھا کہ تم لوگ بس پانیوں میں ہاتھ ڈالتے ہو تو مچھلی گرفت میں آ جاتی ہے.."

"جیسے ہم نمانے یہ سوچتے ہیں کہ آپ سائیں کے لیے موٹریں اور بنگلے تیار ملتے ہیں... آپ کوئی کام کاج نہیں کرتے اور یہ تیار ملتے ہیں... رزق ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ میں تو نہیں آ جاتا سائیں.. پسینہ بہتا ہے اور محنت ہوتی ہے تو مچھلی ہاتھ میں آتی ہے... پر آج دیری ہو گئی ہے.. رات دکھن کی ہوا چلی تھی سائیں اس لیے مچھلی نیچے گہرے پانی میں چلی گئی ہے... پر اپنے پونگ کے پیچھے آئے گی.. ایک بھی نظر آ گئی تو ہماری ہو گی..."

وہ پھر سانس روک کر بیٹھ رہے..

سرور بہت دیر دھونی رمائے دم سادھے بیٹھا رہا لیکن اُس کی نظروں کی تاک میں آئے سندھ کے پانیوں پر کسی مچھلی کے سانس کا بلبلا نہ اٹھا..

جعفر کو وُہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہولے ہولے کشتی میں سے سامان نکال کر ریت پر ڈھیر کر رہا تھا.. پکھی اپنے سدا کے بھوکے اور ندیدے بچے کو اپنی چھاتیوں میں پناہ دیے ریت پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی..

یہ تنہائی اور ریت اور پانی کی ایک ایسی کائنات تھی... ڈھلتے سورج میں ڈھلتی ایک ایسی کائنات تھی جس میں صرف وہ ایک کشتی تھی جو انہیں اس کائنات میں لے آئی تھی اور صرف وہ تھے.. سرور کے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں منتظر تکونا جال... جعفر، پکھی اور وُہ... اور اس کے ریت پر پڑے.. اوندھے پڑے جوگر شوز...

دھوپ سے خالی ہوتے آسمان میں پرندوں کی ایک ڈار نمودار ہوئی... بہت بلندی پر..

سرور نے پہلی بار پانی سے نظریں ہٹائیں اور اوپر نگاہ کی "... سائیں آپ بہت دیر سے آئے ہو.. اِن رُتوں میں یہ ماں چو.. نیچے نہیں اُترتیں.. یہ اپنے دیسوں کو لوٹ رہی ہیں."

وُہ جانے کونجیں تھیں مرغابیاں تھیں یا سرخابوں کے غول تھے آسمان پر ایک لمحہ

نمودار ہوئے اور دوسرے لمحے آسمان خالی ہو گیا.. اپنے دیسوں کو لوٹنے والے ہمیشہ شتابی میں ہوتے ہیں رُکتے نہیں۔

وُہ بیٹھے رہے..

آخر کار سرور کی برداشت جواب دے گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا "مل گیا تو شکار.. نئیں تو بیکار... تو سائیں آج تو سب بیکار"

سندھ کے پانیوں پر اُتری گھنیری گھُپ رات میں..

پانیوں کی بے آواز سیاہ چادر پر ستارے اُترتے تھے.. اس پر بچھے ہوئے تھے اور یہ ستارے اس پر... جہاں تہاں وہ چادر پھیلتی تھی... ناپوؤں اور جزیروں کے اندر تک جاتی تھی وہاں تک وہ اس پر.. جو ستارے تھے.. اس پر دوپٹے پر ٹانکی مکیش کی مانند ٹمٹماتے جاتے تھے.. یہ ڈوبتے تھے اور اُبھرتے تھے اور ان پر سرور کی پرات کی جھنجھناتی چھنک اور ماماں جعفر کے مٹکے کے منہ پر بندھے ململ کے کپڑے پر جمائی گئی آٹے کی تہہ پر پڑتی تھاپ کی تال تیرتی جاتی تھی... اور کہیں سندھ کے پانیوں میں اُترے ہوئے کسی ستارے پر اُس تال کا بوجھ پڑتا تھا تو وہ پانی میں ڈوب جاتا تھا اور کہیں وہی چھنک اور تال کسی ستارے کی لَو بڑھا دیتی تھی..... اور جب یہ لَو بڑھتی تھی اور پانی پر روشنی بکھیرتی ہوئی اُس ریتلے ناپو تک پہنچتی تھی جہاں سے یہ مدھر تال آتی تھی تو وہاں وہ کیا دیکھتی تھی... اسے ناپو تو دکھائی نہیں دیتا تھا گھنیری رات میں صرف گھپ اندھیرے کے بیچ میں بھڑکتے الاؤ کے گرد سرور دکھائی دیتا تھا جس کا سیاہ جثہ پسینے میں بھیگتا تھا اور آگ کی روشنی میں وہ پسینہ لشکتا ڈلکیں مارتا تھا اور اُس کا ایک قطرہ.. ایک بوند اس پرات کی پشت پر گرتا تھا جس پر سرور کے مرغابی کے پنجوں ایسے ہاتھ اتنی تیزی سے تھاپ دیتے حرکت کرتے تھے کہ وہ دو نہیں درجنوں لگتے تھے... وحشیانہ انداز میں متحرک پرات کو تیزی سے تھپکتے ہوئے اور اس پرات میں سے ایک دل پذیر حال ڈالتی بے خود کھنک دار ردھم تاریکی میں چھنکتی ہوئی بکھرتی تھی۔

ماماں جعفر اس کے برابر میں سرنگوں اپنے مٹکے کے تنگ دہانے پر جھکا اس پر یوں تھاپ دیتا تھا کہ ایک گھنی طبلہ نما گہری گونج دھڑکتے دل کی طرح دھک دھک کرتی اٹھتی تھی اور عرش پر دستکیں دیتی تھی۔

پکھی الاؤ سے ذرا ہٹ کر ریت میں دھنسی بیٹھی تھی اور الاؤ کی جتنی روشن بھڑک اس تک پہنچتی تھی اس کے چہرے مہرے پر پھیلتی اس کی تاریک آنکھوں میں جاجذب ہوتی تھی اور انہیں اندھیرے میں غیر مرئی طور پر چمکتی دمکتی کسی بلّی کی آنکھوں ایسا کرتی تھی... وہ خود کم دکھائی دیتی تھی پر اس کی آنکھیں ناپو کی تاریکی کے اوپر معلق جلتی بھڑکتی دکھائی دیتی تھیں..

اور صاحب تھا.. جو اس منظر میں بے جواز تھا..

اس کائنات کا نہ تھا.. کسی اور سیارے سے اترا ہوا بے جوڑ اجنبی تھا اور اس منظر میں ایک پیوند لگتا تھا..

ستارے کی لَو یہ سب کچھ دیکھ کر انہی قدموں پر پانیوں پر لشکتی واپس چلی جاتی تھی..

مُلاحا ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساہڈے یار ونجنا . . .

ماماں اور بھانجا دونوں اپنے چٹے سفید دانت گھور اندھیرے میں لشکاتے' جبڑے وہاں تک کھولے جہاں تک ان کے گلے کی گھنڈی تھر تھراتی نظر آتی تھی... منہ پھاڑے گا رہے تھے اور اپنے مہانے ساز... پرات اور مٹکا بجا رہے تھے.. بے خود اور مست اُن پر جھکے ہوئے تھے اور گا رہے تھے.. ملاحا... حا... حا..... وہ حا حا کو طول دیتے چلے جاتے اور پھر یکدم سر جھکا کر اپنے مٹکے اور پرات کو پیٹنے لگتے... بیدردی سے مگر سُر کے اور تال کے اندر اندر... ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساہڈے یار ونجنا.. یار ملاح ابھی کشتی کو سندھ سائیں کے پانیوں پر رواں نہ کرنا کہ ابھی تو میرے یار نے بھی پار جانا ہے...

خاور ریت پر بچھے اپنے سلیپنگ بیگ پر گوٹھ مارے بیٹھا نیند سے بے بس ہوتا ڈھے رہا تھا.. اسے اس چوہیا نے پچھلی شب سونے نہ دیا تھا.. یہ مہانے بھی بے مہار ہوتے تھے اور اسے سونے نہ دیتے تھے.. ان کے چہرے الاؤ کے مقابل جیسے تیل سے پوچے ہوئے ہوں یوں لشکتے تھے.. جیسے وہ کوئی افریقن جادوگر طبیب ہوں اور اپنے پرکھوں کی روحوں کو بلانے کے لیے گلے پھاڑ پھاڑ کر ایک بے اختیار روحانی کرب میں مبتلا گاتے جا رہے ہوں... ان کی لے میں بھی ایک قدیم.. جان بُوجھ کی سلطنت سے پرے کا خوف تھا جو تاریکی میں ڈوبے سرکنڈوں میں سے سرسراتا آتا تھا اور پھر ان کے ہاتھوں کے راستے ان کے

خود ساختہ سازوں میں منتقل ہوتا تھا..

گنبد نما خیمہ جو خاور کا مسکن تھا اس بیٹھک سے اتنا پرے تھا کہ نظر وہاں تک جاتے جاتے تاریک ہو جاتی تھی..

اُس کے ذہن میں اس آبی سفر کا جو تخیل تھا اس میں ایک سست روی تھی پانیوں پر ہلکورے لیتی ہوئی اور پھر تنہا اور الگ تھلگ راتیں تھیں.. مہانوں کے لشکتے ہوئے مہاندرے اور پکھی کے جوڑے کو لے اور اس قسم کی موسیقی سے دھڑکتی ہوئی راتیں نہ تھیں..

آج شکار نہیں ملا تھا اور ان کے لیے سب بیکار ہو گیا تھا..

شادی اتے سجناں دی تاہنگ رہندی اے

شادی تے تیاری اے دل دار سجناں... ملاحا... حا.. حا.. ہالی نہ بیڑی ٹھیل...

جو خود ملاح تھے وہ بھی ملاح کی خدمت میں درخواست گزار رہے تھے کہ ابھی تو کشتی کو نہ ٹھیلنا.. ساڈھے یار و نجناں..

تاریکی اترنے سے پیشتر انہوں نے سامان کشتی میں سے اتار لیا تھا..

تال تیرتی تھی پانیوں پر جلتے ستاروں کو بجھاتی تھی... پھر جلاتی تھی۔

تاریکی اتری تو ان کا چولہا روشن ہو چکا تھا اور دیگچی میں برمانی کے ڈیرے پر آج صبح تک کڑکڑاتی مرغی دیسی گھی میں... جو جل اٹھتا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتی تھی... لیکن ڈوئی پر بند مٹھی پکھی کی نہ تھی سرور کی تھی.. کھانے سے فارغ ہو کر گویا وہ صاحب کی غلامی سے آزاد ہو گئے تھے' اس کے ساتھ مکمل غفلت برتتے وہ اٹھے' سرور اور جعفر... اور ناپو کے ایک ریتلے ٹیلے پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد ادھر سے گھنگھروؤں کے چھن چھن کی آواز ایک تسلسل کے ساتھ آنے لگی تھی.. وہ دونوں بڑی خاموشی سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور سرور نے دوری کو تھام رکھا تھا اور ماماں جعفر ڈنڈے سے اس کے اندر جو بوٹی تھی اسے گھوٹتا جاتا تھا.. ڈنڈے کے اوپر گھنگھرو بندھے تھے اور وہ ماماں کے تجربہ کار ہاتھوں کے تحرک کے ساتھ چھن چھن بجتے تھے..

بوٹی تیار ہونے پر وہ اپنے ٹیلے سے اتر کر اس کے پاس آئے "سائیں بوٹی پیو گے؟"

"نہیں.. تم پیو"

"سائیں چس آجائے گی ایک گھونٹ تو بھرو.. سندھ سائیں کے بیلوں میں اگنے

والی خاص بوٹی ہے... اندر جاتی ہے تو مشک مچا دیتی ہے۔"

"نہیں..."

اور اب بوٹی نے ان کے اندر مشک مچا رکھا تھا اور وہ اپنی اپنی تال کی دھمک میں ڈوبتے جھومتے اور مگن ہوتے تھے پر ایک بھی ہاتھ بے سُرا نہیں پڑتا تھا..

الاؤ کے گرد خاور' سرور اور جعفر ایک چھوٹی سی روشن پر شور دمکتی ہوئی کائنات تھے اور ان کے چار چفیرے اگرچہ سندھ تھا اس کے جنگل بیلے اور آسمان تھا لیکن وہ سب رات کے بلیک ہول نے نگل لیے تھے.. لیکن جب کبھی وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا تو اس بلیک ہول میں اسے دو آنکھیں جلتی اور جھپکتی دکھائی دیتی تھیں.. سندھ کے دوپٹے پر جو نکیش ٹمٹماتی تھی ان سے الگ ہوتی تھیں اور مگن تھیں اس یقین میں کہ ان کا جادو ٹونا کبھی نہ کبھی اثر کرے گا.. وہ آنکھیں اس کی کمر میں چھید ڈالتی تھیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مڑ کر ادھر دیکھ لیتا تھا..

سرور اور جعفر بے تکان تھے.. ان کے اندر مشک مچاتی بوٹی ان کے ہاتھوں کی گردش اور گلے کے لوچ میں ڈھلتی تھی.. یکدم ان دونوں کے ہاتھ رک گئے.. جہاں تھے وہیں ساکت ہو گئے اور جبڑے کھلے کے کھلے رہ گئے اور آواز کا بہاؤ ختم گیا.. گھپ اندھیری خاموشی اتری جس میں الاؤ میں جلتی ٹہنیوں کی انگارہ ٹوٹ پھوٹ اور سندھ کے پانیوں کی دھیمی سرسراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا..

کنارے کے پانیوں پر موٹی موٹی آنکھیں رکھے کوئی مینڈک زور زور سے ٹرانے لگا..

سرور نے اپنی پرات ریت پر اوندھی کی اور کھڑا ہو گیا.. اپنے پورے جثے کے ساتھ سننے لگا اور پھر سندھ کے نکیش ٹانکے دوپٹے کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگا "ادھر تو فہیم آیا کھڑا ہے سائیں.."

"کون؟" وہ پرات اور مٹکے کی تال کے یکلخت ٹوٹنے اور خاموشی کے گرنے سے ابھی مفاہمت نہ کر پایا تھا..

"فہیم سائیں"

اس نے اپنے آپ کو دھنستی ریت میں سے بمشکل الگ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا.. اور

اسے بہت دقت ہوئی' گھٹنوں پر بہت زور پڑا.. وہ اٹھا تو ان سالخوردہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھا ہوا.. ڈاکٹر طاہر درست ہی کہتا تھا.. تمہیں اپنے بدنی زوال سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے.. یو ہیو ٹو لیو وِد اِٹ!

"کون؟" اس نے پھر پوچھا..

"آپ کا باورچی سائیں.. وہ آیا کھڑا ہے"

"کہاں آیا کھڑا ہے.." اس نے جھلا کر کہا کہ اس کے سامنے دور دور تک سندھ ساگر کی چادر پر جلتے بجھتے بے انت دیے تھے...

"وہاں..."

وہ دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے.. مسکراتے کنارے کی طرف بڑھنے لگے اور وہ بھی ان کے پیچھے ہولیا..

کنارا پانی کی سطح سے خاصا بلند تھا.. اور بھربھرا تھا.. اس لیے وہ ذرا ادھر رُک گئے..

وہ دونوں سامنے دیکھنے لگے اور وہ کچھ بھی دیکھتا نہ تھا اس لیے بے بسی سے سننے لگا.. خاموشی میں کنارے کی ریت کا کوئی حصہ ڈھے جاتا اور اس سکوت میں جس میں دھیمی رواں سرسراہٹ تھی اور ایک مینڈک ٹراتا تھا دھڑام کی سی ایک آواز آتی۔

وہاں' جدھر وہ اشارے کرتے تھے' وہاں پانیوں میں سوائے نیم تاریک ٹمٹماہٹ کے اور بے انت تاریکی کے اور کچھ نہ تھا' پر وہ ادھر دیکھتے تھے اور اشارے کرتے تھے۔

ایک طویل مدت کے بعد رینگتے اور اونچے کنارے کے عین نیچے گہرائی میں' پانیوں کی سیاہ چادر میں سے ایک آسیب نما شے نمودار ہوئی' ہولے ہولے باہر آئی اور پھر نیچے سے ایک انسانی آواز آئی "ہوئے سرور..."

"ادھر اُوپر آئے کھڑے ہیں سائیں.." سرور نے نہایت پر اشتیاق لہجے میں تاریکی کے اندر جھانکتے ہوئے آواز دی۔

"ہوئے فہیم.." جعفر بھی آگے ہوگیا۔

وہ آسیب پانیوں میں سے نکلا.. اوپر دیکھا اور پھر بھربھرے کنارے پر چڑھتا پلانگیں بھرتا اوپر ان تک آپہنچا..

اس کے سر پر گٹھڑی تھی جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا.. وہ الف ننگا تھا

اور بری طرح ٹھٹھر رہا تھا اور لرز رہا تھا اور اس نے اپنی برہنگی کو چھپانے کے لیے' کسی حد تک ڈھکنے کے لیے دوسرے ہاتھ سے ایک پھولی ہوئی ربڑ ٹیوب کو اپنے درمیانی حصے کو ڈھانپ رکھا تھا..

"سلام سائیں.." وہ خاور کے قریب ہوا۔

"وعلیکم السلام..."

"سائیں دیری ہوگئی.." اس نے گٹھڑی سر سے اتار کر سرور کو تھمادی اور ٹیوب ریت پر رکھ کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا" معافی کا خواستگار ہوں.."

"کوئی بات نہیں.."

"سائیں دراصل.." وہ کولہے پر ہاتھ رکھ کر کچھ تفصیل میں جانے کو تھا کہ ہاتھ کے نیچے اپنے ماس کو محسوس کر کے اسے یکدم اپنی مکمل بے لباسی کا خیال آیا اور اس نے فوراً جھک کر اپنی ٹیوب اٹھائی اور اپنے اگلے پورشن کو پوشیدہ کر لیا" اُدھر برمانی سائیں ہمارے بیلی ہیں تو انہوں نے حکم دیا تھا کہ آج دوپہر غازی گھاٹ کے پل کے نیچے پہنچنا ہے اور آپ کے ساتھ سندھ میں جانا ہے پر سائیں سکول انسپکٹر صاحب اچانک دورے پر آگئے تو مجھے رُکنا پڑا... جماعت بھی چھوٹی نہیں آٹھویں ہے تو مجبور ہو گیا رُکنے کے لیے.. ورنہ سائیں برمانی کا بلاوا ہو تو میں واورولے کی طرح نہ پہنچوں تو کیسا بلوچ ہوں' پٹھان ہوں سائیں.. تو غازی گھاٹ دیر سے پہنچا ہوں تو مہانوں نے بتایا کہ سرور کی کشتی تو کب کی ٹھل چکی ہے... تو میں بھی ٹھل گیا..."

"تم اس ٹیوب کے سہارے تیرتے ہوئے ہم تک آئے ہو؟" خاور نے بے یقینی سے دریافت کیا۔

"ہاں سائیں.. نارمل بات ہے" اپنی ستر پوش ٹیوب کو ذرا پچکا کر وہ قدرے شرمندگی سے ہنسنے لگا" میں اُدھر سے پانیوں میں اُتر تو گیا پر یکدم اندھیرا تو یوں چھایا ہے جیسے کربلا کی بیبیوں پر رات آگئی ہو... میں مولا کا نام لیتا تیرتا رہا.. ابھی آپ کے ٹاپو سے بہت دور سائیں سندھ میں ڈولتا بہہ رہا تھا کہ میرے کانوں میں سرور کی آواز آئی کہ... ملاحا... حا.. ہائی نہ بیڑی ٹھیل ساڈھے یار ونجاں... تو میں اس کی آواز پر کان دھرتا ادھر کو تیرنے لگا... پھر مجھے ٹاپو کے درمیان میں بچ کی روشنی دکھائی دی تو میں ادھر آگیا

..سوری سر! مجھے دیر ہو گئی... آپ نے کھانا کھا لیا ہے؟..اگر نہیں تو ابھی جو آپ کے من کی مرضی ہے وہ پکاتا ہوں..."

"اس حالت میں..پکاتے ہیں؟" خاور کو بھول گیا کہ وہ اس آبی سفر پر کیوں نکلا ہے..وہ کہاں سے آیا ہے..اور اس کے اندر زندہ رہنے' بدن میں زوال کی گھنٹیوں کے بجنے کے باوجود اس زندگی کے لیے ایک کشش پیدا ہوئی جس میں ملاح سے درخواست گزار ملاح تھے اور اس کے سامنے سندھ کے کیش بھرے دوپٹے میں سے ابھر کر آنے والا آسیب فہیم کی صورت میں تقریباً ننگ دھڑنگ کھڑا ٹھٹھرتا تھا اور کہتا تھا.. آپ نے کھانا کھا لیا ہے' نہیں تو..اس لیے کہ اسے سندھ کنارے حیاتی کرنے والوں کی اس آبی آشنائی اور پانی سے محبت اور اسے گھر سمجھنے کی جبلت سے آگاہی نہیں ہوئی تھی.. مرشد اور مرید یک جان تھے ان میں کوئی حجاب نہ تھا..

فہیم ایک ٹیوب کے سہارے شیر دریا میں اتر گیا تھا اور انہیں شب کی تاریکی میں تیرتا ڈھونڈتا پھرا تھا.. جیسے وہ ایک سکوٹر پر سوار گلبرگ یا ڈیفنس میں کسی گھر کو تلاش کرتا ہو..

فہیم نے اس کے یہ دریافت کرنے پر کہ...اسی حالت میں... "سوری سائیں" کہا اور پھر اپنی گٹھڑی اٹھا کر ٹیوب سنبھالتا کنارے سے دور تاریکی میں چلا گیا...

واپس آیا تو ملبوس تھا.. لیکن ابھی تک ٹھٹھر رہا تھا..

"آپ سکول میں ٹیچر ہو؟"

"جی سائیں..ایک معمولی مدرس ہوں..مجھے بھی سندھ سائیں میں گھومنے کا' آوارگی کا اور تیرنے کا چسکا ہے... کبھی کبھار برمانی سائیں کے ہمراہ کشتی میں بھی نکلتا ہوں.. کھانا وانا بنانے کا بھی شوق ہے..باورچی تو نہیں ہوں پر یار بیلی کہتے ہیں تو مچھلی اور مرغابی بناتا ہوں تو وہ پسند کرتے ہیں.. گھر میں ہوتا ہوں ناں سائیں تو گھر والی کی ہانڈی کے قریب سے بھی نہیں گزرتا..پھر ادھر سندھ میں نکلتا ہوں تو کھانا بنانے میں چس آتی ہے..تو برمانی سائیں نے کہا کہ میرا ایک بیلی آیا ہے تو پہنچو..میں پہنچ گیا..ذرا دیری ہو گئی۔"

"تھینک یو فہیم۔"

سرور نے الاؤ کی راکھ میں بدلتی ٹہنیوں اور لکڑی کے مڈھ کو الٹ پلٹ کر چھیڑا تو ان میں سے' بجھتے ہوئے الاؤ میں سے پست قد شعلے نکلنے لگے..حدت بڑھ گئی..

فہیم دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کی گرمی کو اپنی سکڑتی پانیوں کی یخ سے نیلی پڑتی ہتھیلیوں میں جذب کرنے لگا..

فہیم کے آنے سے سرور اور جعفر نے اپنے وجود کو منظر سے خارج کر لیا تھا..بولتے نہ تھے..

"کتنے روز سفر کا ارادہ ہے سائیں.."

"پتہ نہیں..."

"ہاں..." فہیم کی کپکپی کم نہ ہوئی تھی اور اس کی انگلیاں بھی کانپتی تھیں اگرچہ وہ انہیں بار بار الاؤ کے اندر جھونک دیتا تھا" برمانی بھی کہتا تھا کہ پتہ نہیں..میں اپنے ہیڈ ماسٹر کو درخواست دے آیا ہوں کہ نانی صاحبہ علیل ہیں اور کیا پتہ کب تک علیل رہیں..تو پروا نہیں' کوئی مسئلہ نہیں..کہ کب تک۔"

جونہی اس کے بدن میں سے پانیوں کی یخ کو الاؤ کی گرمی نے چوسا' اس کی ہتھیلیاں سیدھی ہوئیں' اس کی کپکپاہٹ کے تسلسل میں وقفے آنے لگے تو وہ چھٹی سے واپس آنے والے . . .ڈیوٹی پر واپس آنے والے کسی نائب صوبیدار کی مانند چوکنا اور چوکس ہو گیا... صورت حال کا سرسری جائزہ لے کر احکامات جاری کرنے لگا... سرور... تم نے صاحب کا ٹینٹ ادھر کنارے کے اوپر لگایا ہے..کنارا تو گرتا ہے اور بھرتا ہے یار..ادھر کیوں لگایا ہے..کھانے کے بعد صاحب کے لیے چائے بنائی تھی؟ سارا سامان کشتی سے باہر لا کر ٹاپو پر ڈھیر کر دیا ہے؟..رات کو بارش کا کیا پتہ' آ جائے گی تو بھیگ جائے گا' یار...اسے اندر رکھو... آٹے کی بوری باہر پڑی ہے اسے کنستر میں ڈالو سائیں..لیکن پہلے صاحب کا خیمہ کنارے سے اکھاڑ کر ادھر لے آؤ ٹاپو کے درمیان میں.."

سرور اور جعفر بے دام غلاموں کی مانند اٹھے..

"نہیں..اس کی ضرورت نہیں.." خاور نے ہاتھ بلند کر کے کہا "میں خیمے کے اندر رات نہیں کروں گا..باہر سوؤں گا.. موسم ایسا ہے کہ باہر سوؤں گا۔"

"باہر تو تریل گرے گی سائیں..بدن کو اکڑا دے گی۔"

"میں اتنا بوڑھا بھی نہیں کہ باہر سونے سے بدن اکڑ جائے..." اس کے لہجے میں تلخی تھی..

یہ اتنا فوری ردعمل تھا کہ اسے بھی احساس نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے.. زوال عمر کو اس نے اپنے اعصاب پر سوار کر لیا تھا۔ اپنی پشیمانی دور کرنے کے لیے اس نے فہیم کے کندھے پر ایک دوستانہ تھپکی دی "میرا جی چاہتا ہے باہر سونے کو... میں آج تک یوں کھلی فضا میں نہیں سویا.."

فہیم اس کے لہجے کی تلخی اور پھر اسے پشیمانی میں بدلتے محسوس نہ کر سکا اور لاپروائی سے بولا "حرج نہیں ہے.. ادھر سندھ کی ریتوں میں کوئی کیڑا سانپ وغیرہ نہیں ہوتا ان دنوں... آپ کا خیال رکھنا میری ذمہ داری ہے سائیں' برمانی نے بہت تاکید کی تھی۔"

اس دوران سرور اور جعفر ان دونوں کو دم سادھے تکتے رہے.. انہیں یوں چپ اور سلگتے الاؤ کی روشنی میں مدھم مدھم جلتے بجھتے دیکھ کر اس پر ایک عجیب حقیقت منکشف ہوئی... یہی دو مُہانے جو آج دوپہر پہلی نظر میں اسے بے وقعت کیڑے مکوڑے سے لگے تھے جن کی رفاقت میں سفر کرنے اور خاص طور پر راتیں گزارنے کے خیال سے اسے ہول اٹھا تھا' ڈر لگا تھا بلکہ ایک خاص حد تک کراہت محسوس ہوئی تھی وہی دو شخص اب اس لمحے الاؤ کی سنگاہٹ میں اسے خوبصورت لگنے لگے تھے..

ان کی بدصورتی اور کراہت سے ایک دھجی تب اتری تھی جب انہوں نے کمال مشاقی سے کشتی کے کناروں پر دوڑتے بانس کو پانیوں کی تہہ میں اتارتے اسے رواں کیا تھا.. یہ ایک ایسا عمل تھا جو ہر کس و ناکس کے بس میں نہ تھا.. اسے سیکھا نہیں جا سکتا تھا.. یہ کئی نسلوں سے ان کے اندر پرورش پاتا ان کے بدنوں میں مکمل ہوا تھا... جیسے بطخ کا بچہ اپنی دم ہلاتا پہلی بار پانیوں میں اترتا ہے تو وہ خود نہیں تیرتا بلکہ اس کی نسل کی جبلت تیرتی ہے.. اسی طور ایک اور دھجی تب اتری تھی جب سرور اپنے تولے کی اوٹ میں مرغابیوں کے قریب جانے کے لیے ایک جھاڑی کی مانند بے آواز تیرتا جاتا تھا.. پھر دم رو کے مچھلی کا دم روکنے کے لیے جال اٹھائے پانی پر نظریں جمائے بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا.. پل بھر میں ادھر ادھر سے ٹہنیاں اور مڈھ تلاش کر کے انہیں ریت میں سے کھود کر ان دونوں نے الاؤ دہکا دیا تھا.. چولہا سلگایا

تھا' کھانا تیار کیا تھا.. مٹکے کے منہ پر ململ کی ایک دھجی لپیٹ کر اسے آٹے سے پوت کر ایک ایسا ساز بنا لیا تھا' جس کی دھمک دل کے ساتھ ساتھ دھک دھک کرتی تھی اور سر سے باہر نہیں ہوتی تھی.. پرات پر ایسے ہاتھ چلتے تھے کہ ام کلثوم کے آرکسٹرا کے سب سے اہم سازندے دف نواز کی ردھم سے بھی وہ دو ہاتھ آگے چلے جاتے تھے اور پھر وہ گاتے بھی تھے' بے دھڑک اور مست اور کھلی آزاد آوازوں میں..

ان کی بظاہر بدصورتی کی ساری دھجیاں ایک ہی دن میں اتر گئی تھیں اور وہ خوبصورت لگنے لگے تھے.. اس لیے کہ وہ اپنے عناصر کا ایک حصہ تھے' ان سے الگ نہ تھے' پانی کا ٹونگ تھے اور اس میں زندگی کرنے کے طور طریقے ان کے خون میں رچے ہوئے تھے' یہی وصف انہیں من موہنا بناتا تھا اور عناصر کی مانند سوہنا بناتا تھا.... آج دوپہر سفر کے آغاز پر وہ شکل والے نہ تھے اور خاور تھا اور اب ان کی شکل تھی اور وہ بے شکل ہو گیا تھا کہ ان عناصر سے جڑا ہوا نہ تھا.. وہ دریا کی مخلوق تھے اور خاور ان سے الگ تھلگ کوئی اور مخلوق ان کا مشاہدہ کرتا تھا' حساب کتاب رکھنے والا شخص تھا عناصر میں جذب ہو کر ان کی خوبصورتی کا حصہ نہ بن سکتا تھا..

"بوٹی تے پیسو فہیم.." سرور نے تاریک سکوت کو توڑا۔

"ہے؟" فہیم شاید اسی پیشکش کا منتظر تھا۔

"کیوں نہیں ہے سائیں.. بوٹی تو تمہاری ہی راہ دیکھتی کھڑی ہے.." اس نے سلور کا ایک چبا اور پچکا ہوا گندا سا گلاس فہیم کی طرف بڑھا دیا.. فہیم نے نہایت اشتیاق سے گلاس تھاما اسے ہونٹوں تک لایا اور پھر کچھ سوچ کر بنا گھونٹ بھرے خاور کی طرف بڑھا دیا "آپ پیو سائیں۔"

"نہیں... میں نے کبھی نہیں پی.."

"تو اب پی لو.."

"نہیں.. میں"

"بے ادبی ہو گی سائیں.." فہیم اپنے علاقے کی طبع کے مطابق خوش مزاج ہو گیا "سندھ ساگر کے بیلوں کی بوٹی ہے کوئی معمولی شے نہیں.. اور بنائی بھی جعفر نے ہے خشخاش' الائچی اور کالی مرچ گھوٹ کر.. کیوں ماماں؟... ہمارے گھروں میں تو مائی باپ اور

نیانے بھی پیتے ہیں سائیں اس ساوی کو...اسی کے بارے میں تو کہاوت ہے ناں کہ...دینیں گھوٹیاں تے راتی پیتیاں۔لوکی کہندے مرگئے نیں اساں اللہ نال گلاں کیتیاں..''

''میں ابھی مرنا نہیں چاہتا..''اگرچہ اس نے بھی خوش مزاجی سے ہی انکار کیا لیکن ایک بار پھر لاشعوری طور پر اس میں عمر کا سفر در آیا تھا۔

فہیم نے بوٹی بھرا گلاس لبوں سے لگایا اور ڈیک لگا کر حلق میں اتار لیا..

دھام...دھم دھم...دھام...سرور پھر سے اپنی پرات کو بغل میں داب کر اسے ایک دف کی طرح بجانے لگا..اور ماماں جعفر اپنے مٹکے کو ٹانگوں کی کنڈلی میں جکڑ کر اس پر تھاپ دینے لگا..

ملاحا...حا..حا..ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساڈے یار ونجاں

سندھ کے پانیوں پر تانگی مکیش پھر سے جھلملانے لگی' ڈوبنے اور ابھرنے اور آنکھیں جھپکانے لگی..

ملاحا...حا...حا..

ٹھنی رات میں پالا اترتا تھا۔

تریل اس کے چہرے کو جو گہری نیند میں تھا بے آواز بھگوتی اور سرد کرتی تھی۔

جس ریت پر وہ سلیپنگ بیگ ڈالے گھوک سوتا تھا وہ بھی ٹھنڈی ٹھار ہو چکی تھی..

پانی اور ریت ایک شدید سرد جماؤ کے ٹھہرے ہوئے سکوت میں آئے ہوئے تھے۔

الاؤ کی راکھ کب کی سرد ہو چکی تھی اور نہ دکھائی دیتی تھی اور نہ اپنا کوئی پتہ دیتی تھی کہ وہاں کبھی اس راکھ کے سوا کچھ اور بھی تھا۔

خاموشی کی گھنی چادر میں کوئی ایک تار بھی ایسا نہ تھا جس میں ذرہ بھر سرسراہٹ ہو۔ سکوت بھرے اندھیرے نے ہر شے کو ایسے ڈھانپ رکھا تھا جیسے کسی شے کا کوئی وجود نہیں۔

نیند بھی گہرے سمندروں کی تہہ کی ریت ہوتی ہے' سطح آب پر بے شک آبی پرندوں کے غول غل مچائیں ان کی آواز اس تہہ تک پہنچتی پہنچتی مدھم ہوتی دم توڑ دیتی ہے اور اس ریت کا ایک ذرہ بھی کروٹ نہیں بدلتا..ہاں اس ذرے کے وجود میں کہیں ایک نامعلوم ارتعاش اسے خبر کر دیتا ہے کہ سطح سمندر پر کوئی بولا ہے..ایسے ہی کوئی نامعلوم لہر بہت مدھم معدوم ہوتی اس کے کانوں میں آ رہی تھی..بہت آہستہ مگر ایک تسلسل والی ٹھک ٹھک تھی.. کبھی وہ بہت گہری اور بے آواز ہو جاتی اور کبھی سنائی دینے لگتی...اس کی آنکھ کھل گئی..

تاریکی کے ایک گنبد میں بند' اس کے تلے گم سم وہ لیٹا ہوا تھا اور ایک آواز آ رہی

تھی' ٹھک ٹھک. اس نے سر اٹھا کر آس پاس دیکھنے کی کوشش کی.. الاؤ کی راکھ سے پرے کشتی تھی جو ایک رسے سے بندھی ہوئی تھی لیکن بار بار کنارے سے ٹکراتی تھی' ایک آہستگی ایک طے شدہ ردھم کے ساتھ' ٹھک ٹھک... کیا سندھ کے پانی چڑھ رہے ہیں جو کشتی یوں ڈول رہی ہے' شاید کوئی سیلاب آنے کو ہے... ٹھک ٹھک... کشتی کنارے سے ذرا ہٹتی' وہ رسہ تن جاتا جس کے ساتھ اسے باندھا گیا تھا اور پھر وہ کنارے کی ریت سے آٹکراتی.. ہوا کا ایک سانس تک نہ تھا.. اور پھر بھی کشتی قائم نہ رہتی تھی..

"سرور..." وہ سلیپنگ بیگ میں سے نکل کر اٹھ کر بیٹھ گیا" ہو سرور"

وہ سب بھی نیند میں روپوش تھے. کوئی ٹیلے پر... کوئی ریت کے کسی ابھار کی اوٹ میں.. بوٹی کی مشک میں گم سوتے تھے.. سرور ابھی کشتی میں تھے۔

کشتی بے طرح ڈولنے لگی' جیسے ابھی ایک حدت پر آئے ہوئے جانور کی طرح رسہ تڑا کر آزاد ہو جائے گی..

"ماماں جعفر..."

تھوڑی دیر کے بعد.. اور اس دوران رات' سردی اور تاریکی کسمساتی رہی.. کہیں دور سے ایک مشک بھری آواز اس تک پہنچی۔ "جی سائیں..."

"کشتی ڈول رہی ہے.. کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"جی سائیں؟" پھر سوال ہوا۔

"کشتی کنارے سے ٹکرا رہی ہے. کہیں اوپر سے پانی تو نہیں آرہے؟"

"نہیں سائیں.." جعفر کی آواز نیند اور بیزاری میں گندھی ہوئی آئی "ہل جل کے کام میں کشتی تو ڈولتی ہے ناں سائیں.. سو جاؤ سائیں پانی ابھی اتر جائیں گے۔"

کشتی کی حرکت کو وہ اس تال سے اتار رہا جو کبھی اس کے بدن پر وارد ہوتی اور ایک تسلسل کے ساتھ دستک دیتی..

پھر کشتی کے ٹکراؤ میں وقفے آنے لگے..

اس کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی.. بہت تردد اور کوشش کے باوجود' بھیڑوں کی گنتی کرنے سے لے کر تسبیح کا ورد کرنے تک اس نے اپنے آپ کو نیند کی مدہوشی میں لے جانے کے تمام حربے آزمائے مگر اس کی آنکھیں کری ہو گئیں اور ہر کروٹ کے ساتھ نیند سے

مزید خالی ہوتی گئیں.. وہ بازو پر سر رکھے' ریت کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا' اندھیرے میں گھورتا' آسمانی گنبد میں سجی ٹمٹماتی بارات کو دیکھتا لیٹا رہا.. اور پھر اسے خیال آیا کہ آبی سفر کے اس الجھاؤ نے.. عام زندگی سے یکلخت کٹ جانے کے بعد اس نے عام زندگی کو بھلا دیا تھا.. اپنے بلڈ پریشر کو نارمل رکھنے کے لیے روزانہ کی گولی نہیں نگلی تھی.. اور ایک ناغے کی پاداش میں اگلی صبح اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا تھا' دل کی دھڑکن بے قابو ہو جاتی تھی... آپ اپنی پچھلی زندگی کی ہر شے پیچھے چھوڑ آتے ہیں لیکن بیماریاں آپ کے ساتھ چلی آتی ہیں' آپ انہیں بھول جانے کی سعی بے شک کریں لیکن وہ آپ کو فراموش نہیں کرتیں.. اس نے اپنی جیب کو ٹٹول کر اطمینان کیا کہ وہاں زفرول کا پتہ موجود ہے اور پھر جعفر کو آواز دی.. اس کے "جی سائیں" کے جواب میں مزید بیزاری تھی.. خاور نے ایک لجاجت بھری سرگوشی میں کہا "ماماں مجھے پانی چاہیے.. میں نے دوائی کھانی ہے"

جعفر اپنے بدن کو کھجلاتا قدرے مدہوش ڈولتا ہوا تاریکی میں سے نمودار ہوا "سائیں آپ ذرا ڈھارس رکھو.. میں نیچے جا کر دریا سے کچھ پانی بھرتا ہوں تمہارے واسطے..."

"نہیں نہیں.. وہ تو گدلا اور آلودہ ہوگا" اسے یاد آیا کہ سامان کی فہرست میں اس نے خاص طور پر منرل واٹر کی بوتلیں لکھوائی تھیں لیکن برمانی نے ان پر لکیر کھینچ دی تھی.. خاور سائیں آپ سندھ سائیں کے پانیوں کی بے عزتی تو نہ کرو.. آپ کے معدے کو وہ کچھ نہیں کہیں گے بلکہ زیادہ پکا کریں گے.. پر سندھ سائیں کے پانی ایسے تھے کہ انہیں دیکھ کر اس کا دل کچا ہوتا تھا.. اس نے مہانوں کے بچوں کو ان کے کنارے فارغ ہوتے دیکھا تھا.. اس کی گدلاہٹ میں بہت کچھ زندہ اور مردہ تیرتا تھا.. وہ ان عناصر کا جز نہ تھا کہ وہ اس پر اثر نہ کرتے "ماماں جعفر تم لوگ اپنے ساتھ صاف پانی نہیں لائے؟"

جعفر نے اپنا سر کھجایا پھر بدن کے دیگر حصے کھجائے "دریا ساتھ ہے تو پانی ساتھ کیوں لانا تھا سائیں.. مہانوں کے پاس نلکے ٹونٹیاں تو نہیں ہوتے.. ہم لوگ تو ڈیرہ جاتے ہیں تو ٹونٹی کا پانی نہیں پیتے اس میں بیماری ہوتی ہے' مٹکے میں سائیں سندھ کا پانی ساتھ لے جاتے ہیں.. ہم جس پانی کے پونگ ہیں اس میں رہتے ہیں اور اسی کو پیتے ہیں."

"ڈیم اٹ تم پانی کا پونگ ہو پر میں تو نہیں ہوں.." وہ دانت کچکچا کر بڑبڑایا..

"سائیں کیا کہتے ہو؟" جعفر نے جھک کر دریافت کیا۔

"ادھر کوئی صاف پانی ہے یا نہیں؟"

اس کی ناراضگی کا جعفر پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اس کے پاس گوٹھ مار کر بیٹھ گیا "تھوڑی سی بوٹی بچی ہے سائیں.. اس سے ستھری دنیا میں کوئی شے نہیں.. اس کے ساتھ دوائی کھالو تو مشک آجائے گی سائیں.."

یہ کمبخت بوٹی جو ہے کم از کم الکوحل کی طرح جراثیم وغیرہ سے تو پاک ہو گی..

پہلی بار اس اندھیرے میں جس میں سندھ کے دوپٹے میں ٹانکی گئی کہکشاں رات کے اس پہر اب مدھم پڑتی تھی جیسے ایک عرصے سے کسی صندوق میں پڑی پڑی اپنی لو کھو چکی ہو اس نے بلڈ پریشر کی گولی منہ میں رکھ کر سلور کے پچکے ہوئے گلاس میں سے بوٹی کا ایک گھونٹ بھرا... عجیب کچا سا سواد تھا.. جیسے چارے کے کھیتوں میں ہریاول کی باس ہوتی ہے.. ہری ہری اور بے ذائقہ... گولی حلق میں آسانی سے اتر کر بدن کے جنگلک نظام میں کہیں اتر گئی.. لیکن پھر بھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اٹکی ہوئی ہے.. اس نے گلاس سیدھا کر کے فہیم کی طرح ایک ہی ڈیک میں خالی کر دیا..

جعفر جدھر سے آیا تھا ادھر ڈولتا ہوا روپوش ہو گیا..

ریتلے کنارے سے کشتی ایک اڑیل بھینسے کی مانند بار بار پیچھے ہٹتی تھی اور پوری قوت سے سر ٹکراتی تھی... اور ریت بُھرتی دریا میں گرتی تھی۔

نیند نے اسے مکمل طور پر تیاگ دیا تھا..

اس کی کوری آنکھیں بند نہ ہوتی تھیں..

بارہ کہو کے گھر میں بھی ایسی راتیں بہت آتی تھیں.. وہ اپنے بستر سے الگ ہو کر ٹیبل لیمپ آن کر کے کوئی کتاب پڑھنے لگتا تھا.. گزری ہوئی زندگی کے ان لمحوں کی تصویریں دیکھنے لگتا تھا جب اس کی بیٹیاں اس پر انحصار کرتی تھیں اور اس کے بدن سے لپٹ کر کبھی بھی جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں.... اور اب وہ ان کے لیے تقریباً معدوم ہو چکا تھا.. ان کے بچے اب ان کے بدن سے لپٹ کر تصویریں اترواتے تھے اور وہ بھی ان سے کبھی جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے..

اس نے اپنے آپ کو سلیپنگ بیگ سے الگ کیا... کشتی کی ٹھک ٹھک ابھی جاری

تھی.. اٹھا اور اٹھتے ہوئے قدرے لڑکھڑایا.. کہ اس نے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سیدھا نہیں کیا تھا اور پھر ریت میں اپنے ننگے پاؤں کھینچتا بجھے ہوئے الاؤ اور اپنے پڑاؤ سے آہستہ آہستہ پرے ہونے لگا.. گھپ اندھیرے میں وہ ایک نابینا تھا اور ہاتھ پھیلائے سنبھل سنبھل کر چلتا جاتا تھا.. جب ریتلا کنارا بلند ہوا اور وہ اس پر جھکا ہوا اوپر ہوا تو سامنے وہی مدھم پڑتی کہکشاں کا دوپٹہ تاحد نظر پھیل گیا... سندھ کے پانی جیسے سکوت کی گرفت میں دم بخود تھے' پھیلے ہوئے اور خاموش.. وہ رکا اور پھر ریت پر مہانوں کی مانند گوٹھ مار کر بیٹھ گیا..

نظریں کہکشاں کے ٹمٹماتے ٹانکوں پر رکھے... آسمان سے اترتے بے آواز پالے میں سکڑتے 'ریت میں دھنستے ہوئے وہ تادیر بیٹھا رہا.. اونچے کنارے پر آسن جمائے 'گئی رات کے سندھ کے بہاؤ کی نہایت ہی مدھم مدھم سرسراہٹ میں جو اس کے قدموں تلے رواں تھی اور ستارے اس پر ڈولتے اور بجھتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ستارا تھا جس کی لو پانیوں پر تیرتی ان کے پڑاؤ تک آئی تھی اور پھر اپنی کوکھ میں لوٹ گئی تھی..

ایسی دنیا جہاں سے الگ تھلگ تنہائی میں 'اس نے کہیں پڑھا تھا کہ شگون آسمانوں سے اترتے ہیں اور آنے والے دنوں کی شکلیں ظاہر کرتے ہیں.... اس تنبیہہ کے ساتھ کہ اگر مستقبل میں برے آثار ہیں تو وہ تمہیں ابھی سے بے حوصلہ کر دیں گے اور اگر اچھے دنوں کی نوید ہے تو ان کے یکدم وارد ہو جانے کی سرخوشی تم سے چھن جائے گی.. اس لیے شگونوں پر دھیان دو گے تو زندگی بے کیف ہو جائے گی.. اس کے باوجود وہ جاننا چاہتا تھا کہ شگون اس بے جواز سفر کا کیا جواز دیتے ہیں.. لیکن آسمان شگونوں سے خالی تھے..

اسلام آباد سے نکلتے ہی.. راول جھیل کو جاتے گھنے درختوں میں بمشکل سانس لیتے راستے سے آگے بارہ کہو کی ان دکانوں سے آگے جہاں مری جانے والے مسافروں کے لالچ میں خورد و نوش کی اشیاء کے سٹال شاہراہ پر امڈتے تھے وہاں بسوں' ویگنوں اور سوزوکیوں کی بھرمار میں دائیں ہاتھ پر ایک سڑک آبادی کے اندر جاتی تھی... جونہی اندر جاتی تھی تو ٹریفک کا ہجوم چھدرا ہو جاتا تھا اور پھر وہ سڑک پراپرٹی ایجنٹس کے دفاتر' نئے گھروں ورکشاپس اور تھانے کے وجود سے غفلت برتتی' ذرا ڈھلوان پذیر ہوتی تھی اور یکدم سامنے ندی کا یکطرفہ پل سامنے آجاتا تھا.... یہ سڑک اسلام آباد کی آبی شہ رگ سملی ڈیم تک جاتی

تھی.. اس کے آس پاس سطح مرتفع پوٹھوہار کی خصوصی خصلت والی اونچی نیچی بے آباد اور کہیں کہیں سبزے میں ڈھکی پہاڑیاں تھیں اور پھر کسی ایک کو نہیں بہت سارے پیسے کے معاملے میں ذی شعور لوگوں کو یکلخت خیال آیا کہ یہاں ہوا ابھی تک آلودگی سے مبرا تھی' منظر ابھی تک شفاف اور کھلکتے ہوئے تھے اور زمین بنجر تھی اور تقریباً بے دام تھی تو یہاں گھر بن سکتے تھے.. صرف ایک چھوٹی سی گرہ یا گانٹھ تھی کہ یہاں اتھارٹی کی جانب سے قانونی طور پر کسی قسم کی کوئی بھی تعمیر کرنے پر پابندی تھی.. تعزیر لگتی تھی.. یہ گرہ مکمل طور پر تو نہ کھل سکتی تھی لیکن اسے چپکے چپکے کھولنے کے عمل میں مقامی سیاستدان' جمہوریت اور بارسوخ لوگ کسی حد تک معاون ثابت ہو سکتے تھے..

جب عقاب اور سرخاب کہیں اپنا گھونسلا بنانے کا قصد کرلیں تو چڑیاں بھی اپنے چھوٹے دلوں کو ہمت دیتی ہیں اور ان کی جلو میں آشیانے کے تنکے جمع کرنے لگتی ہیں..

خاور بھی ایک ایسی ہی چڑیا تھا.

اسلام آباد کے سستے ترین سیکٹرز میں بھی اس کے پر جلتے تھے.. چنانچہ اس نے بھی عقابوں اور سرخابوں کے سائے تلے ندی کے پار پوٹھوہار کی پہاڑیوں کے سائے میں ایک.. اگرچہ ڈرتے ڈرتے.. گھر بنالیا.. اور اس گھر کو غیر قانونی قرار دے کر اتھارٹی کے بل ڈوزر کئی بار ڈھانے کے لیے آئے تھے مگر آس پاس مقامی ایم این اے کے حواریوں کے بھی گھر تھے.. بیوروکریسی کے خوشہ چینوں کے بنگلے بھی تھے اور ایٹمی سائنس دانوں کے قرابت داروں کی بھی آماجگاہیں تھیں.. اس لیے وہ بل ڈوزر حاضری لگوا کر در دولت پر جھک کر صرف کارروائی ڈال کر واپس چلے جاتے تھے..

سرخابوں اور عقابوں کے نشیمن ایک چڑیا کے گھونسلے کے وجود سے بے خبر ہونے کے باوجود اس کی بقا کے ضامن بن گئے تھے..

چڑیا کے اس گھونسلے کے اندر... اس گھر کے اندر... خاور کا باورچی کم ڈرائیور کم چوکیدار بشیر ہر شب اپنے فرائض منصبی سے فارغ ہو کر..... اسے "اور تو کوئی خدمت نہیں سر.." کہہ کر اسے تنہا چھوڑ کر اپنے کوارٹر میں اپنی نو بیاہتا پہاڑی اور ان پڑھ اور پہلی بار شہر میں آئی ہوئی پراشتیاق دولہن کے ساتھ جا سوتا تھا... کم از کم اس کا کوارٹر تو بار بار ٹھک ٹھک کرتا اس کے گھر کی چار دیواری سے تو نہیں ٹکراتا تھا۔

ہو سکتا ہے اس لمحے.. جب وہ گئی رات میں سندھ کے کناروں پر گوٹھ مارے بیٹھا آسمان سے اترنے والے شگونوں کا منتظر تھا.. اس لمحے اس کے گھر کے کھنڈر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہو..

اس کے بچے.. اس کی بیٹیاں ہمیشہ رات کے اس پہر اسے فون کرتی تھیں کہ یہ اقتصادی طور پر انہیں موافق آتا تھا... ہیلو ڈیڈی آپ سو تو نہیں گئے تھے.. میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا... میں ثانیہ بول رہی ہوں.. آواز آرہی ہے ناں.. آر یو آل رائٹ ڈیڈی.. بلڈ پریشر کی گولی کھالی ہے.. سستی نہیں کرنا ڈیڈی.. آئی لو یو.. ٹیک کیئر.. بائے..

اباجی.. کی حال اے؟.. ہیلو والد جی.. عائشہ ہیئر... آئی مس یو..

ڈیڈ... ہاؤ آر یو... انجائنگ یور سیلف.. کتنا اچھا لگتا ہے آپ کی آواز سن کر.. نہیں ڈیڈ ثانیہ اور عائشہ سے ملاقات تو نہیں ہوئی.. ہم مختلف سٹیٹس میں ہیں ناں ڈیڈ.. آپ کو پتہ نہیں کہ یہاں فاصلے کتنے ہیں.. لیکن فون پر بات ہوتی رہتی ہے.. ہم تینوں آپ کے لیے بہت فکرمند ہیں ڈیڈ.... جلال ابھی تک ہاسپٹل سے نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ آپ کہ آپ...

وہ تینوں.. بغیر کسی منصوبے کے.. جیسے جیسے رشتے ملتے گئے.. وہ تینوں امریکہ میں تھیں۔

ہمیشہ گئی رات ان کی محبت جاگتی تھی اور وہ اس کے اظہار کے لیے فون کرتی تھیں.. لیکن پاکستان آنے کا نام نہیں لیتی تھیں.... بس ڈیڈی آئی پرامس نیکسٹ ایئر انشاءاللہ... ان دنوں تو میں بے حد مصروف ہو گئی ہوں.. ایک اللہ والی کے درس اٹینڈ کرتی ہوں... ہولی پرافٹ واز دی گریٹسٹ ہیومن بی انگ... جج اے کیوٹ پرسن.. میں نے تو اب ریالائز کیا ہے.. ڈیڈ آپ نماز تو باقاعدگی سے پڑھتے ہیں ناں.. یہ فرض ہے ناں.. اپنا خیال رکھا کریں.. سردیوں کے لیے میں بہت ٹھک سویٹر بھیج رہی ہوں آپ کے لیے.... ڈیڈ آئی مس یو...

اسے مرے ہوئے دس برس ہو گئے تھے.. اور ہر ٹیلی فون کال کے بعد اسے وہ یاد آتی تھی جو خاموشی سے اس کا خیال رکھتی تھی۔

شائد اسی لمحے بارہ کہو کے کھنڈر میں اس کی تینوں میں سے ایک غمزدہ بیٹی کے ٹیلی

فون کی گھنٹی لگاتار بج رہی ہو..

بُوٹی اس کے اندر مشک مچا رہی تھی..

وہ ریت میں دھنسا بیٹھا تاریکی میں تاریک ہوتا تھا.. دریا کی قربت میں ایک سردیلی بے چینی کی بجائے ایک آرام دہ آسودگی اس کے بدن میں جذب ہوتی چلی جاتی تھی.. سندھ کی چادر میں ٹانکے ہوئے تارے مدھم ہو کر ایک ایک کر کے ڈوبتے جاتے تھے.. اس کے پپوٹے نیند سے بھاری ہونے لگے.. بند ہونے لگے.. صرف آنکھیں بند ہونے سے پانی کی رواں سرسراہٹ قدرے قریب محسوس ہونے لگی.. یہاں سے اٹھ کر اپنے سلیپنگ بیگ تک جانے اور اس میں گھس کر سو جانے کے لیے جو ارادہ درکار تھا وہ کاہلی کے سامنے ڈولتا تھا..

پپوٹوں پر ہلکی روشنی کا شائبہ سا ہوا.. اس نے آنکھیں کھول دیں.. اور وہاں... روشنی تھی.. سندھ کے پانیوں میں کرنیں ابھر رہی تھیں.. ان میں ہلچل سی پیدا ہوئی' جتنے بھی ستارے بر آب تھے' کہکشاں کے چند ٹانکے جو ابھی ڈوبے نہ تھے ان کا جمود ٹوٹا اور وہ بری طرح لرزنے لگے جیسے کوئی وجود ان کے سکوت میں بل چلاتا داخل ہو گیا ہو.. پہلے اس کا پانیوں پر اٹھا ہوا نوکدار بھاری پن تاریکی میں سے ظاہر ہوا پھر گورا کپتان ایک ہاتھ سے اپنی کیپ درست کرتا' نیلے بلیزر میں اڑسی ہوئی ٹائی ٹٹولتا اور دوسرا ہاتھ نے نکور ہیملٹن وِنڈسر کے بنے ہوئے وہیل پر جمائے اسے آہستہ آہستہ دائیں بائیں حرکت دیتا دکھائی دیا... پھر عرشے کی روشنیاں تاریکی کو سمیٹتی ظاہر ہوئیں.. ریلنگ کے اوپر گیس کے ہنڈولے لٹکتے تھے جن کی دودھیا روشنی میں عرشے پر موجود مسافروں کے چہرے آہستگی سے دودھیا روحوں کی طرح حرکت کرتے تھے..

گیس لیمپس کی روشنی سندھ کے پانیوں پر پڑتی اور حرکت کرتی جاتی تھی..
مسافروں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ اس تک آ رہی تھی۔

''انڈس کوئین'' اس کے سامنے پانیوں پر منعکس کہیں کہیں ٹمٹماتے جو دیے تھے انہیں دھکیلتی چلی جا رہی تھی.. کچھ مسافر ریلنگ کا سہارا لے کر ادھر دیکھتے تھے جدھر وہ ایک اونچے کنارے پر ریت میں دھنسا بیٹھا انہیں دیکھتا تھا.. اور وہ اسے نہ دیکھتے تھے کہ وہ تاریکی کا ایک جز تھا پر انہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ گیس کے ڈولتے ہنڈولوں کی روشنی میں تھے..

''انڈس کوئین'' ایک جگمگاتی گہما گہمی میں آوازوں کی بھنبھناہٹ پیچھے چھوڑتی سندھ میں رواں تھی..

ریلنگ کے آسرے سے جو مسافر سامنے تاریکی میں کچھ نہ دیکھتے تھے یونہی بے سبب گھورتے چلے جاتے تھے ان میں سے کچھ تھے جن کے ہاتھوں میں باریک کرسٹل کے گلاس تھے جن میں برانڈی اور سکاچ کے سنہری پانی ''انڈس کوئین'' کے عرشے کی خفیف سرزش سے دمکتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو اپنی پگڑیاں سنبھالتے تھے مونچھیں سنوارتے تھے اور نظر رکھتے تھے کہ کب صاحب یا میم صاحب کا گلاس خالی ہو اور کب وہ اسے دوبارہ لبریز کرنے کی سعادت حاصل کریں..

کہیں یہ بوٹی تو نہیں جو مشک مچاتی ہے اور فریب دیتی ہے اور وہ کچھ دکھاتی ہے جو وہاں نہیں ہو سکتا..

پر یہ ''انڈس کوئین'' ہی تھی جو اس کے سامنے سندھ کی رات میں سفر کرتی تھی.. اس کے مستول پر ایک یونین جیک مرجھا رہا تھا.. اور حیرت یہ بھی تھی کہ عرشے کے کونے میں واقع اس لیٹرین کی دیواریں اب بھی نہیں تھیں اور کموڈ پر ایک بوڑھا انگریز اطمینان سے بیٹھا تھا' اس اطمینان سے کہ دیواریں ہیں..

ریلنگ کے سہارے گیس کے ہنڈولوں کی لرزتی روشنی سے ہٹ کر نیم تاریکی میں ایک ایسی عورت کھڑی تھی جسے وہ جانتا تھا...

عرشے پر جو مسافر چہل قدمی کر رہے تھے' ریلنگ پر جھکے تاریک پانیوں میں جھانکتے تھے سفر کی رات میں مخمور خوش اور بے حجاب تھے وہ ان سے الگ تھی' فاصلے پر تھی' اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتی' حیادار غلافی آنکھوں کو سنبھالتی' تین جوان بیٹوں کی نابالغ ماں.. اپنے خاوند کی جنسی قوت سے تنگ آئی ہوئی' ہینڈ بیگ میں سپیشلسٹس کی رپورٹیں چھپائے... وہی تھی۔

لیکن بقیہ مسافروں سے الگ.. بدنامی کے دھبوں سے ڈرتی ہوئی.. وہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اندھیرے کے پار ایک ریتلے ٹاپو کے اونچے کناروں پر ریت میں دھنسا بیٹھا وہ مرد ہے.. جس کی بے ثمر چاہت میں اس نے اپنے آپ کو فاش کر دیا تھا.. اپنے گھروندے کی دیواریں مسمار کر کے اپنے آپ کو عریاں کر دیا تھا' بے پردہ اور نمایاں کر دیا تھا۔

"انڈس کوئین" اس کی نظروں کے سامنے گیس کے ہنڈولوں سے روشن جگمگاتی آوازوں سے جھنجھناتی سندھ کے پانیوں کو پچھاڑتی چلی جارہی تھی اور عرشے کے ایک کونے میں ریلنگ کے سہارے اپنی زندگی کے بقیہ دن متعین کرتی غلافی آنکھیں جھپکتی وہ کھڑی تھی' اس کی جانب دیکھتی تھی.. پر اسے نہیں دیکھتی تھی.. اگر دیکھ لیتی تو بلاسوچے سمجھے بے دریغ ریلنگ پر پاؤں رکھ کر پانیوں میں کود جاتی اور تیرتی ہوئی اس تک پہنچ جاتی کہ وہ اسی قسم کا پاگل خانہ تھی..

"می آؤں.. می آؤں"

ایک مور اس کے کان میں بولتا تھا' اس کے اونگھتے بدن اور بھیتر میں بولتا تھا..

اس کے اُس کان میں بولتا تھا جو کشتی کے چھپر تلے لیٹے ہوئے آزاد تھا اور سندھ سے آتی نم ہوا کو محسوس کرتا تھا اس کان میں بولتا تھا اور زور زور سے بولتا تھا' می آؤں.. می آؤں... چونکہ وہ کروٹ لے کر لیٹا ہوا تھا اس لیے دوسرا کان جو گندے گدیلوں میں دھنسا ہوا تھا اس کی کرخت آواز سے قدرے محفوظ تھا.. پکار پہنچتی تو تھی لیکن مدھم اور ڈوبتی ہوئی.. اس نے پہلو بدل کر کروٹ لی.. تو مور بھی کروٹ بدل کر دوسرے کان میں بولنے لگا..

یہ عمر کا بہاؤ اور زوال ہے جس میں وہ کچھ سنائی دیتا ہے جو بولتا نہیں.... اور وہ کچھ دکھائی دیتا ہے جو ہوتا نہیں..

پچھلی شب ریت کے ٹاپو پر پہلی رات میں..

جب "انڈس کوئین" کی جھلملاتی روشنیاں پانی پر اپنے عکس چھوڑ کر آگے چلی گئی تھیں تو وہ انہیں دیکھتا رہا.. ایک "انڈس کوئین" اوجھل ہو چکی تھی اور دوسری وہیں اپنی روشنیوں سمیت پانی پر نقش تھی.. اور یہ نقش بھی آنکھ جھپکنے سے گھل گیا.. لیکن وہ وہیں رہی.. اسی حالت میں' اس ریلنگ کو تھامے جواب وہاں نہیں تھی' اس کے چہرے پر جو ہلکی سی دودھیا روشنی تھی وہ بھی اس کے ساتھ ٹھہری رہی اپنے گیس لیمپ کے ساتھ انڈس کوئین کے ہمراہ رخصت نہیں ہوئی... سندھ کی تاریکی کے اوپر ایک اندھیرے خلا میں اپنی غلافی آنکھیں جھپکتی وہ اسی طور کھڑی رہی.. "انڈس کوئین" نے سیاہ منظر کو خالی کیا تو وہ مادہ

مینڈکوں اور جھینگروں کے شور سے زندہ ہو گیا۔ان بولیوں میں پانی کی جانے کیا کیا مخلوق تھی جو شامل ہوتی جاتی تھی اور پھر ایک پرندہ تھا جو شب بھر بولتا رہا تھا..وہ دکھائی تو نہ دیتا تھا لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ معدوم ہو چکی ریلنگ کے سہارے کھڑی غلافی آنکھوں کے آس پاس سے کہیں بولتا تھا..

اس ایک پرندے نے عمر بھر اسے چین نہیں لینے دیا تھا..

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے پروں کے رنگ کیسے ہیں' وہ کس شکل کس نسل کا ہے..اس کی چونچ کیسی ہے' کہاں سے آجاتا ہے اور اس کے بدن کے کس ٹہنی پر بیٹھتا ہے اور بولنے لگتا ہے..

وہ ہمیشہ تاریکی کے دل میں بولتا تھا اس لیے دکھائی نہ دیتا تھا..

بچپن سے لے کر اب تک...جہاں کہیں اس کے لیے شرمندگی' شکست موت یا محبت کی قربت ہوتی وہ بولنے لگتا تھا۔

وہ بھی اس کی عمر کا تھا لیکن نہ اس کا سانس پھولتا تھا نہ اس کی آواز میں نقاہت آتی تھی نہ وہ تھکتا تھا' بس ویسے ہی بولتا تھا جیسے وہ رسول پور کی کچی گلیوں کی ویرانی اور دل کو کھا جانے والی سیاہ دوپہروں میں پہلے پہل بولا تھا....اس پر عمر کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔

نوجوانی میں تو اسے یقین ہو گیا تھا وہ اطمینان میں چلا گیا تھا کہ وہ ایک عارضی..سرد تنہائیوں اور برفیلی رتوں سے تنگ آکر گرم موسموں کی تلاش میں اڑان کر کے اس کی زندگی میں ایک عارضی گھونسلا بنا کر اپنے وجود کا اعلان کر کے پھر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے والا ایک پرندہ تھا...وہ اس دوران جیسے تھا ہی نہیں..اتنے عرصے وہ بالکل چپ رہا تھا..اسی لیے وہ اطمینان میں چلا گیا تھا کہ میں نے اس کے آخری بول سن لیے ہیں..

لیکن عمر کی پہلی جھری نے جب چہرے پر کروٹ بنائی تو وہ پھر کہیں سے بولا..

پھر وقفے وقفے سے اس کے بول سنائی دینے لگے..

ہر نئی جھری کے ساتھ...جونہی کوئی شکن ابھرتی وہ بولنے لگتا اور اس کی آواز ہر مرتبہ قریب آتی جاتی۔

وہ کہیں نہیں گیا تھا..اس کے بھیتر میں بسیرا کر چکا تھا...گھونسلا بنا کر شکنوں اور جھریوں کے نمودار ہونے تک چپ تھا....اور اب مسلسل بولتا تھا..اسے چین نہ

لینے دیتا تھا..

یہ پچھلی شب میں ہوا تھا..

لیکن آج...اب..جب کشتی کو ٹھلتے ہوئے دوپہر ہونے کو تھی اور وہ چھپر چھت تلے اونگھ رہا تھا..پچھلی رات میں جو نیند رہ گئی تھی اس کے خمار میں اونگھتا تھا تب وہ مور بولنے لگا تھا..پرندہ وہی تھا مگر مور کے روپ میں تھا..می آؤں..می آؤں!

خوشی کا چار مرغابیوں سے کوئی تعلق نہ تھا' اُن دو سے بھی نہیں جو سرور کے نشانے سے بچ نکلی تھیں تو پھر یہ مور کیوں بولتا تھا..وہ اٹھا اور بمشکل اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے کیل سے لٹکتے نیلے پلاسٹک میں جڑے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا..یقیناً کہیں ایک اور شکن اس کے چہرے پر ابھری تھی جو یہ مور بولتا تھا لیکن وہ اس شکن کو تلاش نہ کر سکا...شاید وہ چہرے پر نہیں بدن کے کسی اور حصے میں ابھری تھی..

اس نے سر جھکا کر کشتی کے پائیدان پر پاؤں رکھا اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا..سرور نے اس کا ہاتھ سیاہ پنجے میں جکڑ لیا اور وہ اس کے سہارے باہر آ گیا..تیز دھوپ نے اس کی اونگھتی آنکھوں میں چمک اور نمی بھر دی..وہ پائیدان پر چلتا عرشے کی اٹھی ہوئی تکون کے تختوں پر آکھڑا ہوا...اپنے آپ کو مسلسل سنبھالتا..اگرچہ کشتی کے بہنے میں کوئی رکاوٹ کوئی اٹک یا جھول نہ تھا اس کے باوجود پانیوں پر رواں ہر شے میں اس کے وجود میں زمین سے الگ ہو کر ایک بے یقینی سی ہوتی ہے..ایک بے نام لرزش بدن کو ہوشیار رکھتی ہے..

کشتی گہرے پانیوں میں تھی اور ایسے آسانی سے کھسکتی آگے ہوتی جاتی تھی جیسے اس کے پیندے پر چربی کی تہہ تھی اور وہ پانیوں کی کوکھ میں پھسلتی ہوئی بے آواز داخل ہوتی جاتی تھی..

سندھ کے پانیوں پر جہاں کہیں سورج ترچھا ہو کر اپنی پوری آب و تاب سے لشکتا تھا ادھر نظریں جاتی تھیں تو چندھیا جاتی تھیں...کنارا دور نہ تھا..وہاں کائی' سرکنڈوں' آک اور لانی کے بوٹوں کا گھنا ذخیرہ ابھرتا تھا۔ خزاں رسیدہ زردی اور نیم ہریاول کی ایک پٹی پانیوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

اس ذخیرے کی زردی اور نیم ہریاول کے اندر سے ایک بار پھر ایک مدھم سی آواز آئی..می آؤں امی آؤں!

خزاں رسیدہ زردی بھی اس کے بھیتر میں تھی اور ابھی تک کچھ ہریاول بھی باقی تھی اور اس میں اس نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔

ماماں جعفر کشتی کی نوک پر کھڑا اپنی مختصر لنگی میں مشکل سے لپٹا آنکھوں کے سامنے ایک چھجہ بنائے سندھ کے پانیوں کو تکتا تھا۔۔ایک منحنی سیاہ ابو رجنی کیپٹن اہاب جو اس سفید وہیل موبی ڈک کی تلاش میں تھا جو اس کی ٹانگ چبا کر سمندروں میں روپوش ہو چکی تھی۔

"ماماں جعفر..."

جعفر نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اسے اپنے قریب پا کر کیپٹن اہاب سے یکدم ایک قدموں میں بچھ جانے والا سیاہ فام غلام ہو گیا "جی سائیں.."

"کیا کرتے ہو؟"

"نظارہ کرتا ہوں سائیں.. آپ تو اندر سوتے ہو ناں.. نظارہ نہیں کرتے.."

"سائیں سندھ کے پانیوں اور کناروں کا نظارہ کوئی کہاں تک کرے..."

"جہاں تک حیاتی ہے سائیں.. میری جم پل تو ادھر پانیوں پر ہی ہوئی سائیں.. پر ساری حیاتی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک ہی نظارہ دوبارہ دیکھا ہو... آنکھ جھپکتا ہوں ناں تو نظارہ بدلا کھڑا ہے.. ابھی آپ جب آرام کرتے تھے ناں تو ایک کالا پرندہ پانیوں پر اترا تھا.. ایک کرڑ آسمان سے آیا تھا جسے ہم دریائی عقاب بولتے ہیں.. پانیوں کے اندر غرق ہو گیا پھر باہر آیا ہے تو اس کی چونچ میں... میں جھوٹ بولوں تو مجھے تیرنا بھول جائے.. اس کی چونچ میں کچھ نہیں تو تین کلو بھار کی مچھلی پھڑکتی تھی جسے وہ آسانی سے اوپر عرش تک لے گیا تھا... مچھلی پانی سے باہر آ جائے تو اس کا زور اور طاقت سو گنا ہو جاتے ہیں.. میرے ہاتھوں میں آئی ہوئی ایک چھوٹی سی مچھلی میری انگلیاں توڑ دیتی ہے اپنی جان بچانے کے لیے.. اور وہ کرڑ اسے عرش پر لے گیا تھا.. اس کی چونچ شکنجہ تھی سائیں.. یہ نظارہ میں نے کیا سائیں.."

"ایسا نظارہ تم نے پہلے کبھی نہیں کیا؟"

"کیا سائیں.. پر میں نے بولا ہے ناں کہ آنکھ جھپکتا ہوں تو نظارہ بدلا کھڑا ہے.. کرڑ کے دریائی عقاب کو مچھلی دبوچتے بہت بار دیکھا ہے.. پر سائیں ہر بار کرڑ کوئی اور ہوتا ہے' وہی ہو تو بھی جس مچھلی کو وہ اپنی چونچ کے شکنجے میں باندھ کر پانیوں کے اندر سے

باہر لاتا ہے.. وہ مچھلی کوئی اور ہوتی ہے.. تو نظارہ بھی کوئی اور ہوتا ہے' بدلتا ہے سائیں آنکھ جھپکنے سے بدلتا ہے.."

جعفر کی آبی منطق نے اسے چیزوں کو... انہی تغیرات' انہی موسموں اور انہی عناصر کو جنہیں ہزاروں بار دیکھا جا چکا ہوتا ہے ایک سراسر نئی اور اچنبھے میں ڈال دینے والی نگاہ سے روشناس کیا.. جیسے ندی کا پانی سدا وہی نہیں رہتا جس پر آپ نظریں جمائے اسے دیکھتے ہیں' بدلتا رہتا ہے.. وہ پانی جن پر آپ کی نگاہ ہے بہہ جاتے ہیں اور نئے پانی آ جاتے ہیں.. اور منظر بدل جاتا ہے.. جیسے ہر محبت پہلی سی نہیں ہوتی' جیسے ہر نوزائیدہ بچے کے کھیلنے کا انداز مختلف ہوتا ہے... ایسے ہی سندھ سائیں کے پانیوں اور کناروں کے نظارے حیاتی بھر اپنے آپ کو نہیں دوہراتے.. صرف وہ پرندہ جواب مور کی جون میں تھا اپنے آپ کو دوہراتا بولتا تھا..

"ماماں... ادھر جو سامنے کناروں پر بیلا گزرتا ہے.. سرکنڈوں اور کائی کے زرد اور نیم ہریاول کے گھنے بوٹوں کا.. تو اس میں سے کچھ بولتا ہے.. تم سنتے ہو؟"

"ادھر کیا بولے گا سائیں.. کچھ بولے گا تو پانی میں سے بولے گا.. ادھر تو سنسان ہے۔"

"پانی میں سے کیا بول سکتا ہے؟"

"باغوں بلا سائیں.."

"کیا؟"

"پانی کی بلا ہوتی ہے سائیں.. وہ کبھی کبھی حیاتی میں دو چار بار ہی بولتی سنائی دیتی ہے.. وہ بولے تو ہم کشتی کو پھیر کر واپس چلے جاتے ہیں.... جو سندھ سائیں کے سفر سے واپس نہیں لوٹتے ہم جان جاتے ہیں کہ باغوں بلا کے بولنے پر بھی وہ مچھلی اور مرغابی کے چاؤ میں اندھے ہو کر کشتی کو کھیتے رہے اور پھر بلا نے انہیں نگل لیا..."

"تو تم نے کچھ نہیں سنا... کسی پرندے کو... کسی.. مور کو؟"

"مور کو؟... وہ نمانا ادھر پانیوں کے آس پاس کہاں سے آئے گا سائیں.. اُدھر چولستان میں جھنکارتا پھرتا ہے... میں نے تو آج تک اس کا نظارہ بھی نہیں کیا۔"

شاید وہ صرف اس کے تن بدن میں کوکتا تھا.. اسے اور کوئی نہیں سن سکتا تھا..

سرور کشتی کے پچھلے حصے میں منہ کھولے سو رہا تھا اور دریائی مکھیاں اس کے سیاہ چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں.. پکھی اس کے نیند میں ٹھہرے ہوئے جثے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کی لشکتی آنکھوں میں کسی ایسی پیاس کے قصے تھے جس نے ہزاروں برس پہلے اس کے دراوڑ بدن کو خشک کر دیا تھا لیکن اس نے وہ مٹھی نہیں کھولی تھی جس میں کنک کے چند دانے تھے..

صرف فہیم کشتی پر نہ تھا..

اس نے آج سویرے جب کہ اس کی آنکھوں میں ابھی تک انڈس کوئین تیرتی تھی.. تاریکی میں غیر مرئی ریلنگ کے سہارے کھڑی وہ پاگل خانہ اپنی غلافی آنکھیں جھپکاتی تھی فہیم نے آج سویرے اس کے لیے دیسی انڈے فرائی کیے تھے ڈیرے کی کسی نیم پختہ بیکری کی ڈبل روٹی کے سلائس توے پر سینکے تھے اور کسی ناآسودہ بھینس کے مکھن کو ان پر لگا کر اسے ایک صاحبوں ایسا ناشتہ مہیا کیا تھا اور پھر پوچھا تھا "سائیں رات کے کھانے میں کیا لو گے؟"

"کچھ بھی.." اس نے کہا تھا "دال چاول.. روٹی.. اچار کے ساتھ.. کچھ بھی"

"نہ سائیں.." فہیم آزردہ سا ہو گیا "یہ سب کچھ تو بے عقل مہانے بھی کھلا سکتے تھے.. میں جو اپنے ہیڈ ماسٹر کو ناراض کر کے آیا ہوں تو اس لیے تو نہیں آیا ہوں کہ آپ دال چاول اور روٹی کھائیں.." یہ اس کی انا کا مسئلہ جھائی دیتا تھا "نہ سائیں... میں تو آپ کے لیے آج رات مرغی بھونوں گا اگر اللہ چاہے.. اور مرغی میں ابھی لاتا ہوں.."

"کدھر سے؟"

"سندھ ساگر کے کنارے ادھر سے تو بے آباد لگتے ہیں لیکن آباد تو ہیں ناں سائیں.. تو کسی گاؤں میں جاتا ہوں اور آپ کے لیے مرغی لاتا ہوں۔"

اس سے پیشتر کہ وہ اسے بتاتا کہ وہ مرغی کا اتنا شوقین نہیں ہے' فہیم نے اپنے آپ کو کپڑوں کی قید سے آزاد کیا انہیں سمیٹ کر سر پر رکھا اور پھر اپنی محبوب ٹیوب کو آغوش میں لے کر سندھ میں کود گیا..

چنانچہ فہیم کشتی پر نہیں تھا..

جب سے وہ غازی گھاٹ سے چلے تھے.. کشتی نے کنارے کو چھوڑا تھا.. وہ سندھ ساگر میں تنہا مسافر تھے.. اس کے پانیوں پر اکیلے پکھیرو تھے جو تیرتے تھے... وہ اپنی تنہائی کے

اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ انہیں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے سوا اس دریا کی ملکیت کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے..

انہیں ایک دھچکا سا لگا جب انہوں نے پہلی بار کسی اور کو دیکھا..

دو بادبانی کشتیاں دکھائی دیں..

وہ ان سے بہت فاصلے پر تھیں' ایک ویران پٹی کے دوسری جانب دریا کی تیز بہاؤ والی شاخ جو چوڑے اور دھوپ میں چمکتے پاٹ کی تھی اس میں وہ مختصر سائز کی بچوں کی سی جو ہڑ میں تیرتی کھلونا کشتیوں کی مانند تیرتی جاتی تھیں اور ان کی رفتار ایسی تھی کہ دھوپ سے روشن پانیوں پر تیزی سے پھسلتی ہوئی لگ رہی تھیں... ان کا رخ غازی گھاٹ کی جانب تھا.. ان میں سے ایک جس کا بادبان سفید رنگ کا تھا وہ ایک بے چین پتنگ کی طرح ہوا سے پھولتی ہوئی پانی سے اٹھنے کو لگتی تھی اور دوسری سیاہ بادبان والی تھی.. ایک چگادڑ نظر آتی تھی جو سطح آب پر تیرتی چلی جا رہی تھی..

"یہ بھی تمہارے قبیلے کی کشتیاں ہیں؟"

"نہیں سائیں.." جعفر نے ذرا آگے ہو کر سندھ میں تھوکا "یہ تو کمینے لوگ ہیں.. کاروباری لوگ ہیں.. یہ تو دریا میں نکلتے ہیں تو مچھلی اور پرندوں کی بربادی کر دیتے ہیں.. پکڑ کر شہر لے جاتے ہیں اور پیسہ بناتے ہیں... رہتے کہیں اور ہیں زمین کے باسی ہیں اور سندھ میں صرف لانچ لے کر اترتے ہیں.. ہماری طرح پانی کا پوتگ نہیں ہیں' یہ تو پانی کو بیچ کھانے والے ہیں.. بے اعتبارے ہیں۔"

"رزق کے لیے تو سب لوگ کوشش کرتے ہیں ماماں.."

"نہ سائیں.. اپنے پیٹ کے لیے کریں تو جائز ہے.. پر یہ دوسروں کے پیٹ کے لیے سندھ کو اجاڑتے ہیں.. اللہ سائیں نے سندھ سائیں کے اندر اتنا رزق پیدا کیا ہے کہ روز قیامت تک اس میں کمی نہ آئے.. ہم اور پرند پکھیرو اور مچھلی برابر کی زندگیاں کرتے ہیں... پر یہ باہر والے جو ہیں یہ ان کا گھر نہیں ہے اس لیے ان کو کیا پروا کہ یہ بے شک اجڑ جائے.. مچھلی کم ہو گئی ہے.. سرور نہیں بیٹھا رہا کل اور سب کچھ بیکار گیا.. ان کی وجہ سے پرند پکھیرو بھی ہم سے بے اعتبارے ہو گئے ہیں.. میں نڈھا تھا ناں سائیں' چھوٹا بچہ تھا تو اپنے بادا کے ساتھ سندھ میں نکلتا تھا.. ہماری کشتی جب کسی ایسے ٹاپو کے پاس سے گزرتی تھی ناں

جس پر کونجوں اور سرخابوں کا بسیرا ہوتا تھا تو وہ بس ایک بار چونچیں اٹھا کر ہمیں دیکھتے تھے اور پھر اپنے دانہ پانی اور گھاس چگنے لگتے تھے' بیٹھے رہتے تھے.. پر اب تو ایسا ہو گیا ہے سائیں کہ وہ بے اعتبارے ہو گئے ہیں.... کشتی کو دور سے دیکھ لیں تو شور مچاتے اڑ جاتے ہیں.. مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں اپنے باوا کے ساتھ ایک ٹاپو پر اترا تھا اور ہم دونوں دم روکے پرندوں کے درمیان میں چلتے گئے تھے اور مجال ہے کہ ان میں سے ایک بھی پھڑ پھڑا کر اڑا ہو.."

دونوں کشتیاں.. سفید اور سیاہ بادبان پھڑ پھڑاتی لمحوں میں اوجھل ہو گئیں اور کرنوں سے دمکتی چادر پھر سے خالی ہو گئی۔

"تم لوگ سدا سے سندھ میں ہی رہتے ہو؟"

"ہاں سائیں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سندھ سائیں کے ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے.. اس کی پہلی بوند کے ساتھ.. پر کبھی ایسا ہو جاتا ہے شادی بیاہ کے موقع پر کہ ہم یہ بوٹی بہت پی لیتے ہیں تو ہمارا ایک بڑا ہے مہانوں کا... اس کو سب مامن ماسا بولتے ہیں.. پتلا چھمک ہے' بہت وڈیرا ہے پر ابھی تک جھکا نہیں ہے.. وہ کبھی خشکی پر نہیں اترا سائیں' ہمیشہ کشتی میں رہتا ہے.. تو جب وہ خشخاش اور کالی مرچ والی خاص بوٹی پیتا ہے جو منہ اندھیرے سے جب سویر کا تارا ابھی آسمان پر کھڑا ہوتا ہے گھوٹی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہم سدا سے سندھ کے باسی نہیں ہیں... اوپر ادھر چولستان کی ریتوں میں کسی زمانے میں کوئی سرسوتی نام کا دریا تھا جس کے کناروں پر ہماری بستیاں تھیں.. بوٹی زیادہ پی لیتا ہے ناں مامن ماسا تو ایسی باتیں کرتا ہے.. اور پھر وہ کہتا ہے کہ وہ دریا اللہ سائیں کی مرضی سے سوکھ گیا تو ہم لوگ ادھر آ گئے.. وہ کہتا ہے۔"

"اگر سندھ سوکھ گیا تو پھر کہاں جاؤ گے؟"

"نہ سائیں یہ تو ہمارا پالن ہار ہے.. ان داتا ہے اور سائیں ہے یہ کیسے سوکھ سکتا ہے.. یہ بھی اگر اللہ سائیں کی مرضی سے سوکھ گیا تو پھر ہم بھی سوکھ جائیں گے۔"

برمانی کے آشرم میں اس کے کنج کے اندر' جہاں ایک چوبیار ہتی تھی' ایک سانپ کا بسیرا تھا وہاں کتابوں کے شیلف کے نچلے حصے میں ٹھیکریوں' منکے موتیوں' پرانے سکوں اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کی ایک بستی بے اعتنائی اور بے خبری کی دھول سے اٹی پڑی تھی.. کل سویرے جب تالاب کے گرد بلند ہوتے سرکنڈوں پر ابھی اوس چمکتی تھی اور اس کی

بوندیں پانی میں ٹپ ٹپ کرتی گرتی تھیں اور انہی سرکنڈوں کے اندر چڑیوں کا شور بے حساب اور کانوں میں کھلکھلاتا تھا اور ان کے پاس سے گزرتے ہوئے جب سرکنڈے اس کے بدن کو چھوتے تھے اور ہلتے تھے تو اوس کی بوندیں زیادہ تیزی سے تالاب میں گرتی تھیں اور سرکنڈوں کی دھاریں تیز تھیں اور اس کے یخ بستہ ہاتھوں پر خراشیں چھوڑتی تھیں..

وہ کمرے میں واپس آیا تو اس نے شیلف میں ڈھیر ٹھیکریوں اور منکے موتیوں میں اوندھی پڑی مٹی کی کہ اس مورت کو دیکھا جس پر اس کی نظر نہیں گئی تھی... مٹی کی اس مورتی پر صدیوں یا شاید ہزاروں برسوں کی راکھ اور اس میں سے نمودار ہوتی چونے کی سفیدی تھی جو اس کے نقش و نگار پر جمی ہوئی تھی.. بڑی بڑی نشیلی اور ترچھی آنکھیں جو مہرگڑھ کے کھنڈروں سے ملنے والی مورتیوں ایسی تھیں' ستواں مگر قدرے چوڑی ناک' بال نہایت جدید انداز میں گندھے ہوئے اور شانوں تک آئے ہوئے... اس کی ایک چھاتی قائم تھی اور دوسری اکھڑ چکی تھی... وہ موہنجوداڑو کے کنگ پریسٹ کے قبیلے کی لگتی تھی.. اس کی آنکھیں بے حد زندہ لگتی تھیں.. انہیں بہت دیر تک دیکھنے سے گھبراہٹ سی ہوتی تھی.. وہ بالشت بھر بھی نہ تھی لیکن دیکھنے والے کو اپنے اثر میں لے لیتی تھی.. اسے جس کسی نے بھی بنایا تھا.. مٹی گوندھ کر اسے شکل دی تھی اور پھر آگ میں پکایا تھا بے دھیانی میں نہیں بنایا تھا.. خیال سے اس کے نقش اور چھاتیاں نہیں ابھاریں تھیں' اس کے سامنے وہ تھی ایک ماڈل کے طور پر.. اس نے اسے جیتنے کے لیے اسے بنایا یا وہ اس کے بس میں نہ آتی تھی تو اسے پوجنے کے لیے اسے شکل دی.. بہر طور یہ مورتی بھی زندہ تھی۔

پکھی نے اپنا جھگا اٹھایا اور اپنے بچے کے سر کو چھاتی سے لگا لیا..

وہ دونوں ہو بہو تھیں.. مورتی اور پکھی!

اگرچہ اس کی دونوں چھاتیاں سلامت اور زندہ تھیں.. اور اس نے ان میں سے ایک دھڑکتی اور مدھر چھاتی کو بچے کے منہ میں دیا اور پھر جھگا نیچے کیے بغیر ماماں جعفر سے باتیں کرتے.. سیاہ اور سفید بادبانوں والی کشتیوں اور مامن ماسا اور سرسوتی کی باتیں کرتے اپنا جھگا نیچے کیے بغیر خاور کی جانب آنکھ بھر کر دیکھا.. نشیلی اور ترچھی آنکھیں جو زندہ تھیں اور انہیں بہت دیر تک دیکھنے سے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی.. خاور نے نظریں جھکا لیں.. وہ جھجک گیا.. اس نے منہ پھیر کر ماماں جعفر کی طرف دیکھا جو ایک مرتبہ پھر کیپٹن اہاب کے

انداز اپنا چکا تھا اور سندھ ساگر کو اپنی نظروں سے چھان رہا تھا..

جیسے منہ موڑنے کے باوجود وہ مورتی اس کی پشت سے آ لگی ہو..اس کی ایک چھاتی اس کے ماس کو چھوتی ہو اور دوسری کا خلا اسے بے چین کرتا ہو کہ کسی طرح وہ بھی بھر جائے اور اس کے ساتھ آن لگے..اس کا اپائے تو صرف پکھی کے پاس تھا کہ وہ سلامت تھی..وہ عمر کے اس ادھیڑ بن تک پہنچتے ہوئے ترغیب اور کشش سے تقریباً بیگانہ رہا تھا..جان بوجھ کر اپنے آپ پر قابو رکھ کر نہیں بلکہ اس کے اندر یہ حس شروع سے ہی کم تھی..جن دنوں میں ہر شے نئی نویلی اور چکیلی اور ناتجربہ کار تھی اور اس کے دوست کسی ایک ٹخنے کی جھلک دیکھ کر بھڑک جاتے تھے وہ بے اثر اور ٹھنڈا رہتا تھا اور اسے حیرت ہوتی تھی کہ نسوانی وجود میں وہ کیا ہے جو انہیں یکدم بے حال کر دیتا ہے..ان وقتوں میں اس کے بس سے باہر جو بدنی مجبوریاں تھیں ان کی بھڑک شادی کے دو تین برسوں میں ہی بجھ گئی اور وہ ان سلسلوں سے تقریباً بے نیاز ہو گیا..اور اب تو پت جھڑ کی نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں..اور اس کے باوجود یہ جو مکمل مورتی تھی جان بوجھ کر اپنا جھگا اٹھائے اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہوئی وہ اس کے اندر چھید ڈالتی تھی..

اس نے اسے پہلے بھی کہیں تو دیکھا تھا..

مورتی کی صورت میں نہیں..کہیں اور...پر کہاں..شاید یہ ان پانیوں کے علم میں تھا جو اس کشتی کو سہارتے اسے آگے لے جاتے تھے..

وہ ایک اور ریتلے ٹاپو سے کھیتے ہوئے گزرے...ریت شکستی اور ویران تھی..

جعفر نے پانیوں کو چھانتی نظروں کو الگ کیا اور مڑ کر کہنے لگا "سائیں آپ کے آنے میں دیری ہو گئی ہے..کونجیں وداع ہو گئی ہیں..یہ ٹاپو ان سے بھرا رہتا تھا..آپ ریت کو تو دیکھو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھرا ہوا تھا۔"

ٹاپو بہت نزدیک تھا..کشتی اس کے کناروں سے چھوتی انگلی آگے ہوتی تھی اور شفاف دھوپ میں دکھائی دیتا تھا کہ وہاں جو ریت ہے ان چھوئی نہیں ہے..اس پر پنجوں کے نشان ثبت ہیں..جیسے اجرک کے کپڑے پر جا بجا چھاپے لگے ہوں..کونجوں کے بھار سے وہ نشان اتنے گہرے تھے کہ ہوا انہیں پوری طرح بھر نہیں سکی تھی اور ریت کے سپاٹ چہرے پر دھوپ انہیں نمایاں کرتی تھی...

"کونجیں وداع ہو گئی ہیں سائیں.." جعفر کی آواز میں ہر ایک کونج کا جو اس پر اتری تھی 'دکھ تھا' "ادھر سے اڑ کر وہ کونج دشت کو جاتی ہیں اور پھر واپس ہو جاتی ہیں جدھر ان کے گھر اور گھونسلے ہوتے ہیں۔"

"کدھر؟"

"اپنے وطنوں کو لوٹتی ہیں سائیں..ادھر تو مہمان ہوتی ہیں..پر جب آتی ہیں تو کونج دشت کو ایسے بھرتی ہیں کہ زمین دکھائی نہیں دیتی..لگتا ہے پوری کائنات میں صرف کونجیں ہیں جو کرلاتی ہیں اور کلبلاتی ہیں..ان کی جو چونچیں اور پر ہیں اور ان کے پنجے ہیں اور ان کا ہجوم زمین پر پہنچنے کے لیے آیا ہے.."

کونج دشت تو ویران تھا..وہاں کوہ سلیمان کے دامن تک ایک بھی کونج نہ تھی..

کونج دشت..دلورائے کے گمنام اور پرشکوہ کھنڈر..جہاں سے برمانی کو شدید بارشوں کے بعد ٹھیکریوں میں سے ظاہر ہوتی صرف ایک چھاتی والی جدید ہیئر ڈو والی لمبی آنکھوں والی مورتی ملی تھی..جام پور...اور ہڑپہ کی گندم پیسنے والی چکیوں کے زمانے کی بستی داجل سے پرے....برمانی اسے کوہ سلمان کے دامن تک ہڑند قلعہ کے باقیات دکھانے کے لیے لے گیا تھا..

سورج کا سنہری رتھ کوہ سلمان کے عقب میں اتر چکا تھا..

ڈھلتی شام میں اس سلسلہ کوہ میں کاہا درّے کی دراڑ چٹانوں کے اندر تک جاتی تھی..اور وہاں سے بلوچستان تک جا نکلتی تھی...اسی نام کی..کاہا رود کی بھی اپنے پانی کو سنبھالتی یہاں سے ظاہر ہوتی تھی۔اسی درے کے قریب...آس پاس دور دور تک خشک اور بے آباد چٹانیں تھیں لیکن اس درّے کے دروازے میں کھجوروں کے جھنڈ تھے جہاں مدتوں پہلے قافلے ٹھہرتے تھے..

ہڑند کے شکستہ داخلے کے باہر ایک مکان میں ایک لالٹین روشن تھی۔

دروازے کے اندر داخل ہونے پر نہ کوئی شیش محل تھے اور نہ کوئی دیوان خاص۔شام کی اترتی سیاہی میں تا حد نظر ٹیلے ٹھیکریاں اور ایسے کھنڈر تھے جن کی تاریخ کی کڑیاں ابھی تک نہیں جڑ سکیں..مقامی روایتیں تھیں 'سکندر اعظم کے کسی ثبوت کے بغیر قصے تھے...ہڑند کا شہر..موہنجوڈارو کا بھائی تھا یا اس سے بھی قدیم کوئی بستی تھا یہ کوئی نہیں جانتا۔

اسے ہڑند کی کڑیاں گم ہو جانے کا قلق نہ تھا..
لیکن اس کے راستے میں پڑتے کونج دشت کی ویرانی نے اسے بے گھر اور بے آسرا کر دیا..

پکی اور حالیہ بارشوں کی زد میں آکر کیچڑ بھری سڑک.. جس پر شام کے خوف میں ان کی دھواں دیتی بار بار رکتی اور دل کو روکتی کہ اگر یہاں رات ہو گئی تو کیا ہو گیا.. وہ جیپ ایک ویران جہان میں ہچکولے کھاتی جاتی تھی جب برمانی نے دائیں جانب اشارہ کر کے کہا "سائیں یہی کونج دشت ہے.."

جیپ سے پرے کائنات کے آخر تک اور شاید اس سے بھی پرے ایک ویرانہ جاتا تھا.. اور اس سے بھی پرے تصور اور خیال کی حدوں سے آگے وہ دشت وہ ویرانہ جاتا تھا جو کوئی موسم یا زمانے ایسے تھے جن میں یہ کونجوں سے بھر جاتا تھا..

اور جب ہڑند کی مسافت کے راستے میں یہ دشت آیا تو ویران نظر آیا اور وہاں ایک بھی کونج نہ تھی..

یہ سرسوتی کی مانند خشک ہو چکا تھا..

لیکن سرسوتی کی پاروشنی اب سندھ کے کناروں پر آکر بس چکی تھی اور اب اپنا جھکا پیچھے نہیں کرتی تھی تاکہ وہ دیکھ لے کہ وہ ابھی تک سالم ہے.. ہزاروں برس گزرنے کے باوجود اس کی ایک چھاتی دلورائے کے کھنڈروں میں سے ظاہر ہونے والی مورتی کی مانند اکھڑی نہیں قائم ہے اور اس بچے کو دودھ پلاتی ہے جو سرسوتی کی خشک ریت پر پیاس سے سکڑتے بدنوں کے ملاپ کا ثمر تھا..

سومرو کے بیج سے پھوٹا تھا..
سرسوتی خشک ہو چکا تھا..
راوی خشک ہو رہا تھا..
....اور سندھ نے ابھی خشک ہونا تھا..

دولہا دولہن اپنے کمرے میں جا چکے تھے..

سائیڈ ٹیبل کا لیمپ ابھی تک روشن تھا.. دیواروں پر تازہ پینٹ تھا اور وہ شیڈ میں سے نکلنے والی ہلکی روشنی کو گیلاہٹ کی وجہ سے جذب نہیں کرتا تھا بلکہ اسے دوچند کر کے کمرے کی ہر شے کو نمایاں کرتا تھا..

"لیمپ آف کر دو بھئی..." مرزا صاحب ناگواری اور تھکن میں بڑبڑائے' آنکھیں کھولیں جو تھکاوٹ میں بوجھل اور پژمردہ تھیں اور ان کے چہرے کی نسبت کہیں زیادہ بوڑھی اور بے جان لگتی تھیں' کروٹ بدل کر اپنے برابر میں چھت کو گھورتی غلافی آنکھوں پر ایک غصیلی اور شکایت آمیز نظر ڈالی "سو جاؤ... صبح ولیمے کی تیاری کرنی ہے۔"

اس کی نیم سنہری غلافی آنکھیں کھلی تھیں اور چھت کے اس حصے کو دیکھے جا رہی تھیں جس پر پینٹ کا فائنل کوٹ ہونے سے رہ گیا تھا.. اور وہاں ہلکے گلابی رنگ کا ایک پیچ باقی تھا جو چھت کے بقیہ حصے سے بالکل الگ نظر آ رہا تھا.. دن کی روشنی میں وہ نا معلوم رہا تھا اور اسے نظر نہیں آیا تھا ورنہ وہ پینٹ کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی.. اب یوں چت لیٹے ہوئے لیمپ شیڈ کی بالائی گولائی میں سے ایک خاص زاویے پر نکلنے والی براہ راست روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور اسے الجھن ہو رہی تھی.. اگرچہ ایمر جنسی میں پورے گھر کو رینوویٹ اور پینٹ کرنے کے دوران اس قسم کی چھوٹی موٹی خامیاں تو رہ ہی جاتی ہیں لیکن پھر بھی اسے الجھن ہو رہی تھی اور وہ اس پیچ پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتی تھی اسے گھورے چلی جاتی تھی... کیا فرید کے کمرے کی چھت کا بھی کوئی حصہ اسی طور دوبارہ پینٹ ہونے سے رہ گیا تھا.. اگر ایسا ہوا تھا تو فرید تو اسے نہیں دیکھتا ہو گا اس کی دولہن دیکھتی ہو گی کیونکہ شادی کی پہلی

رات تو دولہن کے نصیب میں ان لمحوں میں صرف چھت کو دیکھنا ہی ہوتا ہے جو بے چارگی اور خیالی تمناؤں کی ناآسودگی کے آنسوؤں میں دھندلی نظر آتی ہے..

وہ اس لمحے کیا کر رہے ہوں گے ؟.. اس کا دل یکدم حسد اور جلن کی مٹھی میں بھینچا جانے لگا اور اس نے منہ کھول کر ایک لمبا سانس لیا.. وہ اپنی پہلی رات کا اس رات سے موازنہ کرنے لگی اور اس کا ذہن سلگنے لگا.. شٹ اپ یُو بِچ.. شٹ اپ.. اس نے اپنے آپ کو ڈانٹا.. آر یو جیلس ؟ یس آئی ایم... بِچ نے غراتے ہوئے کہا.. ہاں میں ہوں.. بیٹے محبوب ہوتے ہیں اور وہ ایک ہی شب میں تمہاری عمر بھر کی ممتا اور محبت فراموش کر دیتے ہیں.. صرف ایک اجنبی بِچ کی خاطر...

شٹ اپ.. اس نے پھر اپنے آپ کو سرزنش کی اور اپنے آپ کو پرسکون کرنے کے لیے اور اپنی کمینگی سے توجہ ہٹانے کے لیے زیر لب وہ تسبیح دوہرانے لگی جو زندگی بھر دوسروں کے خاوندوں کو تاکنے اور انہیں زیر کرنے والی مسز آفریدی نے توبہ تائب ہو کر اپنے گھر میں درس کا آغاز کرنے کے بعد اسے بتائی تھی.. لیکن اس کا دھیان بار بار فرید کے کمرے کی چھت کی جانب جاتا تھا اور اس پر نظریں جمائے دولہن کی جانب جاتا تھا..

لیمپ کے نیچے تپائی پر کارک کے بنے ہوئے میٹ پر پانی کا گلاس دھرا تھا..

بہت دنوں بعد آج شادی کے ہنگامے میں جب کہ مہمانوں کو خوش آمدید کہتے کہتے اس کی باچھیں پتھرا چکی تھیں' ٹانگوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' بھاری بروکیڈ کے لباس کے بوجھ سے اس کے کندھے دکھنے کو آئے تھے اور کمر کے گرد جہاں اس نے لہنگے کو کسا تھا ابھی تک ازاربند کی گرفت ماس میں کھبی ہوئی تھی' اس نے اپنی گولیوں اور کیپسول کو فراموش کر دیا تھا... وہ اس کے ذہن میں تو تھیں لیکن موقع ہی نہیں ملا تھا.. اگر ایک دن کا ناغہ ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے.. اگرچہ جو آنے کو ہے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا.. اس نے چھت سے نظریں ہٹائیں اور دونوں کہنیاں فوم میں ٹکا کر اٹھی اور کمبل پرے کر کے بیٹھ گئی مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ خراٹے لیتے مرزا صاحب ڈبل بلینکٹ کے ذرا سے کھسکنے کو محسوس نہ کریں..

اس کا ہینڈ بیگ تپائی کے نچلے حصے میں تھا.. وہ جھکی اور آہستہ سے اس کے سٹریپ پر انگلیاں جما کر اسے اٹھا لیا.. بیگ میں درجنوں لفافے ٹھنسے ہوئے تھے جن میں فرید کی

سلامیاں تھیں... ہر لفافے پر جلی حروف میں کسی رشتے دار کسی دوست کسی سہیلی کا نام تھا اور اس کے اندر کرنسی نوٹ کے ساتھ بھی یقیناً ان کا کارڈ سٹیپل کیا ہوا تھا تاکہ یہ پوری طرح عیاں ہو جائے کہ یہ قرض کس نے اتارا ہے یا کون ہے جس نے آئندہ کے لیے اپنے بیٹے یا بیٹی کے لیے یہ رقم انوسٹ کی ہے.. اس نے ان لفافوں میں سے بڑی مشکل سے دوائیوں کے پتے اور بوتلیں تلاش کیں' پھر خوراک کے مطابق انہیں نکال کر اپنی ہتھیلی پر سجایا اور ایک گہرا سانس لے کر انہیں پھانکا اور گلاس اٹھا کر پانی کا ایک گال پھلا دینے والا بڑا گھونٹ بھرا.. اگرچہ گولیاں اور کیپسول حلق میں سے اتر گئے لیکن اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی وہیں اٹکے ہوئے ہیں اور اس نے متعدد گھونٹ لے کر گلاس کو خالی کر دیا..

مرزا صاحب کا منہ کھلا ہوا تھا اور اگر ان کی ناک میں سے ایک خرخراہٹ تھراتی ہوئی باہر آتی سنائی نہ دیتی اور ان کی ناک کے متعدد بال بار بار اٹھتے نظر نہ آتے تو وہ مردہ لگتے.. نیند ہر شخص کو بدصورت بنا دیتی ہے..

فون نمبر اس نے کئی ہفتے پہلے ہی حاصل کر لیا تھا... اس روز جب وہ فرید کی شادی کی تاریخ مقرر کر کے گھر آئی تھی.. اسی روز.. اور اسے زبانی یاد تھا.. اتنی بار ذہن میں دوہرا چکی تھی کہ اگر صرف سوچ سے ٹیلی فون کے نمبر دبتے جاتے تو اس کے گھر میں ٹیلی فون کی گھنٹی دن رات متواتر بجتی چلی جاتی..

وہ اپنی خوراک نگلنے کے بعد لیٹی نہیں' بیٹھی رہی' لیمپ کی روشنی میں اس کی نیم سنہری' غلافی اور کشش میں بجتی ہوئی.. سیال اور پل بھر میں متغیر ہونے والی جاندار آنکھیں... پورے کمرے پر راج کرتی تھیں... ان کی زد میں آنے والی ہر شے... ٹیبل لیمپ' گلاس' بک شیلف' بچوں کی فریم شدہ تصویریں' کرسٹل کے زیبائشی گھوڑے اور بادبانی کشتیاں اور جاپانی کمبل.. ہر شے سیال حالت میں بہنے لگتے تھے.. لیکن بچوں کو جنم دینے سے اور مرزا صاحب کی مجنونانہ جنسی زبردستیوں سے اس کا بدن بہت بگڑا تھا' ڈھیلا اور بدوضع ہوا تھا لیکن اس کی آنکھیں اس توڑ پھوڑ میں سلامت رہی تھیں.. ان پر وقت کا بہاؤ اور بے چاہت دباؤ اثرانداز نہیں ہو سکے تھے..

صرف اس کے پاؤں کمبل میں روپوش تھے.. انہیں سمیٹ کر وہ پلنگ سے اتری اور بیڈروم سلیپرز کے بغیر ننگے پاؤں کمرے سے باہر آ گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظر فرید کے بیڈ روم کے دروازے کے نچلے حصے پر گئی اور وہاں فرش کے چپس کو نمایاں کرتی ہلکی سی روشنی ابھی تک تھی..

وہ دونوں کیا کر رہے ہیں... اس کے حسد نے پھر دوہائی دی اور پھر اس نے زیر لب بڑبڑا کر.. شٹ اپ یُو بچ کہا اور لاؤنج میں آ گئی..

لاؤنج میں اندھیرا تھا.. اور اس میں گوٹی کناری کے لہنگے اور غرارے تھے.. سلک کی قمیضیں اور زیور تھے اور ڈائمنڈ نیکلس اور بندے تھے جو تاریکی میں بھی کہیں کہیں چمکتے تھے اور جنہیں نیند میں اترنے سے پیشتر اتارنے اور سنبھالنے کی زحمت کسی نے گوارہ نہ کی تھی.. تھکے ہوئے بے سدھ لوگ صوفوں پر... قالین پر... کمبلوں.. گرم چادروں اور رضائیوں میں لپٹے گہری خوابیدگی کے عالم میں اپنے تن بدن کا ہوش نہ رکھتے تھے... البتہ قالین کا ایک حصہ خالی تھا کیونکہ وہاں دولہن نے پانی سے بھرا ہوا مٹکا توڑا تھا... مٹکے کی ٹھیکریاں بھیگے ہوئے قالین پر بکھری ہوئی تھیں... دولہا دولہن پر وارے گئے سفید چاولوں کے دانے تاریکی میں بھی فرش پر سفید اور بے حس و حرکت چیونٹیوں کی مانند دکھائی پڑتے تھے.. وہ پلیٹ ابھی تک ایک تپائی پر دھری تھی اور اس کی سطح سے وہ شیرینی چمٹی ہوئی تھی جس میں سے ایک چمچ کھیر کا دولہن نے اپنے منہ میں ڈالا تھا... جہیز کا سامان' مہمانوں کے جوتے' مسلے ہوئے پھولوں کے ہار' گلدستے' بچوں کے کھلونے اور سالن کے ڈونگے... اسے بار بار ٹھوکر لگتی اور وہ اندھیرے میں ہاتھ پھیلا کر سنبھلتی' رُک کر سامنے دیکھنے کی کوشش کرتی اور پھر اگلا قدم اٹھاتی..

فرنچ ونڈوز کے قریب' لاؤنج کے آخر میں' ایک کونے میں' ٹیلی فون ڈائریکٹریوں کی دبیز جلدوں کے اوپر سرخ رنگ کا ٹیلی فون پڑا تھا.. اس کی گھنٹی کی آواز بند کر دی گئی تھی تاکہ مہمانوں کی نیند میں خلل نہ پڑے.. اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے گرفت میں لیا' دوسرے ہاتھ سے اس کی کیبل کھینچ کر سمیٹی اور پھر اسے اٹھا کر لاؤنج کا دروازہ کھولا اور باہر برآمدے میں آ گئی.. وہ بے اختیار کپکپائی اور مشکل سے اپنے دانتوں کو کٹکٹانے سے بچایا.. نومبر کی رات میں جو سرد اور نوکیلی دھار تھی وہ اس کے تھکاوٹ بھرے بدن تک اس کے شب خوابی کے ہلکے لباس کو چیرتی پہنچی اور اس کے ڈھیلے ماس کو تناؤ میں لے آئی.. گھر کے اندرون میں انسانی جسموں کی گرمی سے ایک آسائش کی کیفیت والا ہلکی حدت اور

سانسوں کا ایک موسم ٹھہرا ہوا تھا.. لیکن باہر ایک ایسی سردیلی کاٹ تھی جس کے لیے وہ تیار نہ تھی.... اس نے ایک مرتبہ پھر ٹیلی فون کی تار کو کھینچ کر اطمینان کیا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس راکنگ چیئر کو ٹٹولا جو صبح سویرے اخبار پڑھنے کے لیے مرزا صاحب کی مرغوب بیٹھک تھی..

برآمدے میں گھپ اندھیرا تھا.. تمام روشنیاں بجھ چکی تھیں.. درختوں اور جھاڑیوں میں سر شام جو کرسمس لائٹس ٹمٹماتی تھیں اور مہمانوں کی آنکھوں کو اپنی سجاوٹ سے خیرہ کرتی تھیں اب وہاں نہیں تھیں.. بجلی کی سجاوٹ اور نمائش کرنے والے انہیں اتار کر لے جا چکے تھے..

راکنگ چیئر پر بیٹھ کر' فون کو اپنی گود میں رکھ کر وہ نمبر کے بٹن دبانے لگی.. اور اسے وہ فون نمبر زبانی یاد تھا.. جس شخص نے پوری زندگی اس آس میں بسر کی ہو کہ بالآخر جب وہ فارغ ہو گا تو کوئی ایک نمبر ڈائل کرے گا تو وہ اس نمبر کو کیسے بھول سکتا ہے.. ابھی اس نے ایک نابینا کی طرح بریل کے ابھرے ہوئے لمس تلے آئے ہوئے... صرف تین ہندسے دبائے تھے کہ اس کے بہت قریب میں.. یکدم تاریک اور سکوت میں آتی ہوئی خاموشی میں ایک پھڑ پھڑاہٹ سی ہوئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی.. ٹیلی فون اس کی گود سے پھسل کر فرش پر جا گرا اور لاؤنج کے اندر سے کسی مہمان کی نیند میں بھیجی ہوئی آواز چونکی "کون ہے؟"

چونگا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور ٹیلی فون فرش پر گرنے کا احتجاج کرنے کے بعد اب کہیں گہرے سکوت میں گم ہو چکا تھا.. وہ ڈر گئی تھی... وہ ڈرنے والی عورت تھی.. اسے اندھیرے سے.. چھپکلیوں سے.. چمگادڑوں سے.. اور مرزا صاحب سے ڈر آتا تھا.. دم روکے ہوئے اس کی غلافی آنکھیں مزید پھیل گئیں... برآمدے میں دھرے تین بڑے گملوں میں سے ایک پر.. جن میں انہی دنوں ڈبل پٹونیا کے پودے لگائے گئے تھے ان میں سے ایک گملے کے کنارے ایک کبوتر براجمان تھا.. اور وہ بھی اُس کی یکدم موجودگی سے اتنا ہی خوفزدہ ہوا تھا جتنی کہ وہ... اور وہی یکدم پھڑپھڑایا تھا۔

اس کے تنے ہوئے خوف کے مارے اعصاب سکون میں آ گئے..

یہ عجیب سی رسم جانے ان کے رواجوں میں کہاں سے در آئی تھی کہ دولہن چوکھٹ میں قدم رکھے تو تیل ڈالنے کے علاوہ کبوتر چھوڑنے از حد ضروری ہیں.. شادی بیاہ

کے موقعوں پر ویسے بھی تھوڑا سا احمق اور بے دلیل ہو جانا خوشی کی نشانی ٹھہرتا ہے اور انسان اس قسم کے مشوروں کو قبول کرتا چلا جاتا ہے..اسے آج سویرے ہی یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آنٹی دولہن کی آمد پر ہر صورت تین عدد کبوتر اس کی جانب اچھالنے ہیں' عام سلیٹی رنگ کے روشن دانوں میں بیٹھیں کرنے والے کبوتر نہیں' بلکہ چتکبرے اور چینی پنکھوں ایسی گھیرے دار دموں والے کبوتر... اگرچہ پہلے دو بیٹوں کی شادی پر اس قسم کی کوئی پابندی نہ تھی لیکن ہر زمانے میں شادی کی رسمیں کچھ اور سے اور ہوتی جاتی تھیں..وہ لوگ جو اپنی کاروں پر "کرش انڈیا" کے سٹکر لگائے پھرتے تھے شادیوں پر تیل مہندی اور دیگر شگن کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور تازہ ترین ہندوستانی فلم میں دکھائے گئے شادی کے ملبوسات خصوصی طور پر تیار کرواتے تھے اور ان رواجوں کی ہو بہو نقل کرتے تھے جو ان فلموں میں کولہے چھنکاتی اور ناف لرزاتی خواتین دولہا دولہن کے سامنے پرفارم کرتی تھیں.... شاید یہ رسم بھی ادھر سے ہی آئی تھی اور وہ بحث نہ کر سکی کہ اس کے جواب میں یہی جواز پیش کیا جانا تھا کہ آنٹی خوشی کا موقع ہے..چنانچہ تین چتکبرے چینی پنکھوں ایسی دموں والے کبوتر بہت ضروری تھے..

وہ شادی کے دیگر انتظامات اپنی بڑی بہنوں کے سپرد کر کے ذاتی طور پر برڈ مارکیٹ گئی تھی اور بڑی افراتفری میں گئی تھی..اور وہاں مسئلہ یہ آن پڑا کہ پوری مارکیٹ میں چتکبرے اور چینی پنکھوں ایسی دموں والے صرف دو کبوتر مل سکے اور اس نے یہ سوچ کر کہ کبوتر کی نسل سے کیا فرق پڑتا ہے مجبوراً ایک دیسی قسم کا وہی روشندانوں میں بسیرا کرنے والا سرمئی کبوتر خرید لیا تھا..

یہ وہی دیسی کبوتر تھا جو دولہن کے گھونگھٹ پر سے پرواز کر جانے کی بجائے سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر یہاں پٹونیا کے بڑے گملے پر آ بیٹھا تھا اور ابھی تک بیٹھا ہوا تھا اور اسی نے اپنی یکدم پھڑپھڑاہٹ سے اسے ڈرا دیا تھا..اپنی اس بدتمیزی کی معذرت میں وہ اب ہولے ہولے غٹرغوں غٹرغوں کر کے شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا..

اس نے ایک طویل سانس اپنے تھکے ہوئے پھیپھڑوں میں اتارا اور پھر جھک کر ٹیلی فون اٹھالیا..راکنگ چیئر پر بیٹھ کر اس نے بٹنوں کو اپنی پوروں سے آہستہ آہستہ چھوتے ہوئے وہی نمبر مکمل کیا..

آخری ہندسہ دباتے ہی دوسری جانب گھنٹی بجنے کی آواز آئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے ذرا سا جھلایا اور انتظار کرنے لگی..

کبوتر نے ایک آخری غٹرغوں کی اور صورت حال سے مفاہمت کر لی..

خاور کے بوٹوں پر قبرستان کی دھول کی باریک تہہ تھی..

اپنے تھکے ہوئے دکھتے پاؤں کو ان میں سے نکالتے ہوئے اس نے دھول پر انگلی پھیری..ان ذروں میں..اس نے ہتھیلی پلٹ کر دھول سے اٹی پوروں کو دیکھا..ان ذروں میں جانے کیا صورتیں تھیں جو پنہاں تھیں..ہر ذرے میں کوئی نہ کوئی صورت تھی..

اس کا کھانا ٹیبل پر لگا تھا اور بشیر اپنا یہ فرض پورا کر کے اپنے کوارٹر میں..اپنی نو بیاہتا دوسری بیوی کے پاس جا چکا تھا اپنا وہ فرض پورا کرنے..

ٹیلی ویژن ابھی تک..رات کے اس پہر بھی آن تھا اور اس پر کوئی عینک والا شخص موجودہ حکمرانوں کو پیغمبری کی قربت میں لے جا رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایک مکار اور پر تکبر تقدس تھا..

طاہرہ کی موت سر شام ہوئی تھی اور اصولاً اسے کل صبح کسی وقت دفنانا چاہئے تھا لیکن میت انتظار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی..اسی لیے اسے فوری طور پر رات میں ہی دفن کر دیا گیا..وہ ابھی طاہرہ کو ہی مٹی میں دبا کر آ رہا تھا..بلکہ اسے کدالوں کی مدد سے دفن کرنے والے تو پیشہ ور گورکن تھے اور وہ صرف ایک جانب کھڑا..جب کہ بہتر تصویر کی آرزو کرنے والے بے شمار اہم لوگ اسے دھکیل کر قبر کے کناروں پر جا تعینات ہوئے تھے وہ ایک جانب کھڑا..دیکھتا رہا تھا کہ ایک پر بہار اور کومل بدن کو کیسے مٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے..اور کیسے گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں لوگ اکتاہٹ سے پہلو بدلتے ہیں اور قبر کے مکمل ہونے کا انتظار کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے حصے کی مٹھی بھر مٹی ڈھیر پر پھینک کر فارغ ہوں اور گھروں کو لوٹیں..

ایک دھان پان سی گوری چٹی اور باریک ہنستی ہوئی آنکھوں والی لڑکی..طاہرہ..ایک پر اثر اور اپنی موجودگی سکرین پر ثابت کر دینے والی اداکارہ...اس میں تھوڑا سا فلمی رنگ تھا جو ٹیلی ویژن پر جچتا نہیں لیکن اس کے باوجود اس کی ظاہری معصومیت دل کو بھلی

لگتی تھی.. اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا بے اختیار اور بے مثل رونا دھونا تھا.. وہ المیہ مناظر میں تو روتی ہی تھی لیکن خوشی کے موقعوں پر بھی دھواں دار روتی ہوئی ہنستی تھی اور مسرت کو المیے کی قربت میں لے جا کر ایک نیا انداز دیتی تھی.. اور وہ روتی ہوئی اچھی لگتی تھی۔

اگر ٹیلی ویژن کے لیے کوئی کھیل لکھتے ہوئے اسے پروڈیوسر یہ اطلاع دے دیتا تھا کہ فلاں کردار کے لیے میں نے طاہرہ کو منتخب کیا ہے تو وہ اس کی آسائش کے لیے خاص طور پر ایسے منظر تحریر کرتا تھا جن میں وہ دل کھول کر آسانی سے آنسو بہا سکتی تھی..

وہ ہمیشہ اسے "منی مدھوبالا" کہتا اور وہ منہ بنا کر ذرا نخریلی ہو کر روٹھنے کے انداز میں کہتی "خاور صاحب... آپ مجھے منی کیوں کہتے ہیں.. کیا صرف مدھوبالا کافی نہیں ہے؟"

"بھئی اس لیے کہ مدھوبالا تو پٹھانی تھی.. ہڈ پیر کی مضبوط اور ذرا فراخ.. اور تم ذرا دھان پان اور مختصر ہو.. اس کا منی ایڈیشن.. نو آفنس.."

آخری بار وہ اسے تب ملی تھی جب وہ ٹیلی ویژن سٹیشن کے صدر دروازے کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا اور وہ کسی ڈرامے میں شوٹنگ کے وقفے کے دوران باہر آ کر اس کے برابر میں آ بیٹھی تھی.... وہ ٹھیک نہیں لگتی تھی.. اسے دیکھ کر خاور کو کچھ ملال سا ہوا.. میک اپ کے باوجود اس کے چہرے پر رونق نہیں تھی اور وہ پھولا ہوا سا لگتا تھا.. وہ پہلے سے بھی دبلی ہو چکی تھی..

"خاور جی.. آپ نے آج تک جتنی لڑکیاں دیکھی ہیں.. کیا میں ان سب سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوں.." اس نے بڑی سنجیدگی سے یہ سوال پوچھا تھا۔

دسمبر کی دھوپ میں اس کے چہرے کی زردی میک اپ کی تہوں میں سے پھوٹتی تھی اور وہ ہر بار جب سانس لیتی تھی تو اسے کھینچ کر لیتی تھی..

"صرف ایک کے سوا... تم سب سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش لڑکی ہو" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا..

"اور وہ ایک کون ہے؟" اس نے باقاعدہ برا منا لیا "کون ہے؟"

"میں ابھی اس سے نہیں ملا.." اس نے پھر ہنس کر کہا..

"میں جیت گئی.. میں جیت گئی.." اس نے خاور کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے کر دسمبر

کی دھوپ میں بلند کر دیا اور بچوں کی طرح نعرے لگانے لگی۔

پھر اخباروں میں اس کی بیماری کی خبریں تواتر سے آنے لگیں..

کامپلیکس کے ہسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں.. ایک عام سے کمرے میں جس میں فینائل کی تیز بو تھی اور جس کی کھڑکی کے باہر کوڑے کے ڈرم تھے جن میں غلیظ پٹیاں اور مریضوں کے اندر سے برآمد ہونے والی رسولیاں اور آپریشن کے ذریعے بدن سے الگ کر دیے جانے والے بدن کے کچھ حصے تھے اور ان پر ہمہ وقت دو تین موٹی موٹی بلیاں اپنی شکم پری کے بعد پنجوں سے مونچھیں سنوارتی تھیں اور کبھی کبھار کھڑکی کے اندر اس بستر کی جانب آنکھیں کرتی تھیں جس پر طاہرہ لیٹی تھی.. اگرچہ اس کا چہرہ بے روح ہو جانے کے باوجود وہی تھا لیکن اس کا بدن نہ تھا.. اس کا پیٹ بے طرح پھولا ہوا تھا اور اس پر چادر کھسکتی تھی اور وہ اپنے پاؤں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی.. اس کی آنکھوں اور پاؤں کے درمیان ایک گنبد ابھرا ہوا تھا جو کبھی اس کا ستواں پیٹ ہوا کرتا تھا.. اور اس کی آنکھیں بار بار ناتوانی سے بند ہوتی تھیں... بستر کی پائنتی کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک مستطیل میز تھی جس پر پھولوں کے درجنوں گلدستے دھرے تھے لیکن وہ انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی کہ اس کا پھولا ہوا پیٹ حائل ہوتا تھا..

سرہانے کے ساتھ ایک تپائی پر اپنے عہد کی ایک پرکشش اور مخبوط الحواس اور اپنے آپ میں کھو کر اداکاری کرنے والی ٹیلی ویژن کی اداکارہ... سکینہ بانو اس کا ہاتھ تھامے ہوئے نہایت رنجیدہ اور مغموم حالت میں از حد پریشان کہہ رہی تھی "طاہرہ.. تم اچھی ہو جاؤ گی.. میں نے ابھی ڈاکٹروں سے بات کی ہے.. وہ کہتے ہیں کینسر لاعلاج مرض نہیں رہا.. وہ تمہاری اداکاری کے شیدائی ہیں' تمہیں مرنے نہیں دیں گے.. تم اچھی ہو جاؤ گی اور پھر.. ہم دونوں ایک زبردست ڈرامے میں کام کریں گی.."

کمرے کا دروازہ کھلا...

برآمدے میں بیٹھا بوڑھا وارڈ بوائے طاہرہ بی بی کے کمرے میں ہر کسی کو آنے نہیں دیتا تھا..

اس لیے جو بھی آتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا جسے دیکھ کر وارڈ بوائے پہچان جاتا تھا اور متاثر ہو جاتا تھا اور کھڑے ہو کر دروازہ کھولتا تھا..

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ہی بہت ہی فکر مند اور گھبرائی ہوئی اور بیٹھی ہوئی آواز والی قدرے عمر رسیدہ اداکارہ نجمہ گیلانی داخل ہوئی اور روتی ہوئی طاہرہ کا دوسرا ہاتھ تھام کر ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "جان تم فکر نہ کرو.. میں نے ابھی میڈیکل سپر نٹنڈنٹ سے بات کی ہے.. تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے جان.. حوصلہ کرو.. تم تندرست ہو جاؤ گی اور پھر ہم دونوں.." اس کی نگاہ کھڑکی کے قریب کرسی پر سر جھکائے خاور تک گئی "اور پھر ہم دونوں خاور صاحب کے لکھے ہوئے ڈرامے میں کام کریں گی.. تم اچھی ہو جاؤ گی.."

طاہرہ کا دوسرا ہاتھ تھامے ہوئے سکینہ بانو نے یہ سنا تو اس کا پارہ یکدم چڑھ گیا "تم کس کھاتے میں ہو.... پروڈیوسروں کی چاپلوسیاں کرکے اور ان کے ہاتھ چوم چوم کر تو تم کاسٹ ہوتی ہو... میں تمہیں نہیں جانتی.. طاہرہ کے ساتھ میں کام کروں گی.."

نجمہ گیلانی ٹھنڈے مزاج کی اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والی عورت تھی اس نے آواز بلند نہیں کی.. طاہرہ کا ہاتھ تھامے رکھا اور کہا "بانو میرا منہ نہ کھلواؤ.. تمہارے فلیٹ میں جو آمد و رفت ہوتی ہے اس سے میں بخوبی واقف ہوں.. تم اتنی بھی مخبوط الحواس نہیں ہو جتنی بنتی ہو.."

بانو طاہرہ کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی "تمہارے پاس کچھ ہو تو تمہارے فلیٹ میں بھی آمد و رفت ہو.. طاہرہ کے ساتھ صرف میں کام کروں گی.. کیوں طاہرہ؟"

طاہرہ کسی اور کرّے کسی اور سیارے میں تھی.. اس کی آنکھیں بار بار بند ہوتی تھیں اور جب کھلتی تھیں تو اس کے سامنے اس کا پھولا ہوا پیٹ آتا تھا جس کے پار اس کے پاؤں تھے اور مستطیل میز پر سجے گلدستے تھے جن کے پھول اسے نظر نہ آتے تھے..

کھڑکی کے باہر کوڑے کے ڈرم پر بیٹھی ہوئی بلیاں کسی مریض کے پیٹ میں سے برآمد کردہ ایک لمبی آنت کو نہایت رغبت سے کھا رہی تھیں.. انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ وہ مریض جانبر ہوا ہے یا نہیں.. نجمہ نے طاہرہ کے رخساروں پر ایک تھپکی دی.. اس کے رخسار حنوط شدہ لگتے تھے "کیوں جان.. تم میرے ساتھ کام کرو گی ناں..."

اس کے بعد ایک عجیب تماشہ شروع ہو گیا.. بانو اور نجمہ باقاعدہ دست و گریباں ہونے کو آئیں اور خاور کو مجبوراً ان کے درمیان آنا پڑا... انہیں الگ کرنا پڑا..

اسے یاد تھا کہ اس لمحے طاہرہ کے باریک اور زرد ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ

آئی.. اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا..

کمرے سے باہر جاتے ہوئے بانو اور نجمہ کی طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا اور انہوں نے باہر کھڑے گدھ اخبار نویسوں کے سامنے آبدیدہ ہو کر کہا... یہ ایک ذاتی المیہ ہے.. لیکن آپ لوگ اگر رپورٹ کرنا چاہتے ہیں تو کر دیں.. کہ ہم طاہرہ کی بیمار پرسی کرنے کے لیے آئی تھیں.. اور ہمیں بہت دکھ ہے.. بہت ہی رنج ہے کہ وہ مر رہی ہے.. ہم تصویر نہیں اتروائیں گی.."

طاہرہ اگلے روز مر گئی..

آج اس کے جنازے پر ایک عجیب انکشاف ہوا.. پچھلے وقتوں کی جو تصویریں ان دنوں اخباروں کے خصوصی ایڈیشن میں شائع ہوتی تھیں کہ فلاں صاحب.. اور فلاں سیاسی شخصیت.. اور فلاں تحریک کے نامور کارکن... فلاں کی تدفین کے موقع پر سوگوار کھڑے ہیں تو ان تصویروں کا ماخذ کیا ہوتا تھا..

طاہرہ کے جنازے پر بیشتر جانے پہچانے لوگ جو چارپائی کو کندھا دیتے تھے آنکھیں کھلی رکھتے تھے اور دھیان میں رہتے تھے کہ پریس فوٹوگرافر کس جانب کیمرے سیدھے کرتے ہیں اور پھر اس جانب ایک سوگوار شکل کے ساتھ کندھا دیتے تھے۔

جب اسے گئی رات دفن کیا جا رہا تھا تو تمام اہم لوگ.. اداکار.. ادیب.. سیاستدان اور دیگر معززین... قبر کے اس کنارے پر کھڑے تھے جس کے مقابل میں پریس فوٹوگرافر اپنے کیمرے درست کرتے تھے اور جب طاہرہ کی چارپائی کو اس کے جسد سے جدا کر کے اسے قبر کے ڈھیر پر رکھا گیا اور اس کی لاش کو نیچے اتارا جانے لگا تو کیمرہ مین ایک بہتر زاویے کے لیے یکدم اس کنارے سے دوسری جانب چلے گئے تو سوگواروں میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی اور وہ فوراً ادھر جا کھڑے ہوئے جہاں سے تصویر اتر سکتی تھی۔

خاور کے بوٹوں پر قبرستان کی دھول کی باریک تہہ تھی..

وہ اپنے تھکے ہوئے پاؤں بوٹوں میں سے نکال رہا تھا..

اپنی پوروں پر جمے ذروں میں پنہاں ہو گئی صورتوں کو دیکھ رہا تھا.. اور ان بلیوں کی یادداشت اس کے ذہن سے غراتی دانت کچکچاتی محو نہ ہوتی تھی جو طاہرہ کے کمرے کی کھڑکی سے باہر کوڑے کے ڈرم پر بیٹھی شاید ایک آنت کو اور شاید ایک منقطع زندگی کے لوتھڑے کو

آپس میں جھنجوڑ رہی تھیں جب گھر کے سناٹے میں یکدم ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی....

چونگا اٹھانے سے پیشتر اس نے جلدی سے اپنی دھول بھری پوروں کو صوفے کے کپڑے پر رگڑ کر صاف کیا اور پھر نہایت بے دلی سے اسے اٹھایا اور صرف "جی.." کہا..

"خاور؟"

"جی میں بول رہا ہوں.."

جواب میں کچھ نہ آیا.. لیکن جو کوئی بھی تھا اس کا منہ رسیور کے بہت قریب تھا.. ایک مدھم سانس کی موجودگی سنائی دیتی تھی اور اس کے پس منظر میں ایک پھڑ پھڑاہٹ..

"کون ہے؟"

اسے واضح طور پر پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ ایک غٹرغوں قسم کی آواز بھی اگرچہ بہت مدھم مگر سنائی دی..

"کون ہے؟" اس نے پھر پوچھا اور چونگا کریڈل پر رکھنے کو تھا کہ ادھر سے ایک اور تھکاوٹ بھری آواز آئی "تم کیسے ہو؟" جیسے صدیوں سے جان پہچان ہو ایسے کہ تم کیسے ہو....

"میں ٹھیک ہوں جی.. لیکن آپ کون بول رہی ہیں؟"

"مجھے آپ نہ کہو.. تم کہو.."

"لیکن آپ کون بول رہی ہیں؟"

"پاگل خانہ..." آواز میں خوشی اور یقیناً ایک کبوتر کی غٹر غوں تھی۔

"اگر آپ یہ نہیں بتائیں گی کہ آپ کون ہیں... اپنا تعارف نہیں کروائیں گی تو میں فون بند کر دوں گا.."

"تو میں دوبارہ کر لوں گی.. ابھی اور اسی وقت... سہ بارہ کر لوں گی... سو بار کر لوں گی یہاں تک کہ تم فون بند کرتے کرتے تنگ آجاؤ.. اس لیے فون بند نہ کرنا.. تم کیسے ہو؟"

"میں.. بہت تھکا ہوا ہوں.. آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں.. میں فون کو ڈس کونیکٹ بھی کر سکتا ہوں.."

اسے اس نوعیت کے فون آتے رہتے تھے..

میڈیا کا طلسم ایسا تھا جو راکھ کو بھی الاؤ کی شکل دے کر لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ اس فریب کا شکار ہو کر اسی قسم کے فون کرتے تھے..

"آج میرے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی تھی.. وہ دونوں اپنے کمرے میں ہیں اور گاڈ نوز کہ کیا کر رہے ہیں.. مجھے ان تین گرہوں نے اب تک باندھ رکھا تھا.. آج آخری گرہ بھی کھل گئی ہے... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں... بتاؤ کب؟"

خاور نے فون رکھ دیا.. اگرچہ اسے اس نوعیت کے فون آتے رہتے تھے... لیکن وہ اس نوعیت کا شخص نہ تھا.. اس کی پوری زندگی میں اس کی بیوی واحد عورت تھی۔ اگرچہ وہ دونوں الگ خصلتوں کے مالک تھے' جدا طبع رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں ایک باہمی قرار تھا جس کی بنیاد پر ان کی زندگی میں کسی حد تک روانی تھی.. وہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت تو نہ کر سکے اور شاید وہ دونوں ہی محبت کے مفہوم سے ناآشنا تھے لیکن ایک دوسرے کی موجودگی میں وہ ایک پرسکون ٹھہراؤ محسوس کرتے اور زندگی گزرتی جاتی۔ دس برس پیشتر جب اچانک اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی تھی اور وہ لمحوں میں مردہ ہو گئی تھی تو اس کے بعد اس نے آج تک کسی اور عورت کی رفاقت کے بارے میں سوچا تک نہ تھا.. اس کے آس پاس نہ ہونے سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے پُر کرنے کا کبھی نہ اس کو خیال آیا تھا اور نہ ہی ضرورت محسوس ہوئی تھی..

فون کی گھنٹی فوراً ہی دوبارہ بجنے لگی تھی اور اس میں ایک دھمکی آمیز تسلسل تھا جو منقطع ہونے کا ارادہ نہ رکھتا تھا..

"میں نے کہا تھا ناں کہ میں دوبارہ فون کر لوں گی... سہ بارہ... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

وہ کوئی نفسیاتی مریضہ بھی ہو سکتی تھی.. جوان بیوہ' کوئی ٹین ایج یکدم میچور ہو جانے والی لڑکی' امریکہ وغیرہ میں سیٹل کسی شخص کی تنہائی کی ماری ہوئی بیوی.. یا کوئی مشہور شاعروں' ادیبوں' اداکاروں یا مصوروں کی "ٹرافیاں" جمع کرنے کی شوقین عورت..

اسی نوعیت کے فون آتے تھے..

"آر یو دیئر؟"

"جی..."

"تو پھر؟"

"آپ.. مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"

"کیوں' کے لیے تو بہت زمانے طے کرنے ہوں گے.." وہ بہت احتیاط سے ہنسی اور اسی احتیاط کی پیروی میں پس منظر میں ایک ہلکی پھڑ پھڑاہٹ ہوئی "جب میں کالج میں تھی.. ایم اے انگلش لٹریچر کے آخری سال میں تھی.. جب میں نے تمہاری پہلی کتاب پڑھی تھی.. جب میں نے پہلی بار تمہیں ٹیلی ویژن کے ایک ادبی پروگرام میں دیکھا تھا.. تب سے.. اور پھر میں منتظر رہی کہ کب آخری گرہ مجھے آزاد کرے اور میں تمہیں یہ فون کروں.. بس اسی پروسس کی وجہ سے چوبیس پچیس برس دیر ہو گئی.." وہ قطعی طور پر کوئی جذباتی خاتون نہیں تھی' نفسیاتی مریضہ ایسے اطمینان سے بات نہیں کرتی تو پھر وہ کس کیٹیگری میں آتی تھی..

"دیکھیے میں.. میں شکر گزار ہوں لیکن.. شاید یہ ممکن نہ ہو.. میں قدرے مصروف رہتا ہوں اور... جب تک.. آپ یہ نہ بتائیں کہ آپ مجھے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں اور کیا بات کرنا چاہتی ہیں.. تو..."

"تم ملاقات کا ایجنڈا جاننا چاہتے ہو؟" وہ پھر احتیاط سے ہنسی "ایک ہی ایجنڈا ہے... محبت... کیا یہ کافی نہیں.. اگر تم انکار کرو گے تو کل صبح ساڑھے نو بجے تمہاری ڈور بیل بجے گی.. بارہ کہو کے علاقے میں سملی ڈیم کو جانے والی سڑک پر جو گہرے سبز رنگ کا گیٹ ہے اس کی بیل پر میری انگلی تب تک دبی رہے گی جب تک وہ کھلے گا نہیں اور اگر تم کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے مجھے دیکھ کر باہر نہیں آؤ گے تو میں وہاں تب تک کھڑی رہوں گی جب تک تم باہر نہ آ جاؤ..." یہ آثار کسی ذہنی مریضہ کے ہو سکتے تھے..

"میں انکار کر دوں تو بھی..."

"تو بھی.. تم اپنا ٹیلی فون تو صرف میرے لیے ڈس کونیکٹ نہیں کروا سکتے.. ڈور بیل تو نہیں اتروا سکتے.."

"کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"نیچرلی... اس کے بغیر میں تین بیٹے کیسے پروڈیوس کر سکتی تھی..."

بیزاری اور تھکن کی جگہ ایک تجسس نے اسے گرفت میں لے لیا.. کیا اس قسم کے کردار حقیقی زندگی میں ممکن ہیں.. "تو اس صورت میں آپ مجھے کیسے مل سکتی ہیں؟.."

"میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ آخری گرہ کھل چکی ہے.. میرے ہاتھ جو خاوند اور

اولاد کے شکنجوں میں کسے ہوئے تھے آزاد ہیں.. پلیز آپ مجھ سے مل لو... کتنے بجے؟"

"کل صبح دس بجے.. اگر مناسب ہو تو..."

"کہاں؟"

"اگر آپ مری روڈ کی اس کراسنگ پر آجائیں جہاں سے بارہ کہو کے لیے سڑک نکلتی ہے تو..."

"میں آ جاؤں گی.. اور اگر تم نہ آئے تو اسی سڑک پر جو سرخ کھپریل والا گھر ہے اس کے گہرے سبز رنگ کے گیٹ پر جو اسی رنگ کی کال بیل ہے اس پر ساڑھے دس بجے..."

"لیکن میں آپ کو کیسے پہچان سکوں گا؟"

"میں تمہیں پہچانتی ہوں.. ایک مدت سے پہچانتی ہوں.. سویٹ ڈریمز.." فون بند ہو گیا۔

پٹونیا کے تیسرے گملے پر بیٹھے سرمئی کبوتر نے بہت دیر سے غٹر غوں نہیں کی تھی.. شاید وہ اس کی طویل گفتگو سے بور ہو کر اونگھ گیا تھا..

بیڈ روم میں واپس آ کر اس نے اپنے حصے کے بستر میں لیٹ کر چھت کے اس حصے کو ایک نظر دیکھا جس پر پینٹ کا آخری کوٹ نہیں ہوا تھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کر دیا.. اس کے ساتھ ہی مرزا صاحب کے ہاتھ نے اس کے بدن کو ٹٹولا "ادھر آ جاؤ..."

"نہیں..."

"کیا مطلب ہے 'نہیں!'".. وہ انکار کے عادی نہیں تھے۔

"آج کے بعد اس ڈبل بیڈ کے درمیان میں ایک دیوار ہے جسے تم پار نہیں کر سکتے" اس نے مرزا صاحب کے ہاتھ کو سمیٹا اور جھٹک دیا اور پھر کروٹ بدل کر فوراً ہی گہری نیند میں چلی گئی..

مرزا صاحب کی آنکھیں حیرت اور غصے میں کھلی تھیں..

ہم سب کے اندر ایک ایسا وجود ہے جو ہمیشہ برقرار رہتا ہے.. اس پر موسموں کے تغیر کا... مہ و سال کے گزرنے کا' وقت کی کسی لہر کا... قدرتی تنزل کا.. کسی ٹوٹ پھوٹ کا کچھ اثر نہیں ہوتا.. آپ اس کی برقراری سے بحث نہیں کر سکتے' اسے قائل نہیں کر سکتے کہ کسی بھی شے کو دوام نہیں.. کیونکہ آپ خود بھی تو اس یقین کے اسیر ہوتے ہیں کہ نہیں میں وہی ہوں جو کہ میں تھا اور وہ نہیں جو کہ میں ہوں... اسی لیے اس وجود میں کوئی دراڑ نہیں پڑتی یہ قائم و دائم رہتا ہے' سالم رہتا ہے.. اس وجود کی گردن کا ماس ادھیڑ عمری کے باعث مردہ جھریوں میں سمٹ کر کریہہ المنظر نہیں ہو جاتا.. یہ راتوں کو بار بار باتھ روم جانے کے لیے بستر سے نہیں اٹھتا اور ہر بار واپس آکر اسے اپنا سانس درست نہیں کرنا پڑتا.. سردیوں کے پچھلے پہروں میں یہ ایک نامعلوم بخار زدہ کیفیت میں مبتلا ہو کر سست' بیزار اور بے مقصد محسوس نہیں کرتا.. اس کا بلڈ پریشر نارمل رہتا ہے' شریانوں میں کوئی اٹک نہیں ہوتی اور اس کے دانت خزاں رسیدہ ہو کر جھڑنے کو نہیں ہوتے.. وہ سخت خوراک کھانے سے مکئی کے بھنے ہوئے سخت دانے چبانے سے اور غسل خانے میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی یا کوئی بڑا گملا اٹھانے سے پرہیز نہیں کرتا.. وہ دوائیوں اور خصوصی خوراکوں سے آگاہ نہیں ہوتا..

آپ کے اپنے وجود کے اندر یہ برقرار اور دائم وجود آپ کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے.. ایک دھند بھری سرد کہکیلی سویر میں کسی پارک کی ٹھٹھری ہوئی گھاس پر پڑتی سورج کی بے حدت زرد شعاعوں سے جب کہرے کے ذرّے ہیرے کی کنی میں بدل کر چمکتے ہیں تو یہ وجود ایک کروٹ لیتا ہے.. کسی سناٹے میں لے جانے والی پرکشش عورت کو دیکھ کر.. ایک فاسٹ باؤلر کو میچ کا بیسواں اوور اسی شدت اور قوت سے کرواتے ہوئے دیکھ کر

جیسے وہ اس کا پہلا اوور ہو.. یہ وجود کہتا ہے کہ یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں.. اور ایک جمناسٹ کو بازو پر ہاتھوں کے سہارے فضا میں تادیر معلق دیکھ کر.. اس کا یونانی دیوتاؤں ایسا مجسمہ بدن دیکھ کر... کہ یہ تو مشکل نہیں.. چنانچہ وہ برقرار وجود آپ کے موجود وجود کو یکسر بھلا دیتا ہے لیکن آپ ہمہ وقت آگاہ رہتے ہیں کہ یہ فریب ہے.. ہیرے کی کنی.. پرکشش عورت.. فاسٹ باؤلر اور جمناسٹ بہت پیچھے رہ گئے ہیں.. اگرچہ یہ فریب ہے پھر بھی شک باقی رہتا ہے اس لیے کہ برقرار وجود ہار نہیں مانتا...

یہ برقرار وجود خاور کو بھی بہت اذیت دیتا تھا..

وہ سر جھکا کر' شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈال دینے کے لیے میز پر بیٹھنا چاہتا تھا اور وہ اسے بیٹھنے نہیں دیتا تھا.. وہ اسے عمر کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرنے دیتا تھا.. اور وہ کرنا چاہتا تھا۔

چوبیس گھنٹوں میں صرف وہ ایک لمحہ ہوتا تھا جب یہ برقرار وجود ایک دھچکے سے پیچھے ہٹ جاتا تھا.. جب وہ صبح کی سیر سے واپسی پر شیو بنانے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا تھا.. سوجی ہوئی بے روح آنکھیں اور ان کے گرد کوے کے پنجوں ایسی بے جان جھریاں' گال وہاں وہاں سے پچکے ہوئے جہاں سے اس کی داڑھیں نکل چکی تھیں.. چوڑے ماتھے کی شکنوں سے بھی بٹتے ہوئے باریک ہوتے الگ الگ نظر آتے ہیئر کلر کی بے قاعدگی کے سبب بدرنگ ہوتے بال... ایسے کہ ان کے چھدرے پن میں سے سر کا ماس جگہ جگہ سے نمایاں ہوتا ہو.. اور چہرے کی جلد کو چٹکی میں بھر کر چھوڑنے سے وہ اپنی اصلی حالت کو نہیں لوٹتی تھی.. تادیر وہیں اسی مقام پر پڑی رہتی تھی..

وہ جونہی آئینے سے ہٹتا تھا تو برقرار وجود پھر سے اس پر حاوی ہونے لگتا تھا..

اسے ٹیلی ویژن پر نمودار ہونے کے لیے اب قدرے گھنے میک اپ کی ضرورت پیش آتی تھی۔ لائٹ میک اپ میں اس کے چہرے کی جھریاں نمایاں ہو کر اس کی عمر کے ہر برس کی منادی کرتی تھیں.. اس صبح ناشتے کی میز پر وہ ابھی تک اپنے اصل اور زوال پذیر وجود کے شک میں تھا کیونکہ وہ چند لمحے پیشتر باتھ روم میں اس کے مقابل تھا..

شب بھر کی تسلی کے باوجود بشیر کو اپنی دوسری دلہن کے پاس لوٹنے کی بے چینی ہوتی تھی اس لیے وہ پورے آٹھ بجے ناشتہ لگا کر اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔

ٹوسٹ ٹھنڈے ہو چکے تھے اور ان پر چھری سے بچھایا جانے والا زرد مکھن بھی منجمد حالت میں تھا' پگھلا نہ تھا.. میدے کے ٹوسٹ چبانے میں اسے دقت ہوتی تھی.. وہ ابھی کورن فلیکس اور دلیے کی نرمی کو اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا.. آنے والے دنوں میں انہی کی نرمی بچے کھچے دانتوں کے لیے قابل قبول ہوتی تھی تو جتنے روز وہ ڈبل روٹی کی چکیلی سختی کو برداشت کر سکتا تھا کیوں نہ کرے.. بڑھاپے کی مرغوبیت پر ڈاکٹر طاہر نے عینک اتار کر بار بار سر ہلایا تھا' اتنی چکنائی اس عمر میں تو خودکشی ہے سر....

البتہ پرانی وضع کی ٹی کوزی میں ڈھکی کافی ابھی تک گرم دھواں دیتی تھی..

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اخبار اٹھائے اپنے مختصر لان میں آ گیا.. اور ہر صبح کی طرح آج بھی اس کا جی خوش ہو گیا.. اس منظر کو ہر صبح دیکھنے کے باوجود وہ ہمیشہ ٹھٹک جاتا تھا. بارہ کہو کی سرسبز پہاڑیاں لان کی دیوار پر سے جھانکتے اس کے گھر کے اندر چلی آتی تھیں..

سرخ رنگ کی کیمپنگ چیئر پر بیٹھ کر اس نے اپنے دن کا پہلا سگریٹ سلگایا اور اس کے آخری کش نے اسے بے دم کر دیا.. تمباکو کا اصل نچوڑ ہر کش کے ساتھ فلٹر کی قربت میں جمع ہوتا رہتا ہے اور جونہی سلگاہٹ اس تک پہنچتی ہے تو وہ اپنی گھنی مہک کا سحر پھیپھڑوں میں بھر دیتا ہے.. کینسر آر نو کینسر وہ ایک کش زندگی کو مسحور کر دیتا ہے..

اس نے یہ مکان تعمیر کر کے جوا کھیلا تھا..

تب تک اسے علم نہ تھا کہ عقابوں اور سرخابوں کی موجودگی میں ایک چڑیا کا گھونسلا بھی محفوظ رہ سکتا ہے..

وہ اسلام آباد میں اپنے کرائے کے دو کمروں کے فلیٹ کی قید میں سے نکل کر ایک مرتبہ چند بااثر دوستوں کے ہمراہ سملی ڈیم گیا تھا جس کے پانیوں میں لنگر انداز ایک بیکار اور زنگ آلود موٹر بوٹ میں کراچی سے آئے ہوئے کسی بیزار اور سٹاک ایکسچینج میں بہت بلند مرتبے پر فائز بزنس مین کے اعزاز میں ایک پارٹی تھی.. جانے یہ کس کے مفاد میں تھی اور کس نے اس کا بندوبست کیا تھا.. یہاں آفیشل ڈرنک صرف واڈکا اور جن تھی جن کی سفید رنگت ان کے شراب ہونے پر پردہ ڈالتی تھی اور ڈیم کی سیر کو آنے والے خاندان اور معززین اگر ان کی جانب دیکھتے تھے تو یہی سمجھتے تھے کہ بوٹ کے عرشے پر جو معززین لاپروائی سے کھڑے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں پانی کے گلاس ہیں تو یہ صرف سوکھتی ہوئی

جھیل کے نظارے میں محو ہیں.. دیسی خوراک کے رسیا مہمانوں کے لیے چکن تکا اور کڑاہی گوشت کا بندوبست تھا اور بین الاقوامی ذائقے سے آشنا اس قسم کی پارٹیوں کے عادی لوگوں کے لیے کراچی سے کنگ پران اور مختلف قسم کی مچھلیاں اور لابسٹر منگوائے گئے تھے جنہیں گرل کیا جا رہا تھا.. اس پارٹی سے واپسی پر شام ہو رہی تھی جب اس نے راستے کے آس پاس ابھرتی سرسبز پہاڑیوں اور ان میں سے اترتے ندی نالوں کو اس نظر سے دیکھا کہ شہر سے پرے اور پھر بھی اس کی مناسب قربت میں ان کھلی فضاؤں میں جو ابھی تک ویران ہیں اگر ایک گھر بنایا جائے تو کیسا رہے.. اور جب اس نے اس علاقے میں چار کنال کا رقبہ نہایت معمولی قیمت پر خرید لیا تو دوستوں نے اس کی حماقت کی داد دی کہ یہاں تو پابندی ہے مکان تو بننے کا نہیں تو اس پتھریلی اور بے آباد زمین پر تو مرغی خانہ بھی نہیں بن سکتا اس کا کیا کرو گے.. لیکن دوست نہیں جانتے تھے کہ سرخاب اور عقاب یہاں بسیرا کرنے کے لیے آئیں گے اور اس چڑیا کا گھونسلا بھی تعمیر ہو جائے گا..

اگرچہ یہاں تعمیر شدہ تمام گھروں کو غیر قانونی قرار دے کر ادھر بلڈوزر بھی آتے رہتے تھے.. چند جھگیوں کو مسمار کر کے بااثر سیاست دانوں اور ایٹمی سائنس دانوں کے بنگلوں سے چشم پوشی کر کے واپس چلے جاتے تھے پھر بھی دھڑکا لگا رہتا تھا... اگر کوئی پانسہ پلٹ گیا اور بلڈوزر سنجیدہ ہو گئے تو پھر کیا ہو گا.. دھڑکا لگا رہتا تھا..

یہ جوا ابھی تک چل رہا تھا.

وہ یہ جوا نہ کھیلتا تو ٹیلی ویژن اور ادب کی قلیل آمدنی سے ابھی تک جی ایٹ کے اس دو کمروں کے فلیٹ میں ہی بند ہوتا جس میں اس نے زندگی کے پچھلے بیس برس گزار دیئے تھے..

ہر برس اس کی کوئی ایک بیٹی بقیہ دو بہنوں سے مشورہ کر کے کہ اس سال کس کی باری ہے اپنے نہایت آزردہ اور پاکستان سے بیزار بچوں کو سنبھالتی اس کے پاس آ ٹھہرتی... بچوں کو کچوکے دے کر مجبور کرتی کہ وہ گرینڈ ڈیڈ کے گالوں پر پیار کریں اور اپنے فیوکنٹری کو انجائے کریں اور رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہمیشہ کہتی "ڈیڈی وہائی ڈونٹ یو گیٹ میریڈ اگین؟"

لیکن اسے کوئی چاہت نہ تھی..

وہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا..

وہ برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ زندگی کی اس سٹیج پر ایک سراسر غیر اور انجانا وجود اس کے روزمرہ کے معمولات میں خلل ڈالنے لگے اور اس کے بستر میں شریک ہو جائے.. اس کے ایک جاننے والے نے بالکل اسی قسم کے حالات میں اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ایک مڈل ایج بیوہ سے شادی کر لی تھی اور صرف دو ماہ بعد سلیپنگ پلز پھانک کر اسے پھر سے بیوہ کر گیا تھا..

وہ جہاں تھا.. جس لمحۂ موجود میں جیسا تھا' مطمئن تھا..

نہ ہی اسے محبت وغیرہ کا کوئی وسوسہ کوئی چاہت تھی.. اسے اس جذبے کا کچھ تجربہ بھی نہ تھا.. اگر اس کی کوئی حقیقت تھی تو... اگرچہ نوعمری میں اس کے بیشتر دوست اسی محبت میں مبتلا تھے لیکن ان میں سے تقریباً ہر ایک ذاتی کاوش اور محنت سے اس محبت میں مبتلا ہوا تھا.. یعنی ذرا آگے بڑھ کر.. ڈھیٹ بن کر.. عزت نفس تیاگ کر سیٹیاں مارتے لڑکیوں کے کالجوں کے گرد منڈلاتے اور متعدد آہ و زاری اور دکھی شعروں سے اٹے خط متعدد لڑکیوں کو لکھ کر.. وہ بھی یہ سب کچھ اگرچہ کرنا چاہتا تھا لیکن جھجکتا تھا اس لیے اس عظیم نعمت سے محروم رہا۔

تو وہ جہاں تھا' جیسا بھی تھا مطمئن تھا..

یکدم اسے پچھلی رات آنے والے اس فون کا خیال آیا جس کے دوسرے سرے پر جو بھی عورت تھی اس کی کیٹیگری کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا.. ذہنی مریضہ ہی ہو سکتی ہے.. اس سے ملنے میں کہیں کوئی رسک تو نہیں.. کسی سکینڈل کا پیش خیمہ نہ ہو.. اس نے خواہ مخواہ اسے وقت دے دیا تھا.. اگر میں اسے ملنے نہ جاؤں تو... لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ جانتی ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے.. تو پھر...

بارہ کہو سے مری روڈ میں شامل ہونے والی کراسنگ ویگنوں اور مقامی بسوں کے ہارنوں سے گونجتی تھی اور ٹریفک بے حد گھنی اور بے ترتیب تھی.. اس نے اپنی کار ایک چائے خانے کے قریب پارک کی جس کے مالک کو وہ جانتا تھا اور پھر باہر کھڑا ہو کر اسلام آباد سے آنے والی کاروں کو ایک احساس جرم کے ساتھ دیکھنے لگا کہ ان میں سے کوئی ایک کار اس کی

ہو سکتی تھی.. وہ آنے کو آ تو گیا تھا لیکن اب نروس ہو رہا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ پچھلی شب جس کسی نے بھی فون کیا تھا محض دل لگی کے لیے کیا تھا.. اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف پانچ منٹ انتظار کرے گا محض فرض کی ادائیگی کی خاطر اور پھر چلا جائے گا..

سردیوں کی آمد کے باوجود مری کا رخ کرنے والی ٹریفک میں کمی نہیں آئی تھی.... رینج روورز' پجاروز' ہونڈاز اور ٹویوٹاز اور لاتعداد سوزوکیاں اور بے شمار موٹر سائیکل.. دیوانگی کی حالت میں شرلائے بھرتے تیز رفتاری سے اس کے سامنے سے گزرتے جاتے تھے.. زیورات سے لدی پھندی عورتیں' گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کی امارت کے بھڑکیلے مظاہرے' مڈل کلاسیئے.. بچوں کے ڈھیر.. لپکتے چلے جا رہے تھے.. گرمیوں میں ان کے لیے مری کی ٹھنڈک کی وارفتگی تو کسی حد تک سمجھ میں آتی تھی.. لیکن ان دنوں جب ہوا میں ایک منجمد ٹھہراؤ تھا یہ وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں.. شاید یہ دولت کی فراوانی تھی یا ایک اجتماعی گھبراہٹ تھی جو فرار چاہتی تھی۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے اسلام آباد کی جانب سے آنے والے ٹریفک کے ہجوم میں سے ایک گرے رنگ کی چھوٹی سوزوکی اٹلی کیٹر جھپکاتی الگ ہوئی اور آہستہ ہوتی ہوئی اس کے قدموں میں آ رکی۔

کھڑکی کا شیشہ اترتا ہوا نیچے آیا کیونکہ وہ فلی لوڈڈ نہیں تھی "ہیلو..."

"جی..." وہ یکدم دیکھ نہیں سکا کہ اندر کون ہے۔

"جی کیا.. اپنی کار کو لاک کرو اور میرے ساتھ بیٹھ جاؤ"... سکول کے بچے کو جیسے استانی ڈانٹتی ہے..

اس نے مڑ کر چائے خانے کی جانب دیکھا.. اس کا مالک گاہکوں کو بھگتانے میں مصروف تھا اور اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا.. اس نے اپنی کار کو لاک کیا اور گرے سوزوکی کے وا ہو چکے دروازے میں سے جھک کر نہایت فرمانبرداری سے اس کے برابر میں بیٹھ گیا..

"دروازہ تو بند کر دو.."

"سوری..." اس نے دروازے کو اپنی جانب دھکیل کر بند کر دیا۔

کار کا اندرون مختصر تھا اور اس میں کسی خوشگوار ایئر فرشنر کی مہک کو ابھی چند لمحے پیشتر آزاد کیا گیا تھا.. یہ مہک تمباکو کی خوشبو میں گھل کر بدن میں ایک عجیب سی سستی بھرتی

تھی.. ایک مخصوص پرائیویسی کا احساس ہوتا تھا.. ٹریفک گزر رہی تھی' لوگ باتیں کر رہے تھے' ہارن بج رہے تھے لیکن وہ خاموش تصویریں تھے ان کی آوازیں باہر رہ گئی تھیں..

سوزوکی کی چابی کو گھمانے کے لیے جو ہاتھ اس پر آیا اس کی انگلیوں میں سفید چاندی کی ہمہ وقت پہنی ہوئی چھوٹے چھوٹے ہیروں سے مزین انگوٹھیاں تھیں اور کلائی میں دو بریسلٹ تھے.. کلائی کی رگیں ابھری ہوئی اور نیلی تھیں لیکن رنگت سفید تھی..

"تم میری طرف دیکھو گے نہیں؟"

"جی..."

"جی کیا.. ڈیم اٹ میں تم سے ملنے آئی ہوں.. اور یونہی سرسری طور پر نہیں.. من کی موج میں میں نے آج دس بجے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ تم سے ملا جائے.. پچیس برس کی منصوبہ بندی کے بعد آئی ہوں.. اور تم... کھڑکی سے باہر دیکھ رہے ہو.." آواز میں ایک مسلسل لرزش تھی.. لہجے میں ایک تہذیبی رچاؤ تھا جو مناسب خاندانی پس منظر اور بہت ہی مناسب پرورش کے بعد ہی عادت کا ایک حصہ بنتا ہے.. "کدھر چلیں؟"

"وہ... مجھے نہیں معلوم.."

"ہم یہیں کھڑے تو نہیں رہ سکتے.. چائے خانے کا مالک جو تمہارا واقف ہے اور جس سے تم اکثر ڈبل روٹی اور کشمش والے بن خریدتے ہو وہ ہمیں دیکھ لے گا اور تم یہ نہیں چاہتے..."

"نہیں..." اس نے یکدم چونک کر کہا.. اور اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کس صورت حال میں ہے.. "جدھر آپ کا جی چاہے.."

"میرا جی تو تمہیں کچا کھا جانے کو چاہتا ہے.."

"میں بہت مزیدار نہیں ہوں گا کچی حالت میں..." اس کے اندر ایک بیزاری نے اس بے سبب ملاقات کے خلاف ایک احتجاج نے سر اٹھایا اور پھر اس نے پہلو بدل کر ڈرائیور کو دیکھا..

اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور انہی پر اس کی پہلی نگاہ گئی.. وہ رو رہی تھی.. اور روتی چلی جا رہی تھی لیکن بغیر کسی کاوش کے جیسے یہ روزمرہ کا ایک قدرتی عمل ہو جو جاری رہتا ہے.. وہ آنکھیں جھپکتی اور ان آنکھوں میں مسرت کے دیئے سے جلتے تھے.. تو آنسو اپنا

انفرادی وجود کھو کر ایک دھار میں بدل جاتے.. اور وہ زیادہ دیر خالی نہ رہتیں دیکھتے دیکھتے پھر سے بھر جاتیں.. یہ آنکھیں تہہ دار اور غلافی تھیں اور جب کبھی خالی ہوتیں تو ان کا نیم سنہری پن عیاں ہونے لگتا.. سٹیئرنگ پر جمی انگلیاں کانپ رہی تھیں اور ان کی لرزش کلائی کے بریسلٹس پر اثرانداز ہوتی تھی..... وہ بہر طور مڈل ایجڈ تھی' ڈھیلے 'خزاں رسیدہ پتوں کے ڈیزائن کے بھورے ریشمی شلوار قمیض میں ملبوس تھی..... اس لیے اس کے بدن کے نشیب و فراز کا کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا.. وہ یقیناً ایک ایسی عورت تھی جسے کسی سٹور میں داخل ہو کر سیلزمین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس سے مخاطب نہیں ہونا پڑتا تھا.. کسی پارٹی میں صوفے پر براجمان وہ کوئی ایک عورت نہیں ہو سکتی تھی.. وہ ہجوم میں گم نہیں ہو سکتی تھی... وہ کوئی یکدم دیکھنے والے کو اپنے حسن سے سناٹے میں لے جانے والی عورت ہرگز نہ تھی لیکن اس کی موجودگی کو نظرانداز کر جانا ممکن نہ تھا.. اور اس کا سبب اس کی غلافی آنکھوں کی اداس کشش تھی' اس کے دیگر خدوخال نہ تھے..

سٹیئرنگ پر اس کی انگلیاں مسلسل کانپ رہی تھیں اور اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے..

"اِف یو ڈونٹ مائنڈ..." اس نے گلوکمپارٹمنٹ میں سے سگریٹوں کا ایک پیکٹ نکالا اور اس میں موجود کار کے کاغذات کو بہت اتھل پتھل کر کے تلاش کر کے نکالا... اور پھر ایک سگریٹ نکال کر لبوں میں دبا لیا.. اس کے لب بھی لرزش میں تھے.. اس نے کار لائٹر کی ناب کو دبایا اور لائٹر کی رگوں میں مناسب حدت پیدا ہونے سے پہلے ہی اسے کھینچ کر سگریٹ کے قریب لے گئی اور اسے سلگانے کی کوشش کرنے لگی.. سگریٹ کی پوری گولائی کے تمباکو کا ایک کنارہ بمشکل روشن ہوا "ایک لیڈی ڈسٹریس میں ہو تو تم اس کی مدد نہیں کر سکتے.." اس نے جھلا کر کہا..

"جی..."

"یہ تم نے کیا جی جی لگا رکھی ہے.. سکول بوائے کی طرح.. سگریٹ جلانے میں میری مدد کرو.."

خاور سہم گیا اور فوراً کوٹ کی جیب میں سے اپنا لائٹر نکال کر اس کے نیم سلگتے سگریٹ کے نیچے معلق کر کے روشن کر دیا..

اس نے لائٹر کے شعلے کو سگریٹ سے چھونے کی بجائے آنکھیں جھپک کر اس کی جانب ایک گہری ہنستی اگرچہ آنسوؤں سے بھری نظر سے دیکھا "تھینک یو" اور دیکھتی رہی.. خاور کا انگوٹھا لائٹر کے لیور کو دبائے دکھنے لگا اور شعلے کی حدت اس کی پوروں کو جلانے لگی..

"آپ اپنا سگریٹ جلالیں.."

"میں اپنا سگریٹ جلالوں تو تم اپنا لائٹر بند کر کے جیب میں رکھ لو گے اور میری جانب یوں نہیں دیکھو گے... منہ پرے کر لو گے..."

خاور نے جھلا کر انگوٹھا اٹھایا اور لائٹر کو جیب میں رکھنے کو تھا کہ اس کا ہاتھ آگے آیا.. اس کا لمس بے حد ٹھنڈا اور یخ تھا جو ہاتھ اس کے اس ہاتھ پر آیا جو لائٹر کو جیب میں واپس رکھنے کو تھا.. "پلیز..."

سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے ایک طویل کش لیا "ہم یہیں تو کھڑے نہیں رہ سکتے.. کدھر چلیں... سملی ڈیم روڈ پر..."

"ہاں یہ مناسب رہے گا.. وہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور... میں دیکھا نہیں جانا چاہتا اور نہ ہی آپ مجھے یقین ہے ایکسپوز ہونا پسند کریں گی..."

"مجھے اس کے بعد "آپ" نہ کہنا.. تم.. کہو... سکول بوائے.."

گرے سوزو کی ذرا پیچھے ہٹی.. وہ کار کو بیک کرنے کے لیے پیچھے دیکھ رہی تھی اور اس کی گردن پر جھریاں ابھرتی تھیں.. اور وہ ونڈ سکرین میں سے دیکھ رہا تھا کہ چائے خانے کا مالک جواب گاہکوں سے فارغ ہو چکا تھا اسی گرے سوزوکی کو حیرت سے تک رہا تھا...

گرے سوزوکی مری روڈ کے کراسنگ سے الگ ہو کر بارہ کہو کی آبادی کے درمیان حرکت کرنے لگی.. کار کے اندر ایئر فریشنر کی مہک پر تمباکو کی کڑواہٹ کا دھواں اثر کر رہا تھا.. وہ اپنے دونوں ہاتھ گود میں سمیٹے چپ بیٹھا رہا.. سٹیئرنگ پر جمے دائیں ہاتھ میں کچھ اطمینان تھا اور عمر سے ذرا سکڑتی انگلیوں میں وہائٹ سلور میں جڑے جو ہیرے تھے ان کی دمک میں ٹھہراؤ تھا لیکن بایاں ہاتھ جب کبھی سٹیئرنگ سے اٹھتا کہ اس میں سگریٹ سلگتا تھا کپکپا رہا ہوتا اور منہ تک لے جاتے ہوئے اسے تردد کرنا پڑتا.. اگرچہ وہ مڈل ایجڈ تھی لیکن یہ عمر لمحہ بھر کے لیے اس کے آس پاس آ کر ٹھٹک گئی تھی... عین کنارے پر تھی.. اور یکدم اپنا آپ ظاہر کر دینے کے آثار وہاں منتظر تھے.. کسی ایک اگلے ثانیے میں... سگریٹ کے اگلے کش

کے بعد وہ اس پر اتر سکتی تھی.. لیکن ابھی وہ اس کی قربت میں آ کر ٹھٹک گئی تھی..

وہ ابھی تک رو رہی تھی..

اس کی آنکھیں خشکی سے آشنا نہیں ہوتی تھیں..

جیسے کچھ لوگوں کی آنکھوں میں سے کسی جسمانی عارضے کے باعث مسلسل پانی بہتا رہتا ہے... ایسے وہ روتی تھی.. اور ابھی تک آنسو اپنا انفرادی وجود برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اور آنکھیں جھپکنے سے دھاروں میں بدل جاتے تھے.. اور اس کے باوجود اس کے نین نقش پر کوئی المیہ کوئی ٹریجڈی یا دکھ تحریر نہیں تھا جو گریہ کا سبب بنتے ہیں...

"آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

"آپ نہیں.. تم... سکول بوائے۔"

"تم.."

"اس لیے کہ میں خوش ہوں۔"

"میں خوشی کے ایسے اظہار سے آشنا نہیں۔"

"اس لیے کہ تم مجھ سے آشنا نہیں.." اس نے شرمندگی سے اور اپنی عزت نفس کو استوار کرنے کے لیے فوراً اپنے آنسو پونچھے.. "میں رونے والی عورت نہیں ہوں.. مجھے اپنے کسی قریبی عزیز کی حادثاتی موت پر بھی رونے میں بہت دشواری پیش آتی ہے.. میں چادر کو اپنے چہرے پر کھینچ کر سر جھکائے بیٹھی رہتی ہوں تاکہ میری خشک آنکھوں کو دیکھ کر میرے رشتے دار یہ نہ سمجھیں کہ مجھ پر اثر نہیں ہوا.. مجھے دکھ نہیں ہوا.. اگرچہ میں ان سے کہیں زیادہ دکھی ہوتی ہوں لیکن.. میں آسانی سے رو نہیں سکتی.. اگر اس لمحے میرے بیٹے مجھے دیکھ لیں تو کبھی یقین نہ کریں کہ یہ ان کی ماں ہے.."

"طاہرہ بھی بہت روتی تھی..."

"طاہرہ.." اس کی غلافی آنکھوں کے بھاری پپوٹے اس کی جانب اٹھے..

"کل رات جب آپ کا... تمہارا ٹیلی فون آیا تھا تو میں اسے دفن کر کے لوٹا تھا.. وہ بھی بہت روتی تھی..."

"ہاں.. طاہرہ بخاری.. مجھے بہت دکھ ہوا... آج کے اخبار میں اس کی تدفین کی تصویریں تھیں لیکن ان میں تم نظر نہیں آئے.. ہاں وہ روتی بہت تھی.. لیکن وہ ایک اداکارہ

تھی.. میں نہیں ہوں..''

''ہاؤ ڈو یو نو...''

''آئی ایم سوری...''

بارہ کہو کی آبادی کے خاتمے پر سڑک یکدم نیچے چلی گئی..اور گہرائی میں ایک چوڑے خشک اور پتھروں سے اٹے پاٹ کے بیچ میں بہتی ندی پر بندھا ایک تنگ پل سامنے آگیا..ٹریفک یک طرفہ تھا اور ابھی دوسری جانب سے آنے والوں کی بے چینی تھی اور وہ رک گئے..

اس نے سگریٹ کا ایک اور...اور آخری کش کھینچا اور کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے باہر پھینک دیا''ہم پل کے پار جائیں گے تو ذرا آگے جہاں سے چڑھائی کا آغاز ہوتا ہے دائیں ہاتھ پر تمہارا گھر ہے..سرخ کھپریل کی اطالوی طرز کی چھت والا... گہرے مونگیائی رنگ کا گیٹ اور تمہاری کال بیل جس کا بٹن نیلے رنگ کا ہے۔''

''آپ... تم یہ کیسے جانتی ہو..''

''اس لیے کہ پچھلے دس برس سے..جب سے تم نے یہاں شفٹ کیا ہے میں ہر ہفتے..سوموار کے روز..پچھلے پہر صرف اس گیٹ کو...اور اس پر لگی تمہارے نام کی تختی کو دیکھنے کے لیے آتی تھی..اس لیے..''

یہ عورت صرف ایک سادہ ذہنی مریضہ نہیں تھی..اس سے کہیں آگے کی کوئی شے تھی..کیا میں نے ایک دلچسپ اور عجیب شخصیت سے ملنے کے چاؤ میں ایک فاش حماقت تو نہیں کی...کی ہے تو اب پانی سر سے گزر چکا تھا..

بارہ کہو کی ندی کے تنگ پل پر سے دوسری جانب سے آنے والی ایک سوزوکی ویگن کھڑکھڑاتی ہوئی گزر گئی اور پل خالی ہو گیا..ان کی پشت میں اس پل کے خالی ہونے کے منتظر جو ڈرائیور تھے ان کے ہاتھ فوراً اپنے اپنے ہارن پر بے چینی سے دبنے لگے..

''میں یہیں کھڑی رہوں اور کار کو سٹارٹ نہ کروں تو یہ باسٹرڈ ہمارا کیا کر لیں گے..''

''پلیز...''

دوبارہ کار سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے اتنی تاخیر ضرور کی جس سے پیچھے رکی

ہوئی ٹریفک کو اندازہ ہو جائے کہ وہ ان کے بار بار ہارن بجانے کے دباؤ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی من مرضی سے حرکت کرنے لگی ہے... پل کے پار ہو کر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جب اس کے گھر کا مونگیا گیٹ دکھائی دیا تو اس نے جان بوجھ کر متعدد بار ہارن بجایا اسے بتانے کے لیے کہ وہ اس کی رہائش گاہ کے حدود اربعے سے بخوبی واقف ہے اور وہ صرف کہانیاں نہیں سنا رہی تھی..

''اگرچہ تمہیں یہ ڈبل بریسٹڈ نیلا بلیزر بہت پسند ہے..تم اسے بہت پہنتے ہو' زیادہ تر ہلکے رنگ کے شلوار قمیض کے ساتھ...اور جیب میں سے جھانکتا ایک سرخ ریشمی رومال جو بہت چیپ لگتا ہے... لیکن تم اپنا براؤن سکاٹش ٹویڈ کوٹ بہت کم پہنتے ہو جو مجھے زیادہ پسند ہے..براؤن سکارف کے ساتھ...''

''میری وارڈروب کے بارے میں تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں..'' وہ بے آرام کرنے والی باتیں کرتی تھی اور وہ ابھی سے اس سے تنگ آ چکا تھا..

''ہاں..میں تمہاری مکمل وارڈروب سے واقف ہوں..سوائے انڈرویئرز اور بنیانوں کے...یہاں تک کہ کچھ جرابوں کے رنگ بھی بتا سکتی ہوں....میں اس جامنی رنگ کی ویسٹ کوٹ کے بارے میں بھی جانتی ہوں جو تم نے اب تک صرف ایک مرتبہ پہنی ہے..شکر ہے کہ ایک مرتبہ ہی پہننے سے تمہیں احساس ہو گیا کہ اس قسم کا رنگ صرف سرکس کے مسخروں کو ہی سوٹ کر سکتا ہے..'' خاور نے بڑی مشکل سے اپنے کھولتے ہوئے غصے پر قابو پایا..ایک سراسر اجنبی عورت کس دیدہ دلیری سے اس کی ذات کے بارے میں اتنے بے ہودہ ریمارکس دے رہی تھی ''اور ہاں وہ براؤن رومال جو تم ہر جیکٹ ہر ویسٹ کوٹ کی جیب میں اڑس کر سمجھتے ہو کہ وہ میچ کرتا ہے...''

غصے کی بجائے خوف غلبہ پانے لگا...اس قسم کی عورت سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بیڈروم میں داخل ہو کر وارڈروب کی تلاشی لیتی رہی ہو..''لیکن تم...یہ سب کیسے جانتی ہو؟''

''میں نے تمہیں کبھی اوجھل نہیں ہونے دیا'' وہ بہت کھل کر ہنسی..اور جب اس کے پھیلے ہوئے ہونٹ دانتوں پر واپس آئے تو اس نے انہیں زور سے بھینچا اور اس دوران بھی اس کے آنسو گرتے رہے اور آنکھیں دھلتی رہیں ''میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ہر

ہفتے... جمعرات کے روز صبح ساڑھے دس بجے کی فلائٹ سیون اوتھری سے کراچی جاتے ہو اور اگلے روز شام کی فلائٹ سے آٹھ بجے واپس اسلام آباد آجاتے ہو.. ہر ہفتے.."

"یہ تم کیسے جانتی ہو؟" وہ باقاعدہ دہل گیا.... وہ اس کی ذاتی زندگی کا ہر پرت الٹتی جاتی تھی اور وہ اپنے کو بے لباس ہوتا محسوس کرتا تھا.. کیونکہ وہ درست کہتی ہے.. وہ انہی اوقات میں ہر ہفتے انہی ایام میں انہی پروازوں پر سفر کرتا تھا.. ایک اشتہاری فرم کے کنسلٹنٹ کی حیثیت سے وہ جمعرات کو کراچی جاتا تھا اور اپنا کام نپٹا کر اگلے روز واپس آجاتا تھا۔

"یہ میں ایسے جانتی ہوں سکول بوائے کہ پچھلے دس برس سے میں ہر جمعرات کو صبح ساڑھے دس بجے تمہاری روانگی پر اور اگلے روز تمہاری واپسی کے وقت پر ایئرپورٹ پر موجود ہوتی ہوں.... پچھلے دس برس سے ہر ہفتے... اور اسی لیے میں تمہاری مکمل وارڈروب سے واقفیت رکھتی ہوں.. تم جو کچھ بھی پہنتے ہو میں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتی ہوں.. تم چیک کرنا چاہو تو کر سکتے ہو شاید کوئی آئٹم رہ گئی ہو.. کوئی شرٹ کوئی ٹائی..." اس کا لہجہ بے حد نرم تھا... نہ وہ اسے ڈرانے کے انداز میں کچھ کہتی تھی اور نہ داد لینا چاہتی تھی۔

"تم ایسا کیوں کرتی رہی ہو؟"

"تمہیں دیکھنے کے لیے..."

"لیکن کیوں؟"

"تمہیں دیکھنے کے لیے.." اس نے پھر کہا جیسے یہی ایک مکمل جواز ہو.. اور اس میں کوئی بے چینی کسی اذیت کا شائبہ نہ تھا.. اگرچہ اس کی انگلیاں ابھی تک اس کے قابو میں نہ تھیں' ان کی کپکپاہٹ کلائی کے بریسلٹس میں سرایت کر کے انہیں بھی کپکپاتی تھی..

سملی ڈیم روڈ پر اس کی گرے سوزوکی ایک ہموار رفتار سے چلتی رہی.. پھر اس نے دائیں جانب سٹیرنگ گھمایا اور اس ویران سڑک پر ہو گئی جو ایک ویران علاقے کے بعد پہاڑیوں کے اوپر بلند ہو رہی تھی.... بارہ کہو کے نواح کی یہ پہاڑیاں وادیٔ سون کی قدیم تہذیب کے زمانوں سے لے کر صرف چار برس پہلے تک اپنی آبائی کیفیت میں بے آباد اور ویران پڑی تھیں... پھر کراچی کے کسی انوسٹر کا ادھر سے گزر ہوا اور اس نے انہیں غریب چرواہوں اور غیر حاضر مالکوں سے کوڑیوں کے داموں خرید لیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں گھر بنانے کی اجازت کبھی نہیں ملے گی' اس نے پورے علاقے کی پیمائش کروا کے پلاٹنگ کی

اور سڑکوں کا ایک وسیع جال بچھا دیا.. اس کے لیے یہ ایک معمولی سرمایہ کاری تھی لیکن کل کلاں اگر وہ کسی مؤثر سیاسی شخصیت کو ایریزونا یا ٹیکساس میں کوئی فارم آفر کر کے اس علاقے میں گھر بنانے کی پابندی کے قانون کو ذرا آگے پیچھے کروا لیتا ہے تو ان پہاڑوں نے سونا ہو جانا تھا.. فی الحال تارکول کی سڑکوں کے کنارے جنگلی گھاس اگتی تھی اور ان پر کوئی آمدورفت نہ تھی سوائے چھپکلیوں' خرگوشوں اور نیولوں کے جن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کی آماجگاہوں کے اوپر یہ کیسی سخت بچھ گئی ہے کہ وہ اپنے سوراخوں اور بلوں میں رینگتے ہوئے اوپر پہنچتے ہیں تو یکدم روشنی میں نہیں نکلتے.. پتھروں کی چادر سے جا ٹکراتے ہیں.. البتہ سانپ خوش تھے.. سرد راتوں میں وہ کملائے اور ادھ موئے ٹھنڈک سے لاچار رینگتے ہوئے اپنے بلوں سے باہر آتے تھے اور سڑک پر لوٹتے تھے اور اپنے آپ کو آسودہ کرتے تھے.. تارکول سورج کی گرمی کو رات گئے تک سنبھالے رکھتا تھا.. سڑک آس پاس کی زمین کی نسبت گرم ہوتی تھی..

گرے سوزوکی ذرا آہستہ ہو گئی.. ہولے ہولے بلند ہونے لگی..

"یہ تم کدھر جا رہی ہو؟'

"گھر..."

سڑک کے ایک بل کھاتے حصے کو طے کر کے اس نے کار کو بائیں ہاتھ پر موڑا اور پھر بریک پر پاؤں رکھ دیا.. "گھر آگیا ہے.." وہ اپنا بیگ سنبھالتی باہر نکل گئی..

"تم بھی آجاؤ.." اس نے تھوڑی دیر کے بعد جھک کر اسے اُسی حالت میں بیٹھے دیکھا "آجاؤ سکول بوائے... ڈرو مت یہاں کوئی نہیں ہے.."

وہ اس سکول بوائے کے لقب سے چڑنے لگا تھا.. اور مناسب موقع کے انتظار میں تھا جب وہ اسے بتا سکے کہ لیڈی تم خواہ مخواہ میرے ساتھ فرینک ہو رہی ہو.. میں عمر میں تم سے کہیں بڑا ہوں' اگر تم میری تعظیم نہیں کر سکتیں تو کم از کم یہ سکول بوائے ٹل شٹ تو استعمال نہ کرو.. لیکن وہ تعین نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ مناسب موقع کب مناسب ہے کیونکہ پچھلے پچیس منٹ میں کہ مری روڈ کراسنگ سے یہاں تک کے سفر کی مدت اس سے زیادہ نہ تھی.. وہ مختلف اور سراسر مخالف کیفیتوں اور احساسات سے دوچار ہوا تھا.. سراسیمگی' خوف' ہمدردی' حماقت اور اس کی ڈھلتی غلافی آنکھوں کی کشش.. وہ کسی ایک مقام پر ٹھہرتا تو موقع کی مناسبت کا تعین ہوتا..

وہ باہر آگیا..

سرسبز اور پتھریلی پہاڑیوں میں کہیں سرکنڈے تھے ہوا میں دوہرے ہوتے ہوئے' جنگلی جھاڑیاں اور کھردری گھاس تھی جس کی خودرو قدرتی ترتیب کو نو تعمیر شدہ سڑکوں کا جال بے رحمی سے کاٹتا تھا' بلندیوں پر چڑھتا تھا اور پھر نشیب میں گرتا تھا.. سنسناتا ویرانہ تھا اور بڑے بڑے پتھر تھے.. یہاں سے بارہ کہو کی آبادی مری روڈ سے لپٹی ہوئی اس کی قربت میں جاتے جاتے گھنی ہوتی دکھائی دیتی تھی... پہاڑیوں کے دامن میں بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ڈیرے تھے اور وہ غیر قانونی مکان تھے جو ندی کے پار کے علاقے میں اپنی جدید مگر اس قدرتی ترتیب میں بے ربط تعمیر کے باعث بہت نمایاں اور بے جواز لگتے تھے.. ان میں اس کا گھر بھی شامل تھا جس کی سرخ کھپریل کی چھت یہاں سے بھی دکھائی دے رہی تھی.. ندی کے دوسرے کنارے پر مری روڈ کا بل کھاتا فیتہ بھی نظر آتا تھا لیکن دوری کے باعث اس پر رینگتی ٹریفک فاصلے کی بے نام دھندلاہٹ میں گم تھی... ہوا بے لگام اور تیز تھی اور چہرے کو اس کی عادت نہ ہوتی تھی..

وہ دونوں کچھ دیر تک ایسے کھڑے رہے جیسے ایک دوسرے کی موجودگی سے آگاہ نہ ہوں' سامنے دیکھتے رہے اور پھر اس نے پلٹ کر اسے دیکھا.. تیز ہوا اس کی آنکھوں میں سے گرنے والے پانی کو اس کے رخساروں پر پھیلا دیتی تھی "ڈو یو لائک اے ڈرنک؟.." اس نے ہتھیلی سے اپنے رخساروں کو پونچھا...

"آئی ڈونٹ ڈرنک..."

"آئی نو یو ڈو..." وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی.. اس کی کمر میں تین بچوں کو جنم دینے کے باوجود اتنی لچک تھی کہ وہ دوہری ہو سکتی تھی.... "میں نے بندوبست کر رکھا ہے" سڑک سے ہٹ کر جہاں سے ڈھلوان شروع ہوتی تھی وہاں ایک بڑے حجم کی چٹان یوں ٹھہری ہوئی تھی جیسے وہ کسی قدیم دور میں لڑھکتی ہوئی اتری اور عین ڈھلوان کے کنارے پر آ کر رُک گئی.. وہ اپنے آنسو پونچھتی اس چٹان تک گئی اور جھک کر اس کی کوکھ میں پوشیدہ دو پیپر کپس نکالے اور انہیں دونوں ہاتھوں میں بلند کر کے وہیں سے پوچھا "پیپسی یا اورنج جوس؟... دونوں مہیا کیے جا سکتے ہیں.."

"کچھ بھی..." وہ منہ کھولے حیرت سے اس عجوبہ عورت کو دیکھتا رہا.. وہ اس کے

تجربے سے باہر کی کوئی چیز تھی.. اس کی فہم سے الگ اور بالاتر کوئی وجود تھی..

دونوں پیپر کپس پہلے اس نے چٹان پر رکھنے کی کوشش کی مگر ہوا انہیں اوندھا کر دیتی یا زمین پر گرا دیتی.. پھر اس نے سر جھٹک کر ایک مسرت آمیز کیفیت میں انہیں چٹان کے نیچے زمین پر رکھا.. تھوڑی دیر تک انہیں سانس روکے گھورتی رہی کہ یہ گریں گے تو نہیں اور جب وہ قائم رہے تو اس نے چٹان کی پوشیدگی میں سے پیپسی کولا کی ایک کنگ سائز بوتل نکال کر اس کا ڈھکن گھمایا اور کاغذ کے گلاس لبریز کر دیے..

"یور ڈرنک از ریڈی.." اس نے ہاتھ لہرا کر اسے دعوت دی..

خاور نے آگے بڑھ کر اپنا کپ وصول کر لیا..

"چیئرز..." اس نے اپنا کپ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا.. مشروب کی گیس کو ایک ڈکار کی صورت میں باہر آنے سے روکنے کے لیے اس نے لب بھینچے.. اس کے لبوں پر ایک گیلاہٹ تھی جو ان کے مساموں میں سے پھوٹتی تھی "تم مجھ سے یہ نہیں پوچھو گے کہ یہ تمہاری تواضع کے لیے یہ سب کچھ یہاں پہلے سے کیسے موجود ہے.." وہ اس کے چہرے پر لکھی بے یقینی سے لطف اندوز ہو رہی تھی.. وہ چپ کھڑا رہا.. ایک سکول بوائے کی طرح جس کی ٹیچر کے پاس دنیا کے ہر سوال کا جواب موجود ہوتا ہے..

"میں پچھلے کئی برس سے اسلام آباد کے گرد و نواح کے علاقوں کی خاک چھانتی رہی ہوں یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ جب میں تم سے پہلی بار ملوں گی تو ہم کس سپاٹ پر آ کر رُکیں گے.. راول جھیل کا دوسرا کنارا ابھی بہت الگ تھلگ اور دیدہ زیب ہے مگر وہاں بھی اتنی غیر قانونی کنسٹرکشن ہو رہی ہے کہ کچھ نہ کچھ آتا جاتا رہتا ہے.. گولڑہ کا تقریباً بے آباد ریلوے سٹیشن جہاں برگد کے بہت ہی پرانے جن کی داڑھیاں زمین تک آتی ہیں درخت سایہ کرتے ہیں مجھے پہلے پہل بہت آئیڈیل لگا لیکن پھر میں نے سوچا کہ وہ تمہارے گھر سے بالکل مخالف سمت میں اور پورا اسلام آباد عبور کرنے کے بعد آتا ہے.. دامن کوہ میں بہت ہجوم ہوتا ہے.. تب جا کر میں نے اس سپاٹ کو دریافت کیا جو تمہارے گھر کے قریب بھی تھا اور میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں کہ اس سے بہتر' تنہا' الگ اور ویران اور ایسے منظر والا سپاٹ اس پورے خطے میں نہیں ہے.. مائنڈ یو یہ برسوں کی تحقیق کا نتیجہ ہے.. اور تم نے ابھی تک یہ

نہیں پوچھا کہ چٹان کے نیچے یہ چھوٹا سا ریستوران کہاں سے آگیا.."

"میں کیسے پوچھ سکتا ہوں جب کہ بولنے کے تمام تر اختیارات تمہارے پاس ہیں.."

"وجہ بہت سادہ ہے.. تمہارے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ میں تمہارے بارے میں سب کچھ پہلے سے جانتی ہوں.. تم مجھے نہیں جانتے اس لیے میں بولتی چلی جاتی ہوں.. کل صبح.. فرید کی بارات لے جانے سے پہلے... جب میں جانتی تھی کہ آج رات میں تمہیں فون کروں گی.. صبح سویرے کسی بہانے میں گھر سے نکلی تھی اور اس چٹان کے نیچے یہ ڈرنکس سٹور کر گئی تھی.. کیونکہ آج ہم نے یہاں آنا تھا.."

"اور تم نے قطعی طور پر اس امکان کو ذہن میں جگہ نہیں دی کہ میں تم سے ملنے سے انکار بھی کر سکتا ہوں.."

"نہیں.." اس نے سر ہلایا اور پھر یکدم اس کے چہرے کا رنگ نچڑ گیا جیسے پہلی بار اسے خیال آیا ہو کہ یہ امکان بھی ہو سکتا تھا.. "نہیں.."

"تم نے یہ سوچا کہ ہمارے معاشرے میں مرد تو منتظر رہتے ہیں.. وہ کبھی انکار نہیں کر سکتے.."

"نہیں.." اس نے پھر کہا.. ہونٹ چباتے ہوئے اس نے موضوع بدلنے کے لیے فوراً کہا "یہاں صرف ڈرنکس ہی نہیں ہیں... کشمش والے بن بھی ہیں جو تمہیں بہت پسند ہیں.. تمہارے اس چائے خانے کے مالک نے مجھے بتایا تھا اور کچھ چکن اینڈ ٹومیٹو سینڈوچ بھی سٹور میں ہیں اگر وہ باسی نہیں ہو گئے تو.."

"کیا آپ رونا بند نہیں کر سکتیں؟"

"کیا میں اب بھی رو رہی ہوں.." اس نے آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر انہیں پونچھا اور پھر انہیں گیلی پا کر پہلی بار شرمندہ ہوئی "آئی ایم سوری... آئی کینانٹ ہیلپ اٹ.. پچیس برس کی قید کے بعد میں آج رہا ہوئی ہوں اس لیے میرا بس نہیں چل رہا.. آئی کینانٹ ہیلپ اٹ.."

اس کا چہرہ... غلافی آنکھوں کے سیال سحر کے باوجود کچھ پھولا ہوا سا لگا.. شاید یہ عمر تھی جو اس کو بے حس اور ہڈیوں سے جدا کرتی تھی..

اس کا تہذیبی اور تعلیمی پس منظر کانونٹ کا تھا اسی لیے اس نے ٹماٹو کی بجائے ٹمیٹو کہا تھا..

سورج سر پہ آگیا..

ایک زرد رنگت کا.. کہرے میں ٹھٹھر کر پیلاہٹ میں ڈھل جانے والی گھاس کی خاصیت کا.. ایک لمبوترا چھوٹے منہ اور ایک تکون نما کھردری دُم والا کرلا چٹان کی اس کوکھ میں سے برآمد ہوا جہاں اشیائے خورد و نوش کا سٹور تھا اور پھر ان دونوں کو یکدم سامنے پا کر نروس ہو گیا.. کچھ دیر سناٹے اور اچنبھے میں ششدر رہا اور پھر تیزی سے تارکول کی سطح کو پار کر کے دوسری جانب گھاس میں روپوش ہو گیا.. اس رینگنے والے کرلے کو اگر کئی ہزار گنا بڑا کر لیا جاتا تو وہ لاکھوں برس پیشتر معدوم ہو چکے اپنی گرانڈیل دموں سے تباہی مچاتے ایک گوشت خور جانور کی صورت اختیار کر جاتا تھا..

کرلے کے نمودار ہونے پر... اس نے ایک خوفزدہ سسکی بھری اور اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی..

اپنا ڈر کم کرنے کے لیے اس نے کہا "دھوپ کی تیزی تمہارے ماتھے پر ظاہر ہو رہی ہے.. تم اپنا بلیزر اتار سکتے ہو...."

خاور نے اس کے مشورے پر عمل نہیں کیا اور ایک سرکشی کے انداز میں پوچھا "تم چاہتی کیا ہو؟"

"یہی کہ تم اپنا بلیزر تار دو...."

"میں سنجیدگی سے تم سے مخاطب ہوں اور اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلو گی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا.. میں ذرا کند ذہن واقع ہوا ہوں اور اس سارے تماشے کو سمجھنے سے قاصر ہوں.. تم کیا چاہتی ہو؟"

"تمہیں..." اس کے آنسو بالآخر خشک ہو چکے تھے.. اور ان کے بغیر وہ اب بہت مختلف مزاج اور شکل کی لگتی تھی.. "کوئی خاص قصہ نہیں کوئی کہانی نہیں.. ہاں یہ درست ہے کہ یہ ایک تماشا ہی ہے.. یہی جو کچھ کل رات میں نے فون پر تمہیں بتایا تھا اس کے سوا کچھ بھی نہیں.. کالج کے دنوں میں جب تمہاری پہلی کتاب پڑھی، تمہیں پہلی بار ٹیلی ویژن پر باتیں کرتے دیکھا.. اور تم اصلی زندگی میں اتنے غصیلے اور ڈرا دینے والے نہیں لگتے... تو تب

سے.. میرا خیال تھا کہ یہ ایک ٹین ایج کرش ہے' گزر جائے گا.. لیکن نہیں گزرا... پرورش پاتا رہا اور جڑیں پھیلاتا مضبوط ہوتا رہا... تب مجھ میں ہمت نہ تھی تم سے رابطہ کرنے کی.. شادی کے بعد بھی اس حماقت انگیز لگاؤ میں کوئی کمی نہ ہوئی... میرے بچے بھی جانتے ہیں کہ ٹیلی ویژن پر تمہارا کوئی پروگرام چل رہا ہو تو ممی کیسے اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ جاتی ہیں' چپک جاتی ہیں.. وہ اکثر مجھے چھیڑتے ہیں اور میں جواب میں انہیں ڈانٹ دیتی ہوں لیکن دل ہی دل میں ان کی شکر گزار ہوتی ہوں کہ انہوں نے تمہارا تذکرہ کیا.. وہ تمہاری ہر نئی کتاب خرید کر میرے لیے لاتے ہیں کہ ممی آپ کے خاور صاحب... ظاہر ہے ان کے گمان میں بھی نہیں کہ یہ سب کچھ جسے وہ تفریح سمجھتے ہیں ممی ڈیئر کی زندگی کا سب سے گمبھیر مسئلہ ہے.. بس یہی تماشا ہے..."

"تم مجھے ایک کچے ذہن کی جذباتی عورت نہیں لگتیں جو لفظوں کے ہیر پھیر سے فریب میں آجائے.. اپنے آپ کو فریب میں ڈال لے... صرف ٹیلی ویژن کی سکرین پر کسی چہرے کو دیکھ کر حواس کھو بیٹھے..."

"ہاں میں ایسی ہرگز نہیں ہوں.. بہت عملی اور حقائق کی روشنی میں نتیجے اخذ کرنے والی عورت ہوں.. زندگی کے بارے میں پُرعمل رسائی میری طبع میں گندھی ہوئی ہے اور خاندان کے افراد جو مجھ سے عمر میں بڑے بھی ہیں میری رائے جان کر کسی بھی مسئلے پر اپنی رائے تبدیل کر دیتے ہیں... میں تمہیں سینڈوچ لا کر دیتی ہوں.." اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ چٹان کی طرف گئی اور سیلوفین میں پیک کیے گئے سینڈوچ لے کر واپس آگئی "بالکل فریش ہیں..." اس نے سینڈوچز کو سونگھا اور پھر ایک گلہری کی مانند ان کا ایک کونہ دانتوں سے کتر کر چبایا "بالکل تازہ ہیں... چکھ کر دیکھو..."

"مجھے بھوک نہیں ہے..."

"ناشتے کے بعد اب تک تم نے کچھ نہیں کھایا اس لیے بھوک تو ہوگی.. شاید تم میرا جوٹھا سینڈوچ کھانے سے کترا رہے ہو.. ہوسکتا ہے میں نے اس پر کوئی ٹونا کر دیا ہو..." وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا تی گئی "میں نے صرف ایک بائٹ لی تھی تم دوسری طرف سے کھا لو.. پلیز..."

کھلی فضا میں سینڈوچ کا ذائقہ بہت تازہ اور تسلی دینے والا تھا.. ٹومیٹو البتہ تھوڑے

پژمردہ تھے لیکن ان کی بھی تازگی برقرار تھی..

"اگر تم بقول تمہارے زندگی کے بارے میں پُرعمل رسائی پر یقین رکھتی ہو تو میرے بارے میں تمہارے رجحان میں عملیت کہاں ہے..؟"

"صرف اس میں نہیں ہے.." اس نے اپنے خوبی سے رنگے ہوئے بالوں کو ماتھے پر سے سمیٹ کر درست کیا "اینڈ آئی کینناٹ ہیلپ اٹ"

"لیکن تم اس حقیقت سے آگاہ تو ہو کہ ادب 'لکھا ہوا لفظ ایک سراب ہے.. کم از کم اسے لکھنے والا اصلی زندگی میں وہ نہیں ہوتا جو تحریر میں ظاہر ہوتا ہے.. اس کے بس میں کوئی مسیحائی نہیں ہوتی.. اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے کسی درد کی دوا کرتا' اپنے بکھیڑوں کو سلجھاتا.. میں بھی وہ نہیں جو کتابوں میں دکھائی دیتا ہوں.. کسی حد تک مکار ہوں اور جھوٹا بھی ہوں.. ٹیلی ویژن پر بھی میرا چہرہ میک اپ کی ایک موٹی تہہ کا محتاج ہوتا ہے.. تم چونکہ میرے بارے میں ہر شے جانتی ہو اس لیے تمہیں یقیناً میری تاریخ پیدائش کا بھی علم ہوگا..."

"تم ساٹھ برس کے ہوگئے ہو.."

"تو پھر..."

"تو پھر یہ کہ عمر سے کچھ فرق نہیں پڑتا.."

"عمر سے بہت فرق پڑتا ہے... جب تم میری عمر کو پہنچو گی تب تمہیں بھی احساس ہوگا.."

"تم ایک وکیل کی طرح دلائل دے رہے ہو.." اس کی آنکھیں پھر سے بھرنے لگیں چہرے پر عمر کی جو کروٹیں ابھی نہیں ابھری تھیں وہ رنج کی کڑواہٹ سے ظاہر ہونے لگیں.. "میں نے بھی اپنے آپ کو تم سے چھڑانے کے لیے متعدد بار یہی دلائل دیے لیکن یہ قطعی کارگر نہیں ہوتے.. ہر دلیل اپنے آپ کو رد کرتی چلی جاتی ہے.."

"اور اس پورے تماشے کا ڈراپ سین یہ ملاقات ہے.. یہی آخری مقصد ہے' مجھ سے ملنا..."

"تم سے ملنا اور.. تمہیں دیکھنا.. میک اپ کی دبیز تہوں کے بغیر تم بہت بہتر لگتے ہو.."

"لیکن اس عمر میں ہم دونوں کے درمیان محض ایک رومانوی تعلق تو ممکن

نہیں.. تو پھر تمہاری خواہش کیا ہے.. سیکس؟"

"نہیں..." اسے احساس ہوا کہ آنکھیں بھرنے کے بعد اس کے رخساروں پر گیلاہٹ پھیلنے لگی ہے اور اسے تعجب ہوا اور اس نے ہتھیلی سے انہیں پونچھا.. "نہیں.. مرزا صاحب اس سلسلے میں بہت پوٹنٹ ہیں اور بہت تسلی دینے والے ہیں... بلکہ ضرورت سے اور خواہش سے کہیں زیادہ ابنارمل حد تک.. لیکن ان کے لیے میری ذات یا وجود کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے... میری جگہ کوئی بھی ہو.. کوئی کال گرل... کوئی ادھیڑ عمر نوکرانی.. ہانگ کانگ کی کسی سیکس شاپ سے خریدے ہوئے بے شک صرف نسوانی اعضاء ہوں.. انہیں کچھ فرق نہیں پڑتا.. میں سیکس سے بھری ہوئی ہوں ناک تک.. بیزار ہوں.. تو خاور صاحب یہ میری ترجیحات میں کہیں بھی شامل نہیں.. اگرچہ مرزا صاحب اس معاملے میں زیادہ پر شوق نہ ہوتے تو اس کے بارے میں بھی غور کیا جا سکتا تھا.. لیکن پھر بھی تمہیں ملنے میں اس کی کشش کا کوئی کردار نہ ہوتا... میڈیا میں تمہاری موجودگی یا تمہاری تحریر بھی صرف ایک پہلا تعارف تھا.. اور پھر یہ دونوں بھی پس منظر میں چلے گئے.. کسی پارٹی میں یہ دو مہمان تھے جو مجھے تمہارے قریب لائے اور پھر رخصت ہو گئے.. مجھے ان سے بھی کوئی غرض نہیں.. چنانچہ جب ٹین ایج کرش نہیں گزرا... ہر ذلیل نے اپنے آپ کو موقوف کر دیا تو میں تم سے ملنے کی تمنا پالنے لگی.. شادی کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں مرزا صاحب کے بچے پال کر بڑے کروں گی.. ان کی شادیاں کروں گی اور پھر.. جو میں چاہتی ہوں وہ کروں گی..."

وہ اس آنسوؤں سے لبریز غلافی آنکھوں والی عورت کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا... سوائے جنس مخالف کی موجودگی میں جو بے وجہ بے آرامی ہوتی ہے اس کے... ہوس، فخر، کشش یا فتح کا کوئی احساس کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا.. وہ ایک شے تھی، ایک کیس ایک کردار تھی اور خاور اسے بارہ کہو کی پہاڑیوں کے اندر ایک سٹیج پر پرفارم کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا ایک تماشائی کی طرح... وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ مکالمے تھے جو اس نے یاد کر رکھے تھے اور اس کا چہرہ بولے گئے لفظوں کی ترجمانی کر رہا تھا.. اگرچہ وہ بالکل الگ اور ایک فاصلے سے اس کا مشاہدہ کر رہا تھا لیکن اس کی پرفارمنس میں ایک جھول تھا.. وہ بھرپور تاثر دینے کے لیے نہ ٹھہرتی تھی اور نہ کسی لفظ پر زور دیتی تھی متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی جس سے شائبہ ہوتا تھا کہ وہ محض اداکاری نہیں کر رہی..

"...اور اب میں وہی کر رہی ہوں جو میں چاہتی ہوں۔"

"آر یو میڈ؟"

"ہاں میں ہوں.. جہاں دلیل نہیں ہے جواز نہیں ہے وہاں تم ہو.. اس لیے آئی ایم میڈ..." اس نے پیک میں سے ایک اور سگریٹ نکالا اور اس کی انگلیاں جو کب کی شانت ہو چکی تھیں پھر سے کپکپانے لگیں اور اس نے وہ سگریٹ مشکل سے نکالا اور اس کی جانب بڑھا دیا "اسے سلگا کر مجھے دو... کیونکہ میں یکدم بہت نروس ہو گئی ہوں"

ڈھلتی دوپہر بارہ کہو کی پہاڑیوں کے خدوخال میں کہیں کہیں جہاں گہرائی تھی سائے بچھا رہی تھی.. تارکول کے فیتے جوان کے کنوارپن کو مجروح کرتے تھے ابھی دھوپ میں تھے.. بہت نیچے جہاں سے وہ اوپر آئے تھے سملی ڈیم روڈ پر کبھی کبھار کوئی مسافر ویگن یا کار ایک ڈنکی کھلونے کی طرح رینگتی ظاہر ہوتی تھی اور پھر سلو موشن میں ان کی نظروں کے سامنے بہت دیر تک رہتی اور آہستہ آہستہ دائیں ہاتھ پر بلند ٹیلے کے پیچھے روپوش ہو جاتی..

اسے بلیزر اتارنے کی ضرورت نہ تھی، ہوا میں خنکی کا تناسب بڑھتا جا رہا تھا..

نہایت احتیاط سے رنگے اس کے بال ماتھے پر بکھرتے اور سمٹتے تھے لیکن وہ انہیں ہٹاتی نہ تھی.. بے دھیانی میں سگریٹ کے کش لگاتی اس کی موجودگی سے شاید غافل ہو چکی تھی..

شام ہونے لگی..

جس چٹان کی کوکھ میں مشروبات اور سینڈوچ سٹور کیے گئے تھے اس کا سایہ طویل ہوتا جھاڑیوں اور دوسرے پتھروں کی جانب رینگتا اور ان کی دھوپ جذب کرتا لمبا ہو رہا تھا.....

سملی جھیل کی جانب سے آنے والی ہوا جو کچھ دیر پہلے تک دھوپ کی حدت سے مہکتی تھی اب بے جان اور سرد ہو رہی تھی..

وہ تمنا اور عشق کی ایک متروک شدہ دیوی کی طرح تنہا اپنے آپ میں گم اس سے غافل سگریٹ کے کش لگاتی رہی.. اگرچہ متروک شدہ دیویوں کی آنکھیں اتنی غلافی اور دل پر اثر کرنے والی نہیں ہوتیں.. ایک طویل خاموشی کے بعد جس میں سردی در آئی تھی،

سائے طویل ہوئے تھے اور نیچے بارہ کہو کی آبادی اور پہاڑیوں میں سمٹے دیہات میں کہیں کہیں بلب ٹمٹمانے لگے تھے وہ بولی.. جیسے ہوا سے مخاطب ہو "تم جانتے ہو میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے... تمہیں ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کردوں اور اس کے تالے کی چابی میرے پرس میں ہو... جب جی چاہے اسے کھولوں اور تمہیں دیکھ لوں..."

"اس کوٹھڑی کے اندر آنے کی اس کی تنہائی میں کچھ وقت بسر کرنے کی خواہش نہیں ہے؟"

"نہیں.. مجھے تمہارے ساتھ سیکس کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے... صرف اس کا قفل کھولوں کواڑ دھکیل کر تمہیں دیکھ لوں... اور گھر لوٹ جاؤں... جب جی چاہے.."

"ایک ساٹھ سالہ شخص کو؟"

"یہ تو ایک دلیل ہے جو کارگر نہیں... عمر سے فرق نہیں پڑتا' یہ تم کب سمجھو گے؟"

دھوپ کی چادر سمٹ چکی تھی اور تاریکی اتر رہی تھی.. پہاڑیوں کا سبزہ گہرا ہو کر اندھیرے میں گم ہونے کو تھا.. نیچے سملی ڈیم روڈ پر کاریں بہت غور کرنے سے دکھائی دیتی تھیں لیکن ان کی ہیڈلائٹس سڑک کے ایک مختصر حصے کو روشن کرتیں آگے بڑھتی تھیں..

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے جھنجلا کر اپنے آپ سے کہا..

"محبت..." اس نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں میں تھاما اور ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا.. اس میں جنس نہ تھی' خود سپردگی کا کوئی شائبہ نہ تھا.. جیسے سکول جانے والے بچے کو اس کی ماں بوسہ دیتی ہے..

"میں.. اس جذبے سے واقف نہیں ہوں۔"

"نیور مائنڈ... لیکن ابھی مجھے جانا ہے.. آج رات آٹھ بجے میرے بیٹے کی دعوت ولیمہ ہے اور مجھے ایک معزز ماں کی طرح اس کے سسرال والوں کا استقبال کرنا ہے۔"

کہیں مڈل کلاس' کہیں متمول آسودہ اور کہیں بمشکل گزر اوقات کرنے والی اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی بھنبھناتی بھیڑ میں سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان الگ ہوا اور اس کے پاس آکر نہایت جھجک سے کہنے لگا.. "ایکس کیوزمی..."

وہ فلائٹ بورڈ کے ہندسوں کو سر اٹھائے بہت دیر سے تکتا جا رہا تھا اور ابھی تک وہ فلائٹ چار سو اکتالیس پی کے.. جو کہ کراچی جانے والی تھی اور اس کی فلائٹ تھی اس کے جلتے بجھتے ہندسوں کو تلاش نہیں کر سکا تھا یہ جاننے کے لئے یہ پرواز پورے وقت پر روانہ ہو رہی ہے یا نہیں.. اور اگر نہیں تو وہ اس فالتو وقت کا کیا کرے گا.. فلائٹ آپریشن میں اپنی ایک واقف ادھیڑ عمر ایئر ہوسٹس کے پاس جا کر کافی کی فرمائش کرے گا یا کیا کرے گا جب اس لمبے تڑنگے نوجوان نے اس کے قریب آکر ایک جھجک کے ساتھ "ایکس کیوزمی" کہا..

اس نے فلائٹ بورڈ پر سے نظریں نیچی کر کے اسے دیکھا... وہ ایک وجیہہ اور گورے چٹے رنگ کا نظروں میں سما جانے والا ینگ مین تھا جس کی مونچھوں میں سنہری پن تھا اور وہ ابھی مکمل طور پر گھنی اور مردانہ نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک اجنبی سے مخاطب ہونے والا ڈر اور نوجوانی کا الہڑپن تھا..

"معاف کیجئے گا..." وہ ذرا جھجک کر بولا کیونکہ اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔

"جی..."

"آپ خاور حسین ہیں ناں؟"

"جی میں ہوں"

وہ نوجوان شش و پنج میں پڑ گیا.. جھجک گیا... اُس نے ایک اجنبی سے رابطہ کرنے کے لئے جو ہمت جمع کی تھی وہ شاید جواب دے گئی۔ وہ نظریں نیچی کر کے اپنی اُنگلیوں کو ایک دوسرے کے شکنجے سے جدا کرنے کی کوشش کرنے لگا اور پھر سیدھا ہو کر بظاہر بڑے اعتماد سے بولا "سر... آپ فلائٹ چار سو اکتالیس پی کے سے کراچی کیلئے سفر کر رہے ہیں؟"

"آئیڈیا تو یہی ہے.." اُس نے مسکرا کر کہا..

اُس کی مسکراہٹ نے نوجوان کے اعصاب کو بہتر کر دیا اور وہ نہایت مؤدب ہو کر کہنے لگا "سر.. میری والدہ بھی اِسی فلائٹ سے کراچی جا رہی ہیں.. اینڈ شی ایڈمائرز یو... سر وہ آپ کو بے حد ایڈمائر کرتی ہیں تو... کیا یہ ممکن ہے کہ... میرا مطلب ہے کہ وہ آپ کے ساتھ سفر کر سکیں..."

"بھئی اس میں میری اجازت کی تو چنداں ضرورت نہیں.. ایک ہی فلائٹ میں جانے والے تمام مسافر ایک ساتھ ہی سفر کرتے ہیں.."

"شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ بیان نہیں کر سکا" نوجوان کا اعتماد پھر زائل ہو گیا "میرا مطلب ہے کہ وہ آپ کے برابر کی نشست حاصل کر لیں اور دوران سفر آپ کے ساتھ باتیں کر سکیں.. وہ آپ کو بے حد ایڈمائر کرتی ہیں سر... بلکہ مجھے کہنا تو نہیں چاہئے لیکن ہم اور ابو اُنہیں کبھی کبھار آپ کے حوالے سے چھیڑتے بھی ہیں.. جسٹ فار فن..." نوجوان جھجکتے ہوئے ہنسنے لگا... "آپ کو یہاں دیکھ کر میں نے ہی ماں جی سے کہا تھا کہ.."

جھجکتے، ہنستے، نیم سنہری مونچھوں والے... عمر کی ناپختگی میں زندگی کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے زُعم میں گم نوجوان کے بلند قامت بُت کے پیچھے وہ ہنستی تھی اور روپوش ہوتی تھی... پر اُس کی غلافی آنکھیں تیرتی ہوئی اپنے بیٹے کے چوڑے شانوں پر سے گزرتیں اُس تک آتی تھیں اور کہتی تھیں... چپ... بولنا نہیں!

وہ نہیں بولا۔

ایئرپورٹ کے اندر بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے لئے کراچی کی فلائٹ کے لئے مسافروں کی جو مختصر قطار تھی وہ اُس کی پشت پر کھڑی بار بار اُس کی کمر میں کچوکے دیتی تھی اور

ہنستی تھی... وہ بُت بنا کھڑا اُس کی بیباکی سے عاجز آیا ہوا اپنے چہرے کو سنجیدہ اور لاتعلق اور اپنی عمر کے مطابق مدبر بنانے کی کوشش کرتا تھا..

عین ممکن تھا کہ اُس کا بیٹا ابھی تک ایئرپورٹ ہال میں کھڑا شیشوں کے پار اس قطار کو دیکھ رہا ہو جو بورڈنگ کاؤنٹر کے سامنے آہستہ آہستہ رینگتی تھی اور اپنی ماں کو نظر میں رکھتا ہو...

لیکن وہ جو اُسکے پیچھے کھڑی تھی اُسے اس امکان کی کوئی پرواہ نہ تھی..

وہ کبھی اُس کی فربہ کمر کو تھپکتی اور کبھی اُس کی ریڑھ کی ہڈی پر اُسے تنگ کرنے کے لئے اپنی اُنگلیاں پھیرنے لگتی.. اُس کا ماتھا پسینے سے بھیگنے لگا..

کبھی وہ قطار کے دباؤ کو بہانہ بنا کر اُس کی پشت سے آ لگتی اور دیر تک لگی رہتی.. جیسے اپنے بدن کی گرمی اُس میں انجیکٹ کر رہی ہو اور پھر پیچھے ہو جاتی..

وہ ابھی تک نہیں بولا تھا..

دل ہی دل میں کڑھتا اور ہونٹ چباتا تھا اور ایک بے نام خوف کا پسینہ اُس کے تن بدن میں پھوٹتا تھا.. اُس کے پیچھے جو بھی مسافر تھا وہ اتنا بیوقوف تو نہیں تھا کہ اپنے آگے کھڑی خاتون کی بے چین اُنگلیوں اور اُس سے اگلے مسافر پر ذرا سا دباؤ سے تا دیر جڑے رہنے کو ایک قدرتی عمل سمجھتا.. وہ اُس کی ناگہانی قربت میں ناخوش تھا.. اس بے خواہش رفاقت کو پسند نہیں کر رہا تھا.. لیکن وہ کیا کرتا... اُس زندگی کی حقیقتوں کے اچنبھے پن سے ابھی ناواقف نوجوان کو ٹکا سا جواب دے دیتا کہ نہیں تمہاری ماں میرے برابر کی نشست پر نہیں بیٹھ سکتی... اس لئے کہ یہ تقریباً ہر ہفتے بارہ کہو کی پہاڑیوں کے اندر میرے ساتھ ہوتی ہے اور اس کے بوسے کی گیلاہٹ ابھی تک میرے ماتھے پر ہے اور جس کار پر تم اسے ایئرپورٹ چھوڑنے آئے ہو اُس کا نمبر یہ ہے اور اُس کے اندر جو ایئر فریشنر ہے اُس کی مہک ایسی ہے..

وہ کیا کرتا..

مسافروں کی قطار ایک اذیت ناک آہستگی سے اٹک اٹک کر آگے بڑھتی تھی اور ہر اٹک کے ساتھ اُس کے سینے کا نرم اُبھار اُس کی پشت سے آ لگتا تھا اور اُس کی حدت ٹویڈ کوٹ میں سرایت کر کے اُس کے بدن میں سلگنے لگتی تھی..

وہ وہ اس سلگاہٹ کو ٹھنڈا نہ ہونے دیتی تھی..

اُس نے اُسے اپنے بیٹے کے جُثے کے پیچھے ہٹتے اور روپوش ہوتے دیکھنے کے بعد اب تک ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا تھا..

اور وہ ہر بار جب کوئی مسافر کاؤنٹر سے اپنا بورڈنگ کارڈ وصول کر کے جگہ خالی کرتا اور قطار میں کھڑے مسافر ایک قدم آگے بڑھاتے وہ اُس کی پشت سے آلگتی اور لگی رہتی تا آنکہ وہ اپنا قدم آگے بڑھا کر اُس کے زم جُثے سے الگ نہ ہو جاتا..

وہ ابھی تک ایک ایسا کراس ورڈ پزل تھی جس کا ہر چوکور خانہ خالی تھا..

کہیں بھی کسی خانے میں کوئی ایک حرف ایسا نہ تھا جس کی مدد سے کوئی لفظ بنتا جو اُسے جاننے یا مکمل کرنے میں معاون ثابت ہوتا.. کہیں کوئی سراغ نہ تھا..

معمے کا ہر خانہ خالی تھا..

اور اُس میں اُس کا نام تک نہ تھا..

ٹیلی فون نمبر نہ تھا..

وہ کہاں سے 'کس رہائشی علاقے کے کونسے مکان سے برآمد ہو کر مری روڈ کی اُس کراسنگ پر آتی تھی اور پھر ہمیشہ اُسے اپنی کار لاک کر کے اپنے برابر میں بیٹھ جانے کو کہتی تھی اور ہمیشہ اُسی بلندی پر لے جاتی تھی جہاں سے بارہ کہو کا ایک فضائی منظر مکمل تنہائی اور سرسراتی ہوا میں نظر آتا تھا.. اور ہمیشہ چٹان کی کوکھ میں تازہ سینڈوچ اور مشروبات سٹور ہوتے تھے..

"تم نے ابھی تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا..."

"میرا کوئی نام نہیں..."

"اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہو تا کہ میں اس کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھاؤں..."

"نہیں نہیں.. تم کہو تو اگلی ملاقات پر میں مرزا صاحب کو ساتھ لا سکتی ہوں.. لیکن واقعی میرا کوئی نام نہیں.. میں ابھی ابھی آسمان سے گری ہوں.. ابھی پیدا ہوئی ہوں.. اور نو مولود بچے کا کوئی نام نہیں ہوتا.. تم مجھے نام دے دو..."

"کہاں رہتی ہو؟"

"اس کوٹھڑی کے باہر جس میں میں نے تمہیں بند کر رکھا ہے.. میں وہیں بیٹھی

رہتی ہوں اور جب جی چاہتا ہے تالا کھول کر تمہیں دیکھ لیتی ہوں.."

"اور ٹیلی فون نمبر؟"

"نومولود بچوں کے پاس فون نہیں ہوتا..."

اُسے ہمہ وقت یہ احساس تو تھا کہ وہ کسی مصلحت کے تحت اپنی شناخت سے گریز نہیں کر رہی بلکہ وہ اس رشتے اور اس میل ملاپ میں ان چیزوں کو فروعی اور بیکار سمجھتی ہے... نام اور فون نمبر کا سوال کہیں آٹھویں ملاقات کے بعد ہوا تھا..

پہلی چند ملاقاتوں میں وہ بڑی دیدہ دلیری سے آتی تھی۔ اُسے دیکھ لئے جانے کا یا پہچان لئے جانے کا کوئی ڈر نہ تھا بلکہ وہ اُس کا مذاق اُڑاتی کہ گھبرے ہو کر کیوں بیٹھے ہو.. تمہارا خیال ہے کہ ہر سامنے سے آنے والی کار میں تمہارے واقف کار ہوں گے رشتے دار ہوں گے.. اگر وہ دیکھ بھی لیں تو کیا ہوگا.. زیادہ سے زیادہ تمہاری قسمت پر رشک کریں گے.. دیکھو مجھے کوئی پرواہ نہیں حالانکہ یہ علاقے مرزا صاحب اور میرے بیٹوں کی جان پہچان والوں سے بھرے پڑے ہیں... پھر آہستہ آہستہ وہ احتیاط برتنے لگی اُس کا اعتماد ساتھ چھوڑنے لگا.. ایک بہت بڑی سفید شال میں لپٹی 'ڈھکی اور چھپی ہوئی' پلاسٹک کے کنگ سائز گوگلز میں اپنا آدھا چہرہ روپوش کیے.. صرف اُس کے ہاتھ دکھائی دیتے جو سٹیئرنگ پر کانپتے پھڑ پھڑاتے رہتے.. جیسے کسی ماتمی محفل میں جا رہی ہو.. کار رُکنے سے پیشتر ہی وہ دروازہ کھول دیتی "پلیز جلدی سے بیٹھ جاؤ یہاں ہمارے جاننے والے بہت ہیں"

کار کے اندر بیٹھتے ہی اُس کی پہلی ڈیوٹی یہ ہوتی تھی کہ وہ ایک سگریٹ سلگا کر اُس کی لرزتی اُنگلیوں میں پرو دے.. وہ ایک گہرا کش لگا کر اُس کی جانب دیکھتی اور ایک ذہنی طور پر پسماندہ بچے کی طرح مسکرانے لگتی.. اُس کے آنسو گرنے لگتے اور وہ بار بار اپنی غلافی آنکھیں جھپکاتی... اب وہ مری روڈ کراسنگ پر اُس چائے خانے تک نہیں آتی تھی جہاں اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی کیونکہ اُسے شک تھا کہ سڑک کے پار جو ورکشاپ ہے وہی ہے جہاں سے اُس کا خاوند اپنی کار کی ٹیوننگ اور سروسنگ کرواتا ہے.. کوئی ایک سامنے سے آنے والی کار اُسے نروس کر دیتی اور وہ سن شیڈ نیچے کر کے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتی.. چنانچہ جس طور اُس نے بارہ کہو کی پہاڑیوں میں وہ چٹان اور اُس کا تنہا ماحول دریافت کیا تھا اسی طرح اسلام آباد میں اُس نے مرگلا روڈ کے اُس ٹی جنکشن کو بے حد محفوظ قرار دیا جس کے دائیں

ہاتھ پہ آئی ایس آئی کی رہائش گاہیں اور فارن آفس ہوسٹل تھا... مرگلا روڈ پر بھی زیادہ تر ریٹائرڈ بیوروکریٹس کے بنگلے تھے اور وہ صبح کی سیر کے بعد کم ہی باہر آتے تھے.. ان بیوروکریٹس کی زندگی بھر کی عادت کہ سر اونچا کر کے ناک کی سیدھ میں دیکھنا اور عوام الناس کو اپنی ایک نگاہ کے قابل بھی نہ سمجھنا اُس کے لئے بے حد مفید تھا... وہ کسی اور کو پہچاننے کی بجائے خود پہچانے جانے کے عادی تھے چنانچہ یہی مقام اُن کے لئے محفوظ اور مناسب تھا.. بلکہ صرف اس کے لئے مناسب تھا کیونکہ خاور کو بارہ کہو کے گھر سے نکل کر خصوصی طور پر اسلام آباد آنا پڑتا.. یہاں وہ مرگلہ روڈ پر ٹریک تھری کی پارکنگ لاٹ میں کار کھڑی کر کے ٹی جنکشن کے قریب اُس کا انتظار کرتا... یہاں سے وہ دونوں پھر بارہ کہو کے لئے روانہ ہو جاتے اور شام کو یہیں واپسی کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ اپنی کار میں سوار ہو کر اپنے گھر لوٹ جاتا.. گرے سوزوکی مرگلہ روڈ سے نیچے اُتر کر بائیں جانب میریٹ ہوٹل کے پہلو میں سے نکل کر ٹیلی ویژن سٹیشن کے کونے میں پہنچ کر پھر دائیں ہاتھ مڑ جاتی.. پارلیمینٹ ہاؤس اور پریذیڈنٹ ہاؤس... شارع دستور پر.. اور وہ چپ بیٹھی ایک اعصابی بے چینی کو دباؤ سگریٹ کے کش لگاتی خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہتی.. جونہی وہ مری روڈ میں داخل ہوتے تو اُسے احساس ہوتا کہ وہ اسلام آباد کی گرفت میں سے نکل آئے ہیں اور اُس کا ذہنی تناؤ قدرے کم ہو جاتا.. صرف مری روڈ سے بارہ کہو کی آبادی میں داخل ہوتے ہوئے اُس کی اُنگلیاں پھر سے کپکپانے لگتیں اور جونہی وہ سملی ڈیم روڈ کو چھوڑ کر پہاڑیوں کے اوپر اپنی پناہ گاہ کے قریب پہنچتے وہ بالکل نارمل ہو جاتی اور پہلی بار اُس کی جانب دیکھ کر اپنے گوگلز اُتار کر مسکراتی ہوئی "ہیلو" کہتی اور پھر اپنی بستر کی چادر نما شال کو اُتار کر اُسے پچھلی نشست پر پھینکتے ہوئے کار سے باہر آجاتی..

اس مقام کو وہ اپناز یروپوائنٹ بھی کہتی..

چٹان کی کوکھ میں تازہ سینڈوچ اور مشروبات ہمیشہ موجود ہوتے..

خاور کو بھی اس مقام کی عادت ہو گئی تھی.. وہ چٹان کی ہر رگ کو پہچانتا تھا' اس کا سایہ سورج ڈھلنے سے کس جھاڑی کی قربت میں سب سے پہلے رینگتا ہے اور اُس جھاڑی کے نیچے جس جنگلی چوہے کا بل ہے اُس نے پچھلی مرتبہ کی نسبت کتنی مٹی کھود کر بل کے باہر ڈھیر کی ہے.. پہلے روز اُس نے جو طویل نکونی دُم والا کرلا دیکھا تھا وہ اب بھی عین اُس وقت

پہ جھاڑیوں میں سے برآمد ہو کر سڑک پار کر کے دوسری جانب گھاس میں روپوش ہو جاتا تھا.. یہاں تک کہ اُسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں سے نیچے نظر آنے والی سملی ڈیم روڈ پر جو کاریں گزرتی ہیں اُن میں کونسی مقامی لوگوں کی ہیں اور باقاعدگی سے دکھائی دیتی ہیں اور کونسی سملی جھیل پر پکنک کے لئے جانے والوں کی ہو سکتی ہیں..

اُس مقام کی طرح خاور کو اس بے جواز اور بے رمز تعلق کی بھی عادت ہو گئی..

لیکن اُسے اُس کی بے نامی اور غیب سے ایک آسیب کی طرح چادر میں لپٹی ہوئی ظاہر ہونے کی عادت نہ ہوئی..

ایک روز جب اس نے اپنی کانونٹ اخلاقیات کے تحت شرمندگی سے آنکھیں جھکاتے ہوئے چھنگلی کھڑی کر کے اپنی اشد ضرورت کی نشاندہی کی اور پھر چٹان کی ڈھلوان میں جو چند جھاڑیاں تھیں اُن میں روپوش ہو گئی تو اُس نے ایک بے حد معیوب حرکت کی لیکن وہ رہ نہ سکا.. خاور نے فوراً اگلی نشست پر پڑے ہوئے اس کے ہینڈ بیگ کو کھول کر اُس کی تلاشی لی.. اس احتیاط کے ساتھ کہ جونہی وہ جھاڑیوں میں سے نمودار ہو گی اس کے کار تک پہنچنے سے پہلے پہلے وہ بیگ کو بند کر کے اگلی نشست پر رکھ دے گا.. بیگ میں کوئی ایسا کارڈ کوئی یوٹیلیٹی بل' کوئی ایسی چٹ نہ تھی جس سے اُس کے نام' پتے یا فون نمبر کا سراغ ملتا... میک اپ کا مخصوص الابلا سامان' الائچی اور سونف کے دو پیکٹ' ہیروں کے دو بندے جو شاید اُسے ملنے سے پیشتر وہ اُتار لیتی تھی۔ اور دو تین ترے مڑے نسخے' کچھ کیپسول اور گولیوں کے چند پتے..

اُن کی ملاقات کا دن اور وقت اور مقام طے تھا لیکن روزانہ ایک مخصوص وقت پہ فون کی گھنٹی بجتی وہ چونکا اُٹھاتا تو دوسری جانب سے اُس کی ہنسی کی آواز آتی اور وہ فون بند کر دیتی.. یہ اُس کی مسلسل موجودگی کی اطلاع تھی..

خاور کے بدن کی ہڈیاں اور اعضاء موسموں کی بہت طویل مسافت میں سے گزرے تھے' اگرچہ اُن میں اب اعتدال نہ تھا... اُنہیں کسی بھی نسوانی بدن سے ملاپ کئے دس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اسکے باوجود اُسے قریب پا کر.. اور وہ اب بھی ایک پرکشش عورت تھی' پرانی وائن کی طرح گہرا اور تجربہ کار نشہ دینے کے قابل.. لیکن اُس کے اعضاء اُس کی قربت میں بھی کسی بھی جنسی رد عمل سے دوچار نہیں ہوتے تھے.. اُس کی چاہت یا حصول کے لئے اُن میں کہیں بھی حرکت نہ ہوتی تھی.. وہ لاتعلقی سے بیٹھا

رہتا' برابر میں کھڑا رہتا' بارہ کہو کے پھیلے ہوئے منظر کو تکتا اُس کی باتیں سنتا رہتا.. اپنے لئے اُس کی قدیمی محبت کے قصے سنتا رہتا اور مسکراتا رہتا... اگرچہ دھوپ کی تیزی میں جب وہ سوئٹر اُتارتی تو اُسکے پسینے کی گرم اور گیلی مہک اُسے چند لمحوں کے لئے پریشان کر دیتی.. جنسی حوالے سے نہیں بلکہ یہ ایک یادداشت تھی ایک سندیسہ تھا کہ کبھی ایسے وقت تھے جب ایسی مہک اُس کے لئے اجنبی نہ تھی..

وہ بھی پہلے روز کے بعد اُس کے گھر کے آگے سے اُس کا حوالہ دیئے بغیر گزر جاتی..

شاید اُس روز مری میں برفباری ہوئی تھی... بارہ کہو کی پہاڑی کو اُس سرد ہوا کا سامنا تھا جو براہ راست وہاں سے آرہی تھی... آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے اور دھوپ بجھ چکی تھی.. سردی کی شدت بہت بڑھ گئی.. اُس نے حسبِ عادت کاٹن کے شلوار کُرتے کے ساتھ نیلا بلیزر پہن رکھا تھا.. اور یہ کافی نہ تھا.. وہ اپنے آپ پر جبر کرتا رہا اس یکدم برف ہو جانے والی ہوا کو برداشت کرتا رہا اور پھر اُس کے دانت بجنے لگے اور وہ بری طرح کپکپانے لگا.. شدید موسموں کو سہار جانے کے دن گزر چکے تھے اور وہ اُن کے آگے بے بس ہو چکا تھا..

"آر یو آل رائٹ؟" وہ اُس کی حالت دیکھ کر فکر مند ہو گئی "تم کار میں آجاؤ"

کار میں بیٹھ کر اُس نے ہیٹر آن کر دیا لیکن اُس کی کپکپی کسی طور تھمتی نہ تھی اور شرمندہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے قابو میں لانے سے قاصر تھا "آئی ایم سوری.. لیکن جس طرح تم کہا کرتی ہو کہ.. آئی کینناٹ ہیلپ اِٹ"

"تم سوئٹر کیوں نہیں پہنتے.." اُس نے اُسے ڈانٹا "تم اب اتنے جوان نہیں رہے جتنے کہ تھے.."

"میں اچھی طرح جانتا ہوں.. لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہوا یکدم ناقابل برداشت ہو جائے گی.." کار کے اندر ہیٹر کی گرمی نے ایک آسودگی کو جنم دے دیا تھا لیکن وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے کپکپاہٹ پر قابو پانے میں ناکام ہو رہا تھا..

"تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے.." اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی گردن پر اپنی لرزتی ہوئی اُنگلیاں رکھ دیں.. اور کھسک کر اُس کے قریب آگئی "کم از کم میرے لئے تمہیں اپنا

خیال رکھنا چاہئے.."

مہنگی سلک کا لباس ہاتھ لگانے سے اُس کے بدن پر سے کھسکتا تھا.. اور اُس کے نیچے جو مسام تھے وہ پسینے سے بھرتے تھے اور اُنگلیوں کے نیچے جو لباس آتا تھا گیلا ہوتا چلا جاتا تھا.... وہ اُسے ایک بچے کی طرح تھپک رہی تھی' دلاسے دے رہی تھی چوم رہی تھی اُس کے لرزتے بدن کو تھام رہی تھی.. اپنی ناک اُس کی سرد گردن پر رگڑتی تھی اور اُس کے سینے تک لے آتی تھی جس کے سفید بالوں کی جڑوں میں سے بھاپ سی اُٹھتی تھی پسینہ پھوٹتا تھا... کار کے ہیٹر کی گرمی بے وقعت ہو گئی تھی.. اُس کے منجمد اعضاء ایک مدت کے بعد تحرک سے آشنا ہو رہے تھے.. جیسے وہ اب تک کسی ڈیپ فریزر میں پڑے تھے اور اب اُنہیں مائیکرو ویو اوون میں رکھ کر بٹن دبا دیا گیا ہو اور اُس کی پلیٹ پر گھومتے برسوں کی جمی برف لمحوں میں پگھلتی جاتی تھی.. غلافی آنکھوں میں سے لگاتار بہتے آنسو رخساروں پر پھیل کر اُنہیں تادیر گیلا نہیں رکھ سکتے تھے' اُن کی گیلاہٹ لمحوں میں خشک ہو جاتی تھی.. جیسے سردیوں میں نل کے تازہ پانی سے بھاپ اُٹھتی ہے...

اُس کی کپکپاہٹ کو افاقہ تھا لیکن یہ اب اُس کے بدن میں منتقل ہو چکی تھی اور وہ بری طرح کانپنے لگی تھی..

"آر یو آل رائٹ؟"

"میں.. میں ٹھیک ہوں لیکن.. تمہیں سوئٹر پہن کر آنا چاہئے تھا.."

خاور نے اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا..

"ڈونٹ ٹچ می..." وہ اپنی بے ترتیبی کو سمیٹتی ہوئی پرے ہو گئی... اس نے پچھلی نشست پر پڑی ہوئی چادر کو ہاتھ بڑھا کر کھینچا اور اپنے آپ کو اُس میں لپیٹنے کی کوشش کرنے لگی.. "ہم میں سے کسی ایک کو ایک سوئٹر کی اشد ضرورت ہے.." لیکن اس کے باوجود وہ ٹھٹھرتی رہی..

"میرا گھر یہاں سے دور نہیں ہے.."

"نہیں..." اُس نے ایک خوفزدہ ہچکی لی "میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں"

"بے شک.. لیکن ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے.."

"میرے گھر..." اُس نے پھر کہا..

"تم مجھے میرے گیٹ کے سامنے ڈراپ کردو.. ٹریک تھری کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی میری کار محفوظ ہے میں کل جا کرلے آؤں گا.."

مونگیا رنگ کے آہنی گیٹ کے سامنے جس کے ایک ستون میں نیلے رنگ کے پلاسٹک کی کال بیل نصب تھی گرے سوزوکی رکی تو اُس کے اندر ایک نم آلود فضا تھی جس کی حدت ڈیش بورڈ' سٹیرنگ اور پوشش میں بھی رچ گئی تھی.. وہ اترا نہیں وہیں بیٹھا اُسے دیکھتا رہا.. اُس کی سفید شال میں جہاں جہاں اُس کے بدن کی کروٹیں تھیں وہ ہولے ہولے لرزش کا پتہ دیتی تھی..

"تم ذرا رُکو... میں اندر سے تمہارے لئے کوئی گرم چیز لے کر آتا ہوں.." اُسنے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا.. باہر جو برف صفت ہوا چل رہی تھی اُس نے کار کے اندرون میں پھیل کر لمحوں میں ہر شے کو بخ کر دیا..

"نہیں میں بھی چلتی ہوں..." وہ خوف کی ایک عجیب گرفت میں تھی۔

"رُکی رہو..." خاور نے ڈانٹ کر کہا "میں ابھی آتا ہوں"

"تو میں بھی آتی ہوں.. میں یہاں تنہا نہیں رہ سکتی.. مجھے ڈر آتا ہے"

گھر کے اندر ڈرائنگ روم میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا... ابھی شام نہیں اُتری تھی لیکن بادلوں کے باعث باہر اندھیرا چھا چکا تھا..

وہ اُس کے کندھوں پر سے جھانکتی جھجکتی اور ایک ایسے بچے کی طرح خوفزدہ جو کسی بھوت بھرے کھنڈر میں آنکلتا ہے اُسکے پیچھے پیچھے چلتی آگئی..

ہر شے ٹھہری ہوئی تھی.. ایک مردہ سکوت میں تھی.. دیواریں' صوفے اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسیاں.. افغانی قالین.. وال کلاک.. تصویریں.. اُس کی بیٹیوں کی اور اُن کے خاوندوں اور بچوں کی... پنکھے.. لیمپ' پردے' ہر شے.. کیونکہ اُن میں سانس لینے والا کوئی نہ تھا.. اور مکینوں کی موجودگی ہی گھر کے سامان کو زندہ رکھتی ہے..

"یہاں تمہاری بیوی کی کوئی تصویر نہیں ہے؟"

"نہیں..."

"کیوں؟"

"اگر میں ابھی تک اُس فلیٹ میں ہوتا تو شاید وہاں ہوتی... میں اس گھر میں اُس کے بغیر آیا تھا.. وہ یہاں نہیں ہو سکتی.. بیٹیوں نے خود اپنی تصویریں فریم کروا کے یہاں رکھی ہیں تاکہ.. میں تنہا محسوس نہ کروں"

"وہ کیسی تھی؟... تمہاری بیوی.."

"میں اُس کی کمی محسوس کرتا ہوں.."

بشیر یکدم گنگناتا ہوا اندر آگیا اور خاور کو غیر متوقع طور پر سامنے کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا.. پھر اُس کی نگاہ سفید شال میں لپٹی خاتون کی طرف گئی جو صاحب کے کندھوں کے پیچھے کپکپا رہی تھی... اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو آئیں.... پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا..

"میں کوارٹر میں بیٹھا ریڈیو سنتا تھا صاحب تو گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو میں نے سوچا ذرا چیک کروں.. کھانا تیار ہے' لگا دوں؟" اور اُس کی نظر اُس خاتون سے ہٹتی نہ تھی جو ٹھٹھری ہوئی لگتی تھی اور شاید وہ رو رہی تھی..

"تم ابھی کافی بنا کر لے آؤ.. جاؤ"

"جی..." جانے سے پہلے اُس نے پھر اُس عورت کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا اور اُس لمحے اُس نے سر ہلا کر کہا "نہیں.. میں کافی نہیں پیوں گی.."

"تم جاؤ بشیر..."

"تم میری وارڈروب کی ہر آئٹم سے واقف ہو.. تمہارے لئے کیا لے کر آؤں.."

"نہیں نہیں.. میں اب بالکل ٹھیک ہوں.. میں تھوڑی سی بیمار بھی رہتی ہوں اس لئے سردی سہار نہیں سکتی... سردی بھی اور بے جا گرمی بھی.." اور وہ ابھی تک ٹھیک نہیں تھی.. سردی سے سمٹی جاتی تھی۔

"تم کچھ نہ کچھ پہن کر جاؤ گی... بے شک اپنے گھر میں داخل ہونے سے پیشتر اسے کوڑے کے ڈرم میں پھینک دینا.. کیا لاؤں؟"

"وہ نیوی بلو سویٹر... جو تم کبھی کبھار اس بلیزر کے نیچے پہنتے ہو.." اُس نے ذرا شرمندہ ہو کر بتایا۔ ڈرائنگ روم میں ہی کھلتا بیڈ روم کا دروازہ تھا جس کے اندر وہ وارڈروب تھی جو اُسے ازبر تھی اور اُسی میں نیلے رنگ کا سویٹر تھا..

وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی..

خاور نے وارڈروب کا دروازہ کھول کر نیلا سویٹر تلاش کیا اور وہ کپڑوں کی بے ترتیبی میں کہیں گم تھا.. مل نہیں رہا تھا.. وہ اس کی پشت سے آلگی "سویٹر سے میری سردی کم نہیں ہوگی"

مہنگی سلک کی قمیض پر خزاں رسیدہ رنگوں کے بھورے پتے بکھرے ہوئے تھے اور ہر پتہ پسینے سے گیلا ہوتا تھا اور اس میں سے ہواڑ اٹھتی تھی.. ہر پتہ سلگتا تھا...

"تم مرزا صاحب جیسے نہیں ہو..." اس کی کپکپاہٹ ختم ہوئی تو اس نے کہا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

اس کی تنہائی کے چپ سناٹے میں وہ بولتی تھی..

سندھ کے سرونوں اور جنگل بیلوں میں جو مور بولتا تھا.. ایسے بولتی تھی..

جیسے اس نے وہ مور کبھی نہیں دیکھا تھا اس پرندے کی شکل سے شناسا نہ تھا جو اس کے بھیتر میں بولتا تھا ایسے وہ بھی نامعلوم تھی.. کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے آتی ہے کہاں جاتی ہے..

روزمرہ کی زندگی کی روٹین میں جب کبھی اس کا خیال آتا تو وہ بے حد الجھن محسوس کرتا کہ اس معمے کے تمام خانے خالی کیوں ہیں.. اور وہ فیصلہ کر لیتا کہ اس تعلق کو جس میں جذباتی وارفتگی نام کو نہیں ختم کر دے گا.. اس کا فون آتا تو وہ نہایت سرد مہری سے بات کرتا.. مصروفیت کے بہانے بناتا.. اس کی ذات میں ذرہ بھر دلچسپی ظاہر نہ کرتا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا.. وہ اسی پرجوش انداز میں باتیں کرتی چلی جاتی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پگھلنے لگتا اور وہ اس سے ملنے کو کہتی تو وہ انکار نہ کر سکتا..

کم از کم وہ چپ سناٹے میں بولتی تو تھی.. ایک اور انسان تھی جس کی رفاقت اُسے اکلاپے سے باہر لے آتی تھی اور اس کی چاہت کا بے محابہ اظہار اس کی مردانہ انا کو کہیں نہ کہیں کچھ تسکین بھی دیتا تھا..

نیلے سویٹر کے ایپی سوڈ کے بعد ان کی گفتگو میں کبھی اس کا کوئی حوالہ نہ آیا.. نہ کوئی معنی خیز جملہ 'نہ کوئی اس شام کو ایک ہی نظر میں بیان کر دینے والی کوئی نگاہ.. اسے شک ہوتا کہ کبھی ایسا ہوا بھی تھا یا نہیں.. صرف تیز دھوپ میں تادیر کھڑے رہنے سے اس کے بدن میں سے جو پسینہ پھوٹتا اور اس کی قمیض کو کہیں کہیں سے گیلاہٹ دیتا تھا اس کی بُو اُسے پہلے سے زیادہ پریشان کرتی..

زیرو پوائنٹ کی بلندی پر ایک اور دوپہر ڈھلی' شام ہوئی اور بارہ کہو اور سید پور کے دیہات پر سردیوں کی ایک اداس دھند گھلی اور سفید ہوتی کچے گھروں 'کھیتوں اور ٹیلوں پر اُتری اور وہیں ٹھہر گئی.. اور اُس میں سے کہیں کہیں بلب ٹمٹمانے لگے.. کار کی ونڈ شیلڈ میں بھی ٹمٹماتے ہوئے وہ اندر آگئے باہر سردی ہو گئی تھی اگرچہ خاور نے اپنا نیلا سویٹر پہنا ہوا تھا..

ان کی ملاقاتوں میں اب کوئی بوقلمونی نہ رہی تھی.. ہر شے ایک طے شدہ ضابطے کے ساتھ بغیر کسی تبدیلی کے جوں کی توں چلتی جاتی تھی.. ٹریک تھری کی پارکنگ میں کار پارک کرنے کے بعد مرگلہ روڈ پر اُس کا انتظار.. کار میں بیٹھتے ہی اُسے سگرٹ سلگا کر دینا.. کار کا اندرون' پوشش کے کپڑے کا رنگ اور ڈیزائن.. اُسی پہلے دن والے ایئر فریشنر کی مہک.. اور وہ بھی اُس کی وارڈ روب سے تقریباً واقف ہو چکا تھا.. اُس کی اُنگلیوں پر اُتری انگوٹھیاں' بریسلٹ.. یہاں تک کہ چٹان کی کوکھ میں سٹور شدہ مشروب بھی وہی اور وہی چکن اینڈ ٹمیٹو سینڈوچ... ان سب کی یکسانیت اس کے حواس پر اثر کرتی تھی... شائد مرد اور عورت کے تعلق میں جنس ایک ایسا جز ہے جو اس یکسانیت کو ریزہ ریزہ کرتا ہے.. لیکن خون سرد مہر ہو تو نسوانی بدن کے بلاوے پر بھی حدت میں آکر خواہش کے سامنے بے بس نہیں ہوتا.. اور زندگی سپاٹ ہو کر ایک مکانکی انداز میں چلتی جاتی ہے.. تعلق ایک ہی سطح پر ہموار صورت میں جاری رہتا ہے' کسی اونچ نیچ سے دوچار نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں اکتاہٹ جنم لیتی ہے اور رفاقت بھی پھر تنہائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے..

گھر واپسی سے پیشتر وہ اپنا آخری سگرٹ پی رہی تھی..

رفاقت جو تنہائی کی شکل اختیار کر رہی تھی اس کے اُلجھاؤ سے تنگ آکر اُس نے کہا "یہ اگرچہ تماشا ہے لیکن اب تک میری سمجھ میں آجانا چاہیے تھا... اور اس کی مدت کیا ہے؟ اس نے کتنی دیر جاری رہنا ہے.. فریدہ' آمنہ... یا نسرین جو بھی تم ہو... تم نے زندگی کے کچے برسوں میں جو ارادہ کیا تھا مجھ سے ملنے کا.. تمنا پالی تھی.. تو وہ سب تو ہو چکا.. اب اس کے آگے کیا ہے؟ تم چاہتی کیا ہو؟"

"تمہیں..."

"یہ میں بہت سن چکا ہوں.. یہ تو کوئی جواب نہیں.."

"میں اپنی اولاد کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ صرف یہی جواب ہے.."

"اور تم جانتی ہو کہ میں اس چاہت میں شریک نہیں ہوں.. یہ یک طرفہ ہے.."

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے.."

"اور میں مرزا صاحب جیسا نہیں ہوں.."

وہ یکدم ٹھٹک گئی.. رنجیدہ ہو گئی جیسے اُسے شدید دُکھ ہوا ہو کہ اُس نے یہ حوالہ کیوں دیا تھا..

"اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے.."

وہ آج صدق دل سے جو مصمم فیصلہ کر کے آیا تھا.. قطعی اور آخری.. وہ بہر حال اُسے سنانا تھا".. جیسے تمہاری کانونٹ کی انگریزی میں ایک اظہار ہے کہ.. جب تک یہ سلسلہ چلا یہ بہت خوبصورت تھا.. لیکن بہر طور اسے کہیں نہ کہیں.. کسی ایک وقت میں پہنچ کر ختم ہونا ہوتا ہے.. تم مجھے فون کر سکتی ہو.. لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب گنجائش باقی نہیں رہی.. ان بے جواز ملاقاتوں کا اختتام ہونا چاہیے.. میں آئندہ تم سے نہیں مل سکتا.."

"لیکن کیوں.. کیوں.." وہ پچھلے ایک گھنٹے سے آنکھیں خشک لئے بیٹھی تھی جو ایک ریکارڈ تھا.. لیکن کیوں.. کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے جھرنے بہنے لگے.. وہ بے تحاشا رونے لگی "لیکن کیوں؟"

"ہر تعلق کی.. ایک جاندار کی طرح.. ایک عمر متعین ہوتی ہے.. اور ہمارے تعلق کی عمر پوری ہو چکی ہے.. میں کتنی دیر تک خلا میں رہ سکتا ہوں.. میں تمہارا نام تک نہیں جانتا.. یہ نہیں جانتا کہ مرزا صاحب اور اپنی اولاد کے بارے میں جو قصے تم سناتی ہو اُن میں حقیقت ہے یا وہ بالکل فرضی ہیں. مجھے نہیں معلوم کہ جس روز تم مجھ سے ملنے آتی ہو وہ ذہنی طور پر معذور لوگوں کے ادارے میں چھٹی کا دن ہوتا ہے.. مجھے کچھ بھی علم نہیں."

"لیکن کیوں.." اس نے کچھ دھیان نہ دیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے..

"اس لئے بھی کہ تم نے مجھے ایک داشتہ کے طور پر رکھا ہوا ہے ڈیم اٹ.. جب بھی تمہیں فرصت ہوتی ہے' تمہارا دل چاہتا ہے.. تمہارے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا.. تمہارے اندر ایک اُمنگ پیدا ہوتی ہے تو تم مجھے اپنے رکھیل کو ملنے کے لئے آجاتی ہو... تم نے واقعی مجھے اسی طرح ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے جس کی تم خواہش رکھتی تھیں... تم اس کا قفل کھولتی ہو' مجھے گلے لگا کر اپنی مجنونانہ محبت کا اظہار کرتی ہو اور روتی ہوئی آنسو بہاتی پھر سے

قفل لگا کر چابی اپنے بیگ میں ڈال کر واپس چلی جاتی ہو... اور اس سارے تماشے میں میرا کوئی اختیار نہیں.. میں اپنی مرضی سے تمہیں فون کر کے اگر میرا جی چاہے تو تم سے ملنے کی خواہش نہیں کر سکتا.. اور میں تمہیں مخاطب کرتا ہوں تو ایک بے جان شے کی طرح.. جیسے ایک جھاڑی کو. گھاس کے ایک تنکے کو مخاطب کرتے ہیں.. کہ میں تمہارا نام تک نہیں جانتا..."

وہ سہمی ہوئی بیٹھی رہی..

اُس کا گریہ موقوف ہو چکا تھا..

گھر لوٹنے سے پیشتر کا آخری سگرٹ کار کی ایش ٹرے میں کب کا مسلا جا چکا تھا..

زیرو پوائنٹ کی بلندی اور اس کی جھاڑیاں اور گھاس اور چٹان سب کے سب تاریکی میں روپوش ہو چکے تھے اور وہ جانور اور رینگنے والے جو زیر زمین تھے منتظر تھے کہ کب وہ کار جو کسی ایک روز اُن کی چھت پر آٹھہرتی تھی اور تاریکی اُترنے تک ٹھہری رہتی تھی اُس کا انجن سٹارٹ ہو.. اُن کے اوپر مٹی اور سنگریزوں کا جو سہارا ہے اُس میں لرزش پیدا کرے اور رخصت ہو جائے اور وہ اپنے تاریک سکوت میں اطمینان سے نیند کر سکیں..

خاور نے جب یہ کہا کہ... میں تمہارا نام بھی نہیں جانتا.. تو اُس کی آواز اتنی بلند تھی کہ وہ کار کے فرش میں سے ہوتی ہوئی مٹی اور سنگریزوں میں سے سرائیت کرتی اُن تک بھی پہنچی جو اپنے تاریک سکوت کی واپسی کے منتظر تھے..

سہمی ہوئی ایک موقوف گریے کے ساتھ اُس نے اپنی غلافی آنکھیں جھپکا کر کہا "تم نے مارلن برینڈو کی فلم "لاسٹ ٹینگو ان پیرس" دیکھی ہے؟" جیسے وہ اپنے کانونٹ لہجے میں ٹماٹو کو ٹمیٹو کہتی تھی ایسے اُس نے برانڈو کو برینڈو کہا...

"ہاں..."

"پیرس میں.. ایک خالی اپارٹمنٹ میں.. فرنیچر... پردوں.. قالینوں وغیرہ سے مبرا بات کرنے سے آوازوں کے گونجتے ہوئے خالی اپارٹمنٹ میں.. برینڈو کی ملاقات اتفاقاً ایک ایسی لڑکی سے ہو جاتی ہے جو اُس کی مانند اپنی رہائش کے لئے ایک اپارٹمنٹ دیکھنے کے لئے آتی ہے..... وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے.. آمنے سامنے ہوتے ہیں.. ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک نوجوان عورت... اور اُن کے درمیان اُس خالی پن اور گونجتی تنہائی میں.. اپارٹمنٹ بلڈنگ کی تیسویں منزل پر جہاں کوئی بستر نہیں.. صرف ننگا فرش ہے' جنسی رشتہ

قائم ہو جاتا ہے.. پھر وہ اُس خالی اپارٹمنٹ میں ملنے لگتے ہیں... جیسے ہم اس الگ اور تنہا مقام پر ملتے ہیں... فلم کے آخر میں برینڈو مر جاتا ہے تو پولیس اُس لڑکی سے پوچھتی ہے... کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟... تو وہ کہتی ہے... میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتی..." وہ چپ ہو گئی..

کار کے باہر گھنا اندھیرا اُترا ہوا تھا اور زیر زمین رینگنے والے منتظر تھے..

"جب میں مر جاؤں گی تو تم بھی یہ کہہ سکتے ہو کہ... میں تو اس عورت کا نام بھی نہیں جانتا.."

وہ اُس عورت کا نام بھی نہیں جانتا تھا جو ہر بار جب بورڈنگ کارڈ کاؤنٹر کے آگے کھڑے ٹکٹ تھامے ہوئے مسافر ایک قدم آگے رکھتے تھے تو وہ ہر بار اُس کی پشت سے آلگتی تھی اور لگی رہتی تھی.. وہ اس بے موقع اور بے خواہش رفاقت سے خوش نہ تھا..

وہ ایک مرتبہ پھر اپنی من مرضی سے آگئی تھی.. پرس میں سے چابی نکال کر کوٹھڑی کا قفل کھول کر اندر آگئی تھی اور اُس کی کمر میں کچوکے دیتی تھی کہ اُٹھو قیدی میں ملاقات کے لئے آئی ہوں.. بارہ کہو کے زیرو پوائنٹ کی حد تک تو ٹھیک تھا کہ وہاں ایک الگ تھلگ روپوشی تھی.. لیکن یہاں ایئرپورٹ کی گہما گہمی اور بھیڑ میں... خلقت کے اژدہام میں جب وہ دیر تک اُس کی پشت سے لگی رہتی تھی تو کسی نہ کسی کو تو احساس ہوتا ہو گا.. کہ یہ جانی بوجھی قربت دو اجنبی مسافروں کے درمیان نہیں ہو سکتی.. یہ خیال اُسے بے آرام کرتا تھا.. اگرچہ وہ بدحواسی کی حد تک احتیاط پسند ہو چکی تھی' اپنے آپ کو ہمیشہ لمبی چادر میں لپیٹ کر گوگلز چڑھا کر آتی تھی لیکن آج معاملہ بالکل مختلف تھا.. شائد وہ اپنے بیٹے کے واسطے سے ایک جواز پیدا کر چکی تھی اس لئے وہ بے خطر ہو چکی تھی..

اُس نے ابھی تک اُس سے کلام نہیں کیا تھا..

پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا..

اُسے خدشہ تھا کہ وہ اپنی اس آزادی کی خوشی میں اُس کے مڑتے ہی اپنی باہیں اُس کے گلے میں ڈال کر اُسے چومنے لگے گی.. اُس سے کچھ بعید نہ تھا..

جس عورت کا آپ نام بھی نہ جانتے ہوں اُس سے کیا بعید ہو سکتا ہے..

خاور کے آگے صرف دو مسافر رہ گئے تھے..

ایک کا بورڈنگ کارڈ بن رہا تھا اور وہ اپنے ہینڈ بیگ کے سٹریپ پر ٹیگ باندھ رہا تھا اور دوسرا شخص اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور اپنے ٹکٹ کو غور سے دیکھتا ایک بار پھر فلائٹ نمبر کا تعین کر رہا تھا..

خاور نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں وہ چپ رہے گا.. لیکن جہاز کے اندر داخل ہوتے ہی نشست پر بیٹھتے ہی وہ اپنے غصے اور ناپسندیدگی کا بند کھول دے گا..

"اوہ انکل..."ایئرپورٹ ہال کی بھیڑ کو بے تابی سے چیرتی ہوئی اپنے شیر خوار بچے کو سینے سے لگائے فرزانہ بیگ...اپنے پہلے بچے کو پیدا کر لینے کے فخر سے دمکتے چہرے کے ساتھ وہ بورڈنگ کارڈ کے حصول کے لئے آہستگی سے رینگتی قطار کی جانب.. اُس کو نظر میں رکھتی لپکتی ہوئی آئی "اوہ انکل جی.. آپ بھی اسی فلائٹ پر جا رہے ہیں؟"

اُس کا دم رُک گیا..

"جی بیٹے.."خاور نے بازو اٹھایا تو وہ اپنی نوخیز چلبلاہٹ سے بھری مسرت میں سیدھی اُس کے سینے سے آ لگی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ بچہ بے آرام نہ ہو..

"تو پھر ہم اکٹھے بیٹھیں گے.. مومن بہت تنگ کرتا ہے فلائٹ کے دوران...ہاں میں نے اس کا نام مومن رکھا ہے.. اچھا نام ہے ناں.. باسط کو تو شرجیل پسند تھا لیکن میں نے کہا باسط یہ کوئی نام ہے لگتا ہے کسی شرارتی جھیل کا نام ہے.."وہ بے تحاشا ہنسنے لگی اور اُسے قطعی احساس نہ تھا کہ آس پاس ایک ہجوم ہے.. اُس کی طرح جو اُس کی پشت سے لگی کھڑی تھی اُسے بھی ایئرپورٹ کی بھیڑ کی کوئی پروا نہ تھی وہ اپنے انکل جی کو سپاٹ کر لینے کی خوشی میں سرشار تھی"اور جب میں نے مومن بحث کیا تو باسط نے بہت مذاق اڑایا' کہنے لگا یہ تو شیخ سعدی کے پھوپھا کا نام ہو سکتا ہے.. نام کے ساتھ داڑھی بھی آ جاتی ہے.. بھلا اتنا سا بچہ اگر مومن ہو جائے تو بے تیغ کیسے لڑے گا.. اچھا نام ہے ناں انکل جی؟"

"جی بیٹے.. زبردست.."

"بس ٹیک آف کرتے ہی بھاں بھاں رونے لگتا ہے اور سب مسافر مجھے بری طرح گھورتے ہیں.. چپ ہی نہیں ہوتا.. تھینک گاڈ آپ بھی اسی فلائٹ پر جا رہے ہیں.. اسے سنبھال لیں گے ناں؟"

اُسی لمحے دوسرا مسافر کاؤنٹر سے الگ ہوا تو وہ ذرا آگے ہوا اور وہ اُسی کی پشت سے

پھر جان بوجھ کر آ گئی بلکہ ایسے لگی جیسے دھکیل رہی ہو۔

"ضرور ضرور.. کیوں نہیں.. تمہارا ٹکٹ کہاں ہے.. ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں گے"

"تم میرے ساتھ بیٹھو گے.."

خاور نے چونک کر پیچھے دیکھا کیونکہ فرزانہ کی چلبلاہٹ میں وہ اُس کی موجودگی کو کسی حد تک بھول چکا تھا لیکن اُس نے اس "تم میرے ساتھ بیٹھو گے.." کی تقریباً ہسٹریائی آواز میں اُسے یاد دلا دیا تھا کہ وہ ہے.. اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور چہرہ ہائی بلڈ پریشر کے کسی مریض کی مانند بے طرح سرخ ہو رہا تھا.. اور ہونٹ کپکپا رہے تھے..

اُسے بہت شتابی سے سوچنا تھا کہ اب اُسے کیا کہنا ہے.. گفتگو کی روانی میں ذرا سا وقفہ صورت حال کو مخدوش بنا سکتا تھا.. "فرزانہ بیٹے.. یہ... میرے ایک دوست کی بیگم صاحبہ ہیں... یہ بھی کراچی جا رہی ہیں اپنا چیک اپ کروانے.. تو... فلائٹ کے دوران یہ بھی نروس ہو جاتی ہیں تو... ہم تینوں ایک ساتھ بیٹھ جائیں گے.."

"ہیلو..."فرزانہ نے انکل جی کے پیچھے کھڑی عورت کو پہلی بار دیکھا..

عورت رو رہی تھی اور اُس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا..

عورت آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی صدر رہی ہو یا اُپلے تھاپنے والی ہو.. کچی عمر کی ہو یا پک کر گلنے سڑنے کے قریب ہو.. ہر عورت کے اندر قدرت کی جانب سے ایک ایسا ریڈار نصب ہوتا ہے جس کی حرکت کرتی سوئی تلے جب ایک اور عورت آتی ہے جو ایک مرد کی قربت میں ہو اور وہ مرد اُس کے لئے محض ایک مرد نہ ہو تو ریڈار سکرین پر خدشے کی بیپ بیپ بار بار روشن ہونے لگتی ہے..

یہ غلافی آنکھوں والی عورت محض انکل جی کے ایک دوست کی بیگم صاحبہ نہ تھیں..

فرزانہ کی ریڈار سکرین پر جو بیپ بیپ بار بار روشن ہو رہی تھی وہ خاور کے ادراک پر بھی دستکیں دیتی تھیں..

"ہیلو مومن.."اُس نے بظاہر لاپروائی سے بچے کے گال تھپکے "ذرا گرینڈ ڈیڈ کو ایک سمائل تو دو... بھئی فرزانہ یہ مومن تو بہت ہی مومن ہے.. بالکل نہیں مسکراتا.."پھر اُس نے کانپتے ہاتھوں سے بچے کے لب چھوئے.. اور اُس لمحے اُس کے اندر کا سارا انظام اتھل

چنچل ہو رہا تھا اور وہ شدید تناؤ کی کیفیت میں تھا..

فرزانہ اُس کے عزیز ترین اور بچپن کے دوست کی بیٹی تھی.. اُس نے اُسے ایک پرائیویٹ اور مہنگے کلنک کے بے بی کاٹ میں جب پہلی بار دیکھا تھا تو وہ اس مومن سے بھی چھوٹی تھی لیکن لبوں کو ذرا سا بھی چھو دینے سے مسکرانے لگتی تھی.. بیج بونے اور اُس پر کھاد بکھیرنے کا عمل تو وہی تھا جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے لیکن مٹی میں سے جو پہلی کونپل پھوٹی تھی وہ اُس کا چشم دید گواہ تھا.. پھر اُس کے پتے نمودار ہوئے اور اُس کی نظروں کے سامنے وہ پلی بڑھی اور یہ پہلا پھول جو مومن تھا اُس کی ٹہنی پر کھلا.. وہ اکثر چھٹی کے روز اسلام آباد سے اُس کے گھر آ جاتی تھی اور اپنے خاوند کے ہمراہ جو اُس کی چلبلاہٹ سے بہت عاجز آیا ہوا تھا اگرچہ بیوی ہونے کے باوجود اُس سے شدید محبت کرتا تھا.. پورا دن اس کے ہاں بسر کرتی تھی.. اُس کی پسندیدہ ڈشیں گھر سے تیار کر کے ساتھ لاتی تھی اور فریج میں رکھ دیتی تھی اور گھر کی ہر شے کو ایک آڈٹ اکاؤنٹینٹ کی طرح چیک کرتی تھی... انکل جی آپ کا شیونگ فوم ختم ہو چکا ہے.. ٹوتھ پیسٹ کی پچکی ہوئی ٹیوب میں سے آپ برش کرنے کے لئے کیسے مزید پیسٹ نکال لیتے ہیں۔ تکیوں کے غلاف تبدیل نہیں ہوئے.. میں کر کے جاؤں گی.. اور پھر انکل جی... آپ یوں بارہ کہو کے اس ویرانے میں تنہا کیسے رہ لیتے ہیں.. شادی کیوں نہیں کر لیتے.. میری نظر میں کانونٹ کی ایک ٹیچر ہیں.. بہت ہی پیاری.. اُن کی بھی شادی نہیں ہو سکی.. تو انکل جی..."

اُس کی نشست کھڑکی کے ساتھ تھی..

خاور درمیان میں تھا..

اور فرزانہ راہداری کی جانب والی نشست پر بیٹھی بظاہر مومن میں مصروف تھی۔

لیکن اُس کے اندر ایک عورت کا حسی نظام مسلسل ٹک ٹک کرتا چل رہا تھا... وہ ایک بچی سے ایک شادی شدہ عورت.. اور ایک بچے کی ماں بن چکی تھی اور وہ دیکھ سکتی تھی کہ یہ عورت جو بورڈنگ کارڈز حاصل کرنے والوں کی قطار میں انکل جی کی پشت سے لگی کھڑی تھی تو کچھ زیادہ ہی لگ کر کھڑی تھی.. اور جب انکل جی کو دیکھتی تھی.. اینڈ مائی گاڈ شی ہیز بیوٹی فل ہیزل آئیز... عجیب بنفشی سی بھری بھری آنکھیں ہیں.. تو ایسے تو ہرگز نہیں دیکھتی تھی جیسے ایک عزیز دوست کی بیوی دیکھتی ہے.. کسی اور طرح دیکھتی تھی..

وہ دم رو کے درمیان کی نشست پر بیٹھا تھا..

ایئر ہوسٹس ٹیک آف سے پیشتر آکسیجن ماسک اور ایمرجنسی کی صورت میں نکلنے کے راستوں کی نشاندہی رٹے رٹائے جملوں سے کرتی ایک پتھریلی مسکراہٹ سے اشارے کرتی ہوئی بتا رہی تھی اور وہ دم رو کے اس ناپسندیدہ اور غیر متوقع صورت حال کے سناٹے میں آیا ہوا بیٹھا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک آکسیجن ماسک اُس کے سامنے آ گرے اور وہ اُس میں سانس لے سکے.. اپنے آپ کو پوشیدہ کر لے..

وہ شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان میں پھنس جانے والی ایک کشتی کی طرح تھا..

شیطان کھڑکی سے ناک لگائے... جب کہ جہاز نے ٹیک آف کے لئے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا تھا.. بظاہر بے دھیانی اور لاپروائی میں ٹریک پر کھڑے اُن غیر ملکی جہازوں کو دیکھتا تھا جو لینڈ کر چکے تھے یا اُن کے بعد اُڑنے کے لئے اپنی باری کے انتظار میں تھے..

اور نیلا سمندر... راہداری کی نشست پر اپنے مومن میں مگن.. بظاہر مگن.. گہرا اور پُرسکون تھا.. اگرچہ اندر ہی اندر شک شبے کے تلاطم میں تھا..

واقعی جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی مومن نے صبر کا دامن چھوڑا اور اپنے بالشت بھر وجود سے کہیں توانا اور دلدوز ہوں آں ہوں آں بلند کر کے رونا شروع کر دیا..

فرزانہ نے مسکرا کر کندھے جھٹکے.. کہ میں نہ کہتی تھی.. اور اُسے اُٹھا کر انکل جی کی گود میں ڈال دیا..

خاور نے اُسے بہلانے پرچانے کے تمام آزمودہ طریقے آزمائے.. پیٹھ پر تھپکیاں دیں... اُس کے اُسترا شدہ سر پر پیار سے ہاتھ پھیرے... بہتیرا پچ پچ کیا... بازوؤں میں جھلایا لیکن مومن کا واشدہ منہ بند نہ ہوا..

اور واقعی اُس کے رونے کی والیوم اتنی بلند اور بے مہابہ تھی کہ جہاز میں سوار تمام مسافر اُس کی مسلسل ہوں آں ہو آں سے متاثر ہونے لگے..

"اِس باسٹرڈ کو واپس کرو..." وہ اُس کے کان کے قریب منہ لا کر ایک ناگن کی طرح سرسراتی آواز میں غصے سے بولی..

"شٹ اپ..." اُس نے آہستہ سے دانت بھینچتے ہوئے کہا..

بہت آہستہ سے اُس نے یہ کہا لیکن فرزانہ کے عورتی نظام نے اس آہستگی کو دو چند کر کے اُس تک پہنچا دیا...

"مومن کو مجھے دے دیں انکل جی..."

"نہیں... اسے مجھے دے دو... آئی لو چلڈرن.." اُس نے فرزانہ کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو پرے کیا اور خاور کی گود میں سے مومن کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پچکارنے لگی.. "کم آن بے بی سویٹ... مائی کیوٹ لٹل بے بی.. آئی ول سنگ یو اے لا بائی.. چپ میرے سویٹ..." خاور دہشت زدہ ہو کر اُسے دیکھتا رہا.. اُس سے کچھ بعید نہ تھا.. وہ اس بچے کا گلا بھی گھونٹ سکتی تھی.. مومن کا منہ بند نہیں ہو رہا تھا..

وہ اپنی ناتواں آواز میں زمین سے جدا ہو کر کم آکسیجن والے ماحول سے مفاہمت نہیں کر پا رہا تھا.. اُس کے پھیپھڑے متحمل نہیں ہو رہے تھے اور وہ روتا چلا جا رہا تھا..

تب اُس نے نہایت آہستگی سے اور ملائمت سے صرف ایک لفظ کہا "چپ..." اور وہ چپ ہو گیا۔ اُس شیطان کے سینے سے پھوٹتی یا اُس لفظ "چپ" میں کوئی ایسی دھمکی تھی جو صرف اُس کا کچا وجود سمجھ سکتا تھا.. وہ بالکل چپ ہو گیا۔

"تھینک یو آنٹی.." فرزانہ نے انکل جی کو بائی پاس کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اپنے مومن کو وصول کیا لیکن اُس کے دمکتے ہوئے الہڑ نوخیز چہرے پر پہلی بار ڈر کی ایک دراڑ آئی.. "تھینک یو"۔

وہ دم رو کے شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان دم روکے... کمر بالکل سیدھی رکھے چوکنا سا ہو کر بیٹھا رہا کہ اب دیکھیے کدھر سے وار آتا ہے.. اور جہاز اپنی مطلوبہ بلندی حاصل کر کے ایک ہلکی گونج کے ساتھ ساکت ہو چکا ہوتا محسوس ہوتا پرواز میں تھا.. شیطان جیسے اُس کی موجودگی سے بے نیاز کھڑکی کے دبیز بیضوی شیشے سے ناک چپکائے باہر دیکھنے میں مگن تھا.. اور سمندر اپنے بچے کو باہوں کے حصار میں لئے اُس پر جھکا تھا..

خاور نے پہلی بار بھرپور سانس لیا جس میں اطمینان تو تھا لیکن احتیاط زیادہ تھی... اُسکے ماتھے پر ایئر کنڈیشننگ کا چنداں اثر نہ ہوا تھا اور وہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا.. اُس نے ٹشو کو ماتھے پر رکھ کر پسینے کے جذب ہونے کا انتظار کیا.. لیکن اُس کے سوتے خشک نہ ہوتے تھے کیونکہ باہر

کے اطمینان نے ابھی اُس کے ڈرے ہوئے اندر تک رسائی حاصل نہیں کی تھی... سر کے عین اوپر سروس لائٹ کے بٹن اور ریڈنگ لائٹ کے درمیان میں سے ایک گول بنسری کے منہ ایسے سوراخ میں سے خنک ہوا خارج ہو رہی تھی جو اُس کے بائیں کندھے پر پھونک مارتی بکھر رہی تھی.. اُس نے بایاں بازو اُٹھا کر اُس گول لاٹو کو دائیں بائیں گھما کر ہوا کا رُخ اپنے چہرے کی جانب موڑنے کی کوشش کی.. کبھی وہ بالکل بند ہو جاتا اور کبھی اُس کی ہوا کسی اور جانب نکل جاتی.. اور اُس لمحے اُس نے اپنے اُٹھے ہوئے بازو میں اُس جگہ جہاں سے وہ بال نہیں صاف کرتا تھا اور اُن میں آیا ہوا پسینہ اُس کی قمیض کو بھگوتا تھا وہاں ایک ناک کا لمس محسوس کیا.. اُس کا ہاتھ وہیں جامد رہا اُس ناب پر اور اُس نے گردن کو ہلکا سا بل دے کر بائیں طرف... کھڑکی کی طرف نگاہ کی.. وہ بالکل خالی تھی لیکن وہاں تک جو نظر جاتی تھی اُس کے راستے میں نفاست سے رنگے ہوئے بال کہیں کہیں اُس ہوا کے زور سے جو گول سوراخ میں سے خارج ہو کر اُس کی ہتھیلی پر پھیلتی بازو سے اُترتی نیچے آتی تھی اُس کے زور سے اُڑتے تھے اور اُن میں شیمپو کی تازگی کی مہک تھی اور اُن کے نیچے کہیں وہ ناک تھی جس کا لمس اُس کی بغل میں محسوس ہو رہا تھا اور ایک گرم ہواڑ کے دو بہاؤ اس ناک میں سے پھنکارتے ہوئے بہتے تھے..

اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اُس کی بغل میں اپنا چہرہ چھپائے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی.

وہ منجمد سا ہو گیا.. "یہ... یہ تم کیا کر رہی ہو؟" جتنی بھی آہستگی سرگوشی اور مدھم پن اُس کی آواز میں آ سکتا تھا... جتنی بھی باگیں وہ کھینچ سکتا تھا اُن کے تقریباً چپ تناؤ میں اس نے کہا..

"اپنا ہاتھ نیچے نہ کرنا..." اُس کے بالوں میں سے ایک بجھی بجھی سسکی نما آواز آئی "پلیز.. تمہیں یہاں پسینہ آیا ہوا ہے.. اور اُس کی بو... یو سمیل ونڈر فل... پلیز.."

باسکٹ بال کے ایک کھلاڑی کی طرح جو بازو اونچا کر کے گیند کو باسکٹ میں ڈالنے کو جاتا ہے تو اُس کی تصویر اُتر جاتی ہے.. وہ وہیں ساکت ہو جاتا ہے... بازو اُٹھائے اُسی حالت میں... اُس نے گردن موڑ کر اپنے سامنے دیکھا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے.. قطار اندر قطار سینکڑوں سر... اُن میں سے کچھ ابھی حرکت میں تھے اور باتیں کر رہے تھے لیکن بیشتر ہیڈ ریسٹ پر ڈھلکے غنودگی میں تھے... وہ دائیں طرف دیکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا.. یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ فرزانہ نے ایک بار بھی اِدھر نہ دیکھا ہو اُس کے دیر تک اُٹھے ہوئے بازو اور اُس

میں گھسے ہوئے سر کا نوٹس نہ لیا ہو.. وہ اُس کی جانب نہیں دیکھ سکتا تھا.. سامنے دیکھتا رہا.. اگر وہ اپنا بازو یکدم نیچے کرتا ہے تو اُس کا سر اُس کے سینے کے ساتھ آ لگے گا.. اُس کے نتھنوں کی گرم پھونکیں بغل میں پھیل کر پسلیوں کو سیڑھیاں بناتیں نیچے تک اتر کرتی تھیں اور وہ بے حجاب سا محسوس کرتا تھا..

وہ اپنے موومن میں مست تھی... کن اکھیوں سے بھی اُدھر نہیں تکتی تھی جدھر انکل جی ایک مجسمے کی طرح بازو اُٹھائے نہ اب اس ناب کو گھماتے تھے اور نہ اُس پر سے انگلیاں ہٹاتے تھے اور کھڑکی کا بیضوی شیشہ بالکل خالی تھا اور اُس کے پار اُبلتے ہوئے بادل دھیرے دھیرے پیچھے رہتے جاتے تھے اور اُن کی جگہ کوئی نئی شکل ظاہر ہوتی چلی جاتی تھی.... شورلی یہ آنٹی انکل جی کے کسی دوست کی بیوی نہیں ہیں اور شورلی وہ بیمار ہیں ورنہ... یوں تو نہیں کرتے جو وہ کر رہی ہیں.. فرزانہ کا چہرہ شرمندگی سے پھٹکنے لگا.. جیسے اُس نے انکل جی کے بیڈ روم میں جھانک لیا ہو.. لیکن وہ موومن میں مگن رہنے کی اداکاری کرتی رہی..

"پلیز ڈونٹ ڈو دس..." وہ جتنی نرمی سے کہہ سکتا تھا اُس نے بیٹھی ہوئی آواز میں درخواست کی..

"اوکے.. تھینک یو.." وہ پیچھے ہو گئی اور خاور نے فوراً بازو نیچے کر کے اپنی گود میں سمیٹ لیا اور دوسرا ہاتھ اُس پر رکھ دیا..

اُس کی بغل میں ابھی تک گرم ہواؤں کی پھونکیں بکھرتی تھیں اور جہاں اُس کی ناک تھی وہاں اُس کی موجودگی کی مُہر ثبت تھی..

وہ اگر کر سکتا تو واک آؤٹ کر جاتا.. ایمر جنسی ڈور کا ہینڈل گھما کر باہر کود جاتا.. وہ اتنا شرمسار تھا.. فرزانہ تو ابھی تک اپنے موومن میں مگن تھی مگر راہداری کے پار جو نشستیں تھیں اُن میں سے ایک کا مسافر اس کھیل کو اپنی نظر میں لا چکا تھا اور ایک پیپنگ ٹام کی طرح اُن دونوں کو کن اکھیوں سے دیکھتا تھا.....

وہ کیا سوچتا ہوگا.. ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے سے نسبتاً کم عمر ایک خاتون کے ساتھ یوں کھلے عام اٹکھیلیاں کر رہا ہے.. یہ اپنی عمر نہیں دیکھتا اپنے سفید بالوں کا کچھ قیاس نہیں کرتا... اس کی طبع ابھی تک حرص سے باز نہیں آئی...

اُس نے کبھی بھی اپنے آپ کو اس قدر نادانی کے اشتباہ میں نہیں ڈالا تھا.. کیونکہ اُس

کے مشاغل کبھی بھی ایسے نہیں رہے تھے جن میں اس نوعیت کی صورت حال میں گھر جانے کا امکان ہو.. اُس نے ایک ستھری اور معاشرتی طور پر بے عیب زندگی گزاری تھی.. وہ جنسی مقاصد کے حصول کے لئے ڈھیٹ نہیں ہوا تھا.. اُس کے ایسے جاننے والے بھی تھے جو جوانی کے ایام میں.. اور کچھ اُس کے ڈھلنے کے بعد بھی... کوئی دیوار پھاند کر کسی ترغیب تک پہنچنے کی کوشش میں پکڑے گئے اور خوار ہوئے... سینما ہال کے کسی بوکس میں مشغولیت کے عالم میں دھرے گئے... کسی گھر کے اندر گئے تو بیوی کی بجائے اُس کے خاوند کو منتظر پایا... اور وہ ان رومانوی مہم جوئی کے قصوں کو بغیر کسی شرم کے فخر سے بیان کرتے تھے لیکن اُس کا دل اس خیال سے ہی ڈوب جاتا تھا اُسے اپنے بدن کی لرزش پر اختیار نہیں رہتا تھا جب وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو کیا ہوتا..

اُس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ نادانی کا یہ اشتباہ.. عمر کے اس حصے میں ایک پرواز کے دوران.. اُسکے بہترین دوست کی بیٹی کے سامنے یوں مشتہر ہوگا..

اُس کا خیال تھا کہ یہ انتہا تھی..

"ٹیک آف یور شوز..." وہ پھر اُس کے کان کے قریب ہوئی..

"کیا.." اُس نے چونک کر کہا..

راہداری کے پار وہ پیپنگ ٹام اُن پر نظر رکھے ہوئے تھا اگرچہ فرزانہ انکل جی کے ان ایکسپلائٹس پر حیران تھی.. وہ اس ٹائپ کے تو نہ تھے.. اور میں ہمیشہ بہت اصرار کرتی تھی کہ انکل جی آپ دوبارہ شادی کیوں نہیں کر لیتے.. اس لئے وہ تھوڑی سی مطمئن اور خوش بھی تھی کہ بالآخر اُن کا رجحان ہو گیا ہے.. آنٹی دیکھنے میں بری نہیں ہیں اگر یہ غیر شادی شدہ ہیں تو..

"تم اپنے شوز اُتار دو ناں.." اور اس فقرے کی ادائیگی میں نہ وہ فاتر العقل تھی اور نہ ہی اس پر حکم چلاتی تھی بلکہ ایک باندی کی طرح لجاجت سے اور مؤدب ہو کر درخواست کرتی تھی کہ..

"لیکن کیوں؟"

"پلیز..."

بحث کرنے کی گنجائش نہیں تھی.. بحث کے لئے بولنا پڑتا ہے اور وہ نہیں بولنا چاہتا تھا.. چپ رہنا چاہتا تھا.. یہ ایک ایسی ضد تھی جس کا جواز سمجھ میں نہ آتا تھا.. لیکن اس

میں حرج بھی نہ تھا.. خاور نے دائیں پاؤں سے بائیں پاؤں کے مکیشن کو نیچے دیکھے بغیر ایڑھی سے پیچھے کر کے اُتار دیا..

اُس کا ننگا پاؤں آگے آیا اور اُس کی جراب کو ٹٹولتا اُسے اپنے انگوٹھے اور بڑھے ہوئے ناخنوں والی اُنگلیوں سے کھرچتا اُس کے تلوے تک چلا گیا..

خاور دم بخود سامنے دیکھتا رہا..

اُس کے ننگے تلوے اُس کے پاؤں کے اُبھار کو آہستہ آہستہ چھوتے رہے..

"جراب بھی اُتار دو... پلیز.." ایک پھنکار ایسی سرگوشی میں اُس نے ایک اور درخواست کی.. اور اس میں بھی ایک باندی کی عاجزی اور منت تھی..

"نہیں..."

"پلیز.."

"نہیں..."

"اگر تم جراب نہیں اُتارو گے تو آئی پرامس یو.. کہ میں شور مچادوں گی.. کہ یہ شخص مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہا ہے.." وہ ایک باندی سے ایک مالک میں بدل گئی

"تو پھر تم کیا کرو گے.."

اُس سے کچھ بھی بعید نہ تھا.. وہ یہ بھی کر سکتی تھی..

اُس کی طبیعت کا یہ پہلو پہلی بار سامنے آرہا تھا.. زیرو پوائنٹ کی بلندی پر وہ ہمیشہ اُس کا کہا مانتی تھی..

وہ اُس کوٹھڑی میں تھا جس میں اُس نے اُسے قید کر رکھا تھا... اُسے کچھ پرواہ نہ تھی کہ اس کوٹھڑی میں کچھ مسافر بھی ہیں.. اُس کے قریبی دوست کی بیٹی بھی ہے اور وہ کچھ لوگوں کی نظروں میں بھی ہیں..

"جراب اتار دو... پلیز.." اُس کی آواز میں ایک مستی تھی جس کے آگے انکار کا بند نہیں باندھا جا سکتا تھا..

خاور نے جھک کر.. انگوٹھے سے اڑس کر جراب نیچے کی اور اُتار دی.. جیسے ایک طوائف گاہک کے حکم پر کپڑے اُتارتی ہے..

اُس کا پاؤں... ایک ملاپ کی گرمی میں آئے ہوئے مست سانپ کی مانند رینگتا

ہوا اُس کے ننگے پاؤں پر آیا اور اُس کے لبوں سے آسودگی کی ایک سسکی... بھینچے ہوئے لبوں سے.. نکلی.. اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور اُس کی غلافی آنکھیں بند ہونے لگیں

"تھینک یو"

بلی کے سامنے آئے ہوئے ایک ششدر کبوتر کی طرح... حواس باختہ' منجمد اور ساکت.. سناٹے میں آیا ہوا شرمندگی اور بے بسی میں آیا ہوا وہ سامنے دیکھتا رہا..

"تھینک یو.." اُس نے پھر کہا "تم اپنی جراب پہن سکتے ہو"

اُس میں شدید غصے کا مادہ بہت کم تھا.. صرف چند بوندیں تھیں.. جو برسوں بعد برستی تھیں اور وہ بھی اکا دکا.. لیکن لینڈ کرنے کے بعد.. جہاز سے اُترتے ہوئے' لاؤنج کی جانب ٹریک پر چلتے ہوئے جب فرزانہ بہت پیچھے رہ گئی تھی اور وہ اُس کے برابر میں اُس کے بدن کو مس کرتی دھکیلتی چلی آرہی تھی یہ چند بوندیں سیلاب ہو گئیں "تم ایک شرمناک عورت ہو.. میں آج کے بعد کبھی بھی تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا.."

"آئی ایم سوری..." وہ چلتے ہوئے اُس کے ساتھ لپٹتی گئی..

"کبھی نہیں.. یہ میرا وعدہ ہے.."

"مجھے معاف کر دو.." اُس کے بدن کی' اُنگلیوں کی لرزش اُس کے قابو میں نہ آتی تھی اور وہ روتی چلی جاتی تھی.. "پلیز پلیز.. ڈونٹ ڈو دس ٹو می.. میں ابھی تمہارے پاؤں پڑ جاتی ہوں.."

اور وہ جھکی لیکن وہ آگے نکل گیا..

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں.." وہ بھاگتی ہوئی اُس کے برابر میں آگئی" آئی سویئر... مجھے پتہ نہیں تھا.. آئی ایم میڈ.. تمہیں پتہ ہے میں پاگل ہوں.. پلیز.."

"کبھی نہیں..."

ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی نہ اُس نے فرزانہ کی جانب دیکھا اور نہ اُسے دیکھا اور کھولتا ہوا پارکنگ لاٹ میں منتظر ایڈورٹائزنگ کمپنی کی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا..

بارہ کہو کے گھر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتے بجتے گھگھیا جاتی.. وہ چونکا اُٹھاتا اور اُس کی

پہلی سسکی سن کر واپس رکھ دیتا..

کبھی اُدھر سے بالکل خاموش ہوتی تو وہ بار بار ہیلو کہہ کر پوچھتا "کون؟"

"پاگل خانہ.." اُدھر سے جواب آتا اور وہ فوراً فون بند کر دیتا..

اُس کے موتگیا رنگ کے گیٹ کے پہلو میں ستون پر نصب پلاسٹک کی بیل بھی اُس کے ہاتھ سے دبتی رہتی.. اور ہدایت کے مطابق بشیر گیلے رخساروں اور بڑی بڑی آنکھوں والی روتی ہوئی بیگم صاحبہ سے کہہ دیتا کہ صاحب تو گھر پر موجود نہیں.. حالانکہ اُس کی کار پورچ میں کھڑی نظر آجاتی تھی..

یہ سلسلہ بہت دنوں تک.. کئی مہینوں تک جاری رہا.. اور پھر یکلخت بند ہو گیا..

کچھ عرصہ مکمل خاموشی رہی اور پھر وہ کبھی کبھار فون کر کے صرف یہ کہتی "پلیز فارگوی" اور پھر بند کر دیتی۔

کونج دشت ویران تھا..

سرسوتی کی مانند خشک ہو چکا تھا..

لیکن سرسوتی کی پاروشنی اب پنچھی کے رُوپ ڈھنگ میں سندھ کے کناروں پر آکر بس چکی تھی اور اپنا جھگا نیچے نہیں کرتی تھی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ابھی تک سالم ہے' ہزاروں برس گزرنے کے باوجود اُس کی ایک چھاتی دلو رائے کے کھنڈروں میں سے ظاہر ہونے والی مورتی کی مانند اکڑی نہیں ابھی تک قائم ہے اور شائد اُسی بچے کو دودھ پلاتی ہے جو سرسوتی کی خشک ریت پر پیاس سے سکڑتے بدنوں کے ملاپ کا ثمر ہے..

وہ سومرو کے بیج سے پھوٹنے والے بہاؤ کا تسلسل ہے..

سرسوتی خشک ہو چکا تھا..

اور سندھ نے بھی خشک ہو جانا تھا..

کونج دشت اگرچہ ویران تھا لیکن اُس کے نام کی لاج رکھنے کو وہاں ایک غلافی آنکھوں والی کونج ابھی تک کُرلاتی تھی..

کوہ سلمان کے سیاہی میں ڈوبتے سلسلوں کے سائے میں کونج دشت کے وسیع و عریض سناٹے میں صرف ایک کُونج تھی جو کرلاتی تھی... اپنے دیس کا کچھ پتہ نہیں دیتی تھی کہ کہاں سے آئی ہے.. اُس کا آبائی گھونسلا کس جھیل کے سرکنڈوں میں ہے اور وہ اُس میں اپنے بچے چھوڑ کر اس دشت تنہائی میں کیوں اُتر آئی ہے.. صرف اُس کی 'خاور کی متلاشی کیوں ہے.. ایک ایسے پرندے کے لئے گھر بار چھوڑ کر کیوں آگئی ہے جس کے پر جھڑنے کو ہیں' رنگ مدھم ہو رہے ہیں' چونچ ڈھیلی ہو رہی ہے' آنکھیں مدھم پڑتی ہیں' اگرچہ وہ اپنے غیر قانونی

گھونسلے میں اکیلا ہے لیکن اُس کو رفاقت کی خواہش نہیں.. محبت سے آشنا نہیں.. اُس کے لئے وہ اپنا گھونسلا چھوڑ کر کیوں آ گئی ہے.. اُس کی غلافی آنکھیں کیوں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں. کیوں اتار دتی ہے کہ وہ جہاں بھی تھوڑی دیر ٹھہرتی ہے وہاں اُس کے آس پاس پانیوں کے گرنے سے دشت میں گھاس پھوٹنے لگتی ہے.. ایسا کراس ورڈ پزل کیوں ہے جس کے کسی خانے میں کوئی سراغ نہیں جو اُس کی بھید بھری مسافت کا کوئی اتہ پتہ دے کہ وہ کن راستوں سے ہوتی ہوئی اور کیسے کیسے موسموں میں پرواز کرتی بالآخر اس دشت میں پہنچی... راستے میں اُس نے پانیوں کے کن ذخیروں کے کناروں پر اپنے پر سمیٹ کر قیام کیا.. کیسے کیسے ویرانوں میں راتیں بسر کیں یا وہ مسلسل اُڑان میں رہی.. اُس کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور اُس کا نام کیا تھا.. اور اب پھر سناٹے میں چلی گئی ہے..

وہ اُسے.. اُس بے نام مسافت کو مس کرتا تھا..

وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا وہ ابھی تک اُس کوٹھڑی میں ہے یا اُس سے باہر آ چکا ہے جس میں وہ اسے مقفل کر کے چلی جاتی تھی اور پھر حسب آرزو آتی تھی' یہ قفل کھولتی تھی اور اُسے دیکھ لیتی تھی.. وہ اس کوٹھڑی کو بارہ کہو کی پہاڑیوں کے اوپر اپنے زیرو پوائنٹ پر لے جاتی تھی..

وہ اُس کی غیر حاضری کو محسوس کرتا تھا..

اس حیسے کے باوجود کہ اُس نے جواب میں کچھ نہیں کہنا اُس کے اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی خواہش موجود تھی..

اُس کی کوٹھڑی کی قید اُسے الجھن میں اور ناگواری میں مبتلا تو رکھتی تھی لیکن زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنے آس پاس ایک ایسی نامعلوم سی حدت محسوس کی جس کے وجود سے وہ سراسر ناآشنا تھا.. برف کا تو وہ ایک گلیشیر اپنی منجمد ذات کو کائنات کے جماؤ کا ایک حصہ ایک حتمی اور آخری سچ سمجھتا ہے اور اُس انجماد میں مطمئن ہوتا ہے.. اور اس کو اپنے وجود کا جواز سمجھتا ہے اور تب تک سمجھتا رہتا ہے جب تک کہ اُس کے یخ بستہ بدن پر سورج کی کوئی ایک ایسی شعاع جو روزمرہ کی بے حدت کرنوں سے الگ اپنے اندر ایک جدا تپش رکھتی ہے اس پر پڑتی ہے اور یہ خبر کرتی ہے کہ کائنات صرف انجماد کا نام ہی نہیں اُسے پگھلانے کے بھی کچھ سلسلے ہیں.. اور وہی تپش سے سلگتی شعاع اُس گلیشیر کے سدا سے یخ بستہ وجود پر اثر کرتی ہے.. پگھلا کر پہلی بوند کو جنم دیتی ہے اور تب اُس کی منجمد ابدی تنہائی اُس ایک بوند کے

گرنے سے ٹوٹتی ہے اور اُسے عرفان ہوتا ہے کہ جماؤ تا ابد نہیں ہوتا.. میں جو ہوں وہ لکھا نہیں گیا کہ ہمیشہ کے لئے ہوں.. میں تبدیل بھی ہو سکتا ہوں..

غلافی آنکھیں ایک ایسی ہی شعاع تھی.. ایک ایسی ہی کرن تھی..

وہ اُس کونج کی کُرلاہٹ اور غلافی آنکھوں کے سنہری پن کو دھونے والے پانیوں کے باوجود بے اثر رہا تھا.. اُس کے لئے کچھ بھی محسوس نہیں کرتا تھا لیکن شعاع کو.. ایک کرن کو یہ پرواہ نہیں ہوتی.. حساب کتاب کر کے کسی طے شدہ منصوبے کے مطابق متوقع نتیجے کے لالچ میں وہ نہیں اُترتی کہ گلیشیر کے احساسات کیا ہوں گے کیونکہ وہ صرف اپنی حدت کے ہاتھوں بے بس ہو کر اُس پر پڑتی ہے اور اُسے صرف اتنا پگھلا سکتی ہے کہ ایک بوند ٹپکے' اُس کا جمود ٹوٹے اور اُس کی پچھلی تمام حیات کو منفی کر کے اُسے ایک مختلف رُوپ عطا کر دے..

اُس پاگل خانے نے اُسے اپنی من پسند مرضی کی قید میں مقفل تو کر رکھا تھا لیکن اُس کوٹھڑی کے اندر خاور کی منجمد حیات میں پہلی بار ایک کرن داخل ہوئی تھی جس کی اَن چاہی حدت نے اُسے پگھلا دیا تھا.. ایک بوند کے جنم لینے سے ایک گلیشیر وہ نہیں رہتا جو کہ ابد سے وہ تھا.. اور وہ بھی وہ نہ رہا.. جو کہ وہ تھا..

اور اس تبدیلی نے اسے آزردہ اور ناآسودہ کر دیا تھا.. یہ نہیں کہ وہ ابد تک منجمد رہنا چاہتا تھا.. انجماد کا تسلسل اُس کا ذاتی چناؤ تو نہ تھا.. وہ تو آگاہ ہی نہیں تھا کہ حیاتی کے طور طریقے اس سے الگ بھی ممکن ہیں.. آزردگی اور ناآسودگی کا سبب اور تھا.. ایک تاؤ تھا ایک طیش تھا جو اُسے نڈھال کرتا تھا کہ میں جو اس حدت سے ناواقف اور بے خبر تھا اور اپنی لاعلمی میں مطمئن تھا تو اس کرن نے میری برفوں میں سے.. اب جا کر... اتنی مدتوں بعد.. ایک بوند پگھلا کر میری شناخت کے رنگوں کو کیوں بدل دیا ہے.. اب جا کر... عمر کے اس حصے میں.. قربت مرگ میں.. یہ پہلے کیوں نہیں اُتری.. اب جا کر اتری ہے جب میں منزل پر پہنچنے کو ہوں.. سفر کے آغاز پر جب یہ مجھے گرما سکتی تھی.. میرے تن بدن کو حرارت دے سکتی تھی' مسافت میں معاون ثابت ہو سکتی تھی تب تو یہ نہیں اُتری.. اور اب جا کر.. جب پیچھا بہت دور رہ گیا تھا اور آگا نزدیک آ رہا تھا تو یہ اُتری ہے تو اس کی حدّت کا.. پہلی بوند کا کیا فائدہ... میں نے جہاں جانا تھا وہاں پہنچنے کو ہوں تو یہ اب کیوں اُتری ہے..

یہی طیش تھا اور یہی غصہ تھا..

پھر بھی وہ اُس کی غیر حاضری اور فون کے سناٹے کو محسوس کرتا تھا.

ایک سیاہ فام کیپٹن اہاب کی مانند ماماں جعفر اپنی ٹانگ پر ہتھیلی جمائے سندھ کے پانیوں کو اپنی مہین اور کالی بھور آنکھوں سے چھانتا تھا اور اُس سفید و نیل موبی ڈک کی تلاش میں تھا جو اُس کی دوسری ٹانگ چبا کر روپوش ہو گئی تھی..

پکھی نے اپنا جھگا نیچے کر لیا تھا...

کونج دشت میں کرلاتی ہوئی اکیلی کونج کوچ کر چکی تھی.. ریت پر اُس کے پنجوں کے نشان بھی باقی نہ تھے جن سے اُس کا کچھ سراغ مل سکتا.. کوئی نام 'کوئی فون نمبر' اتہ پتہ نہ تھا.. وہ جیسے نمودار ہوئی تھی بغیر اطلاع کے ویسے ہی روپوش ہو گئی تھی..

اوڈیسیس کی کشتی آرگوس کی طرح سرور اور ماماں جعفر کی یہ کشتی نہ کسی سنہری کھال کی تلاش میں سرگرداں تھی اور نہ اس کے سفر کے دوران پانیوں میں سے 'وہ نادیدہ اور سحر خیز جزیرے اُبھرتے تھے جہاں سے سائرنز کے گیت لہروں پر سفر کرتے کشتی کو کھینچنے والے ملاحوں کے کانوں میں اُتر کر انہیں بے خود اور بے اختیار کرتے تھے اور وہ کشتی کو چھوڑ کر سمندروں میں تیرتے حسن کے اس فریب سے ہم آغوشی کی چاہت میں اپنی مرگ کو گلے لگاتے تھے..

اسی لئے ملاحوں کے کانوں میں روئی ٹھونس دی گئی تھی کہ وہ اُن کے گیت نہ سن پائیں..

اوڈیسیس نے بھی اپنے آپ کو ایک مستول سے باندھ لیا تھا.. کانوں میں روئی نہیں ٹھونسی تھی کیونکہ وہ سحر طراز سائرنز کے گیت سننا چاہتا تھا..

اور جب اُس نے سائرنز کے گیت سنے تو وہ بھی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ مرگ بلاوے ہیں ایک وحشی جانور کی طرح رسے تڑانے لگا.. ملاحوں کی منت سماجت کرنے لگا کہ مجھے کھول دو..

ملاحوں کے کانوں میں روئی بھری ہوئی تھی اور اوڈیسیس نے اُنہیں سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ مستول کے ساتھ جکڑنے کے بعد وہ چاہے کتنی ہی آہ و زاری کیوں نہ کرے.. دیوتاؤں کی کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کھائے اُسے نہیں کھولنا.. اُس کے ساتھی اُسے سن نہیں سکتے تھے.. صرف چہرے سے اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ آزاد ہونا چاہتا ہے لیکن اُس کے حکم کے مطابق اُنہوں نے اُسے بندھا رہنے دیا.. اور وہ سحر طراز جزیروں کی گرفت سے بچ نکلے..

خاور بھی ایک ایسے ہی مستول سے بندھا ہوا تھا..

کشتی کشش کے جزیروں کی قربت میں سے گزرتی تھی..

یہ وہ کشش نہ تھی جو ایک نیلے سویٹر کی غیر موجودگی کے باعث وجود میں آتی ہے..

ایک بہانہ بنتی ہے..

ایک طعنہ بنتی ہے کہ تم مرزا صاحب جیسے نہیں ہو..

یہ کچھ اور تھا.

پکھی ایک سائرن کا روپ دھار رہی تھی..

اُسے دیکھ کر وہ بھی ایک سومرو میں بدلتا تھا جو ہزاروں برس پیشتر سرسوتی کی شادابی کے زمانوں میں مہریں اور منکے بناتا تھا.. جس نے ایک شام پہلی بار یہ دیکھا تھا کہ سرسوتی کے پانی ایک کچھوے کی پشت کو نہیں ڈھانپ رہے وہ کناروں سے سمٹتے جاتے ہیں اور کم ہو رہے ہیں اور یہ بستی ویران ہونے کو ہے.. ایک مشاہد علی سے دوچار تھا.. جو راوی کے پانیوں کے اُترنے اور کامران کی بارہ دری کی اُن اینٹوں کے ننگے ہونے کا گواہ تھا جو پہلے زیرِ آب آتی تھیں..

وہ انہی کا ایک تسلسل تھا لیکن اس تسلسل سے آگاہ نہیں تھا..

جیسا کہ پکھی بھی آگاہ نہیں تھی کہ وہ پاروشنی کی ایک مورت ہے..

اسی لئے پکھی کی کشش اس میں گئے زمانوں سے بہتی ہوئی اس کے وجود سے آ گئی تھی..

غلافی آنکھیں اس موجود لمحے میں جو حیات تھی اس کی کرن تھیں.. ایک عارضی بندوبست تھیں.. وہ صدیوں کے بہاؤ میں کاغذ کی ایک کشتی تھیں.. جب کہ پکھی سدا سے بہاؤ میں تھی اور بہتی ہوئی اس کے وجود کے کنارے سے آ لگی تھی..

اور یہ پاروشنی... جو کہ اپنے پاروشنی ہونے سے آگاہ نہیں تھی.. اُس کا رکھوالا.. اُس کا درچین.. جو لمحۂ موجود میں سرور تھا.. رواں کشتی کے پچھلے حصے میں دھوپ کی گرمائش میں بے سُدھ سوتا تھا' ایک سیاہ اکڑی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا.... اور جب ماماں جعفر نے پلٹ کر ایک "ہوئے سرور ہوئے" کی پکار کی تو وہ نہ کسمسایا اور نہ اُس نے ذرا کروٹیں بدل کر کسل مندی سے آنکھیں ملیں بلکہ فوراً یوں ہوشیار ہو کر اُٹھ بیٹھا جیسے کبھی سوتا ہی نہ تھا "ہوئے ماماں.." اُس نے جواب میں کہا

"دھی چو... نیچے سے لگ رہی ہے.. رسہ پکڑو"

سرور فوراً با عمل ہو گیا.. کشتی کی ناک میں جکڑے ہوئے رسّے کو کھولا.. اور اُس کا

سرا پکڑ کر پانی میں کود گیا.. وہ رسے کو کندھے پر رکھے کنارے پر پہنچا اور پھر جھک کر زور لگاتا ہوا کشتی کو کھینچنے لگا..

رسہ تنا ہوا.. کشتی کی ناک سے بندھا ہوا.. اور اُس کے آخری سرے پر کنارے کی ریت میں سے اپنے چپو پاؤں آسانی سے نکالتا ہوا جھکا زور لگاتا سرور..

ماماں جعفر نے کچھ دیر تحمل سے کام لیا..

لیکن کشتی اب بھی تہہ سے لگتی اٹکتی تھی..

"یہ دھی چو... پہلے تو کبھی ان پانیوں میں آکر نیچے سے نہیں لگتی تھی.. آج اس دھی چو کو کیا ہو گیا ہے.. "وہ بڑبڑاتا رہا.. "اس رُت میں پانی بہت ہوتا ہے.. آج کیا ہو گیا ہے.."

وہ خاور کی موجودگی سے قطعی طور پر لاتعلق ہو چکا تھا اور اب اُس کی پوری حیاتی کا واحد مسئلہ اس اٹکی ہوئی کشتی کو ریتلی تہہ میں سے نکالنا تھا..

اور یہ سرور کے زور لگاتے سیاہ جسے میں سے اُبھرتی... پھٹنے کو آتی رگوں اور اُس کے دوہرے ہوتے جاتے جانور بدن کے بس میں نہ تھا..

ماماں جعفر بھی پانی میں کود گیا اور کنارے پر پہنچ کر سرور کی پشت سے لگ کر رسے کو کھینچنے لگا..

پکھی بھی اُس کی موجودگی سے لاتعلق ہو چکی تھی... اُس کا رشتہ صرف اس کشتی کے ساتھ تھا جو اُس کا گھر تھی.. اگرچہ چند روز کے لئے وہ خاور کی عارضی ملکیت میں تھی... عارضی ملکیت کے ساتھ اُس کا رشتہ بھی عارضی تھا اور وہ صرف اُن دونوں کے لئے فکر مند تھی جو سندھ کے کناروں پر زور لگاتے جھکے ہوئے بدنوں کے ساتھ اُس کے گھر کو ریتلی تہہ کی دلدل میں سے نکالنے کی سعی کرتے تھے..

کشتی اُن کے مشترکہ زور سے آہستہ آہستہ کھسکنے لگی..

رواں ہونے لگی..

کنارا بلند ہونے لگا اور سرور اور ماماں کشتی کی ناک سے بندھے موٹے رسے کو کندھوں پر جمائے جھکے ہوئے اُس کنارے کے ساتھ بلند ہونے لگے.. یوں جیسے وہ ایک بے جان اژدھے کو کندھوں پر رکھے اُس کے بوجھ تلے جھکے زور لگاتے چلتے جا رہے ہوں...

کشتی اتنی آہستگی سے حرکت کرتی تھی کہ ساکن لگتی تھی لیکن نظر کنارے پر جاتی

تھی تو وہ سرکتا دکھائی دیتا تھا..

یہ کڑی مسافت دیر تک جاری رہی.. اگرچہ زور اُن دونوں کا لگ رہا تھا جو کشتی کو کھینچ رہے تھے لیکن اُن کی کشاکش کا تناؤ خاور کے بدن پر بھی اثر کرتا تھا.. وہ بھی کھچاؤ کی زد میں تھا.. کچھ دیر بعد کنارے کی ویرانی ختم ہو گئی اور یکدم بلند سطح سے ہرے بھرے کھیت اور شجر جھانکنے لگے.. وہ دونوں ان کھیتوں کو روندتے ہوئے چل رہے تھے.. کنوئیں اور ٹیوب ویل تھے.. اور کہیں کہیں گھر تھے جن کے صحنوں میں سے سرور اور ماماں گزرتے تھے اور بچے بلند کناروں سے جھانک جھانک کر نیچے پایاب پانیوں میں کبھی اٹکتی اور کبھی گھسٹتی اور پھر رواں ہوتی کشتی کو تکتے تھے..

اُس کے سر پر سے گزرتی یہ بستی سندھ کے کناروں پر آباد ایک معمول کا گاؤں نہ تھا.. یہ آبادی دریا کے بہاؤ سے کٹ رہی تھی.. دریا برد ہو رہی تھی.. جو کچھ تھا مسمار اور بے اختیار ہو کر سندھ کے اندر گرنے کو تھا.. کچھ حصہ گر چکا تھا اور بقیہ میں دراڑیں آچکی تھیں.. کنارے فصیلوں کی مانند اونچے تھے لیکن اُن میں شگاف پڑ چکے تھے... وہ خاموشی سے بھرتے... ابھی اپنی جگہ پر قائم نظر آتے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے یکدم ایک بڑا حصہ اپنے ہی قدموں پر ڈھے کر دھڑام سے پانیوں میں گر جاتا.. اگر ریت اور مٹی کا یہ منہدم شدہ حصہ رقبہ میں بڑا ہوتا تو سندھ کے پانیوں میں فوری طور پر گم نہ ہوتا اور ایک مختصر سے جزیرے کی صورت میں کچھ دیر کے لئے اُبھرا رہتا اور پھر دریا کا زور اُسے برابر کر کے اپنے اندر سمو لیتا.. کئی گھروں کے صحن غائب تھے 'شاید ایک ماہ پیشتر یا آج ہی وہ پانیوں میں گرے تھے اور ان کے پیچھے جو کچے گھر تھے اب آگے آچکے تھے اور کناروں پر معلق تھے 'جھانکتے تھے 'اپنی باری کے منتظر تھے کہ پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے.. وہ جانتے تھے بلکہ اُن کے مکین آگاہ تھے کہ اگلے چند روز میں یا چند ہفتوں میں یہ بھی سندھ کے اجل پانیوں میں گر جائیں گے اور اس کے باوجود وہ انہیں چھوڑتے نہ تھے.. اس بستی کے ٹائی ٹینک کے پیندے میں سوراخ ہو چکا تھا اور پانیوں کا سیلاب اُس کے وجود کو ڈبونے کے لئے اندر آرہا تھا لیکن مسافر اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے.. اپنی صدیوں کی بود و باش 'کھیت' قبرستان اور شجر چھوڑے نہیں جاتے بے شک ان کا شمر ایک اپنا ملک ہو.. یا کناروں سے دور ایک نیا گھر ہو.. انسان آخری لمحے تک اپنے آپ کو یقین دلاتا ہے کہ موت دوسروں کو ہی آتی ہے مجھے شاید نہ آئے.. بستی دریا برد ہوتی جا رہی ہے شاید صرف میرا گھر بچ جائے..

کہیں سرسوں کے کھیت آہستہ آہستہ بھرتے تھے پانی میں گرتے تھے.. اُن کی زرد

ہریاول کے کئی بوٹے اُس کے دیکھتے دیکھتے ایک ایک کر کے مٹی کی گرفت میں سے اپنی جڑیں جھاڑتے بے جان سے ہو کر بلند کناروں سے نیچے گرتے جیسے فصیل کا دفاع کرنے والے سپاہی سینے میں تیر کھا کر نیچے آتے ہیں.. سندھ کے پانیوں پر آگرتے' کچھ دیر غرقاب رہ کر اُبھرتے اور پھر سطح آب پر تیرتے زردی کے ایک مختصر جزیرے کی طرح تیرتے مرکزی بہاؤ کی جانب بہہ جاتے۔

ایک ٹیوب ویل کا وہ پائپ جو اُسے نصب کرتے وقت کئی سوفٹ زمین کے اندر تک لے جایا گیا تھا اب مٹی کے سندھ میں گر جانے سے ننگا ہو رہا تھا اور اُس کی پوری لمبائی نظر آ رہی تھی..

شیشم کا ایک تناور درخت کنارے پر دم روکے کھڑا تھا اور ہلکی ہوا کے باوجود اُس کے پتے سہمے ہوئے تھے تالیاں نہیں بجاتے تھے' دریا کی جانب مٹی بُھر جانے سے اُس کی پرپیچ اور روپوش جڑیں اب برہنہ ہو رہی تھیں اور وہ وقت دور نہ تھا جب اُنہوں نے اُسے سہارنے سے لاچار ہو جانا تھا اور اُسے بھی منہ کے بل سندھ میں آگرنا تھا..

کیکر کے پستہ قد درخت جنہیں کگروٹ کہتے تھے اور دھریک کے درخت.. جھانکتے تھے اپنی باری کا انتظار کرتے تھے.. ان کے پتے بھی مرجھا رہے تھے اور ٹہنیاں مردہ لگتی تھیں.. ان کی جڑوں کو بھی ہوا لگ چکی تھی..

یہ سب کچھ قربت مرگ میں تھا.. فنا کا منتظر تھا۔

کنارے کی گرتی فصیل میں ننگی ہو چکی جڑوں کا جال پھیلتا تھا..

اپنے کاندھوں پر رسے کا مردہ اژدھا اُٹھائے جعفر اور سرور کنارے کے اوپر اپنے راستے میں آنے والے کھیتوں' گھروں اور صحنوں میں سے زور لگاتے گزرتے تھے اور رسے کا تناؤ کشتی میں اُتر کر خاور کے بدن کو کھینچے جانے کی رمز سے آشنا کرتا تھا... اور کشتی کو اس معدوم ہو جانے والی بستی کی مرگ کیفیت میں سے باہر لے جانے کی سعی کرتا تھا..

جتنا عرصہ وہ اس دریابرد ہوتے کناروں کے دامن میں رینگتے رہے اتنا عرصہ خاموشی رہی.. صرف پانی میں کشتی کی حرکت کی ہلکی ہلکی چھلک سنائی دیتی تھی.. نہیں تو چپ تھی..

بالآخر کنارے کی بلندی نیچے ہوئی اور روشنی بڑھ گئی.. وہ مسمار ہوتے کھیتوں' ننگی جڑوں والے اشجار اور دریابرد ہو چکے صحنوں کے کناروں پر جھانکتے کچے کوٹھوں کی زد سے باہر آئے اور کھلے پانیوں میں آگئے..

کشتی آپ ہی آپ اپنی روانی میں آگئی اور سرور اور ماماں جعفر رسہ لپیٹتے ہوئے کشتی میں آئے اور ہانپتے تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود فوراً بانس اُٹھا لئے جیسے اُن کو ڈر ہو کہ کشتی پھر سے اُس دریابرد ہوتی بستی کی گرفت میں چلی جائے گی..

دائیں جانب کشتی کے فٹ پاتھ پر سرور کے پاؤں انتہائی پھرتی سے بھاگنے لگے اور بائیں طرف ماماں جعفر کے قدم اُٹھتے تھے اور بانس سندھ کے سینے میں اُترتے جاتے تھے..

یہ عجیب سندھ سائیں تھا جو بستیوں کو اُجاڑتا تھا..

کیسا مرشد تھا جو اپنے مریدوں کو برباد کرتا تھا..

فنا میں گرنے کے منتظر کھیتوں اور اشجار کی ننگی جڑوں کے منظر نے جیسے اُس کے اندر بھی اپنی جڑیں پھیلا دیں... عمر کے ساٹھویں برس میں اُس کے وجود کے شجر کی جڑیں بھی ننگی ہو رہی تھیں' بدن کی مٹی ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ رہی تھی.... اجل کے دریا کے کناروں پر وہ کتنی دیر اپنے آپ کو سہار سکتا تھا..

اگرچہ وہ کھلے پانیوں میں آچکے تھے لیکن وہ منتظر شجر اور گھر اُن کے ساتھ چلے آتے تھے.. سرسوں کے چند بوٹے ابھی تک کشتی کی نوک کے آگے بہاؤ کے زور میں گرفتار بے بسی سے بہتے اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔

جب کشتی گہرے پانیوں کے پورے زور میں آ کر آزادی سے بہنے لگی... ریتلی تہہ سے بہت اوپر بلند پانیوں پر رواں ہو گئی اور اُسے کسی سہارے اور دھکیلنے کی ضرورت نہ رہی تو ان دونوں نے پسینے پونچھے چند لمبے لمبے سانس بھرے اپنے بانس رکھے اور مٹی کے کُنجے کے منہ سے ململ کا کپڑا کھول کر اُس میں سے باری باری بوٹی کے مدھ بھرے چند گھونٹ حلق میں اُتارے اور پھر ایک مدت بعد اُس کی جانب دھیان کیا اور اچانک اُسے سامنے پا کر مسکرانے لگے..

"سائیں گھونٹ لگاؤ گے؟"

"نہیں.. تم پیو"

"سائیں یہ وہی ساوی ہے جو آخری ستارے کے ڈوبنے سے پہلے پہلے ہم نے گھوٹی تھی.. گھونٹ لگا لو.. خالی نہ رہو"

"نہیں..."

اُسے تجربہ ہو چکا تھا کہ اس ساوی کے چند گھونٹ لگانے کے بعد انڈس کوئین کا

مردہ زنگ آلود ڈھانچہ بھی زندہ ہو جاتا ہے اور سندھ پر تیرنے لگتا ہے..

وہ ابھی تک دریا برد ہونے والے شجروں کی ننگی جڑوں میں جکڑا ہوا تھا اور اُس مٹ جانے والی بستی کی مرگ کیفیت میں سانس لیتا تھا "سرور یہ تمہارا دریا جسے تم سائیں بولتے ہو ان داتا مانتے ہو یہ کیسا دریا ہے کہ بستیوں کو کھا جاتا ہے.."

"سائیں جو زندہ رکھتا ہے وہی تو مارتا ہے... ویسے ادھر ہم مُہانوں میں ایک پرانا اکھان کھڑا ہے کہ راوی سونا' چناب چاندی اور سندھ سواہ... آپ والے پانی آپ کو سونا اور چاندی دیتے ہیں اناج اور ہریاولی دیتے ہیں پر سندھ... راکھ دیتا ہے.."

"سرور ہوئے..." آج کی آبی مسافت کے دوران وہ پہلی بار بولی... پکھی بولی... یوں بولی جیسے رُکھوں میں مور بولتا ہو..

"کیا ہے پکھیے..." سرور ساوی کے اثر میں جھوم کر بولا..

"ایک اور اکھان بھی ہے ہم مُہانوں کا.." اُس نے خاور پر آنکھیں رکھیں" کہ راوی راسکاں... چناب عاشقاں... اور سندھ صادقاں..."

"راسکاں؟" وہ سمجھ نہ سکا اور سرور کی جانب دیکھا..

"ملیچھوں کو کہتے ہیں سائیں.." سرور نے ذرا شرمندگی سے کہا" ہمارا امن ماسا بتایا کرتا ہے کہ اُدھر راوی کے کنارے ملیچھ لوگ رہتے تھے"

پاروشنی اپنے دریا کے کنارے بسنے والوں کو ہی صادق جانتی تھی..

راوی کے کناروں پر رہنے والوں کو ملیچھ گردانتی تھی.. یہ وہ تھے جو اسوا پر سوار ہو کر اودھر آئے تھے اور اُس کی بستیوں کو.. اُس کے ہڑپہ کو ویران کر دیا تھا..

اور پکھی نے راسکاں کہتے ہوئے آنکھیں جھپکی نہیں تھیں.. اُسے دیکھتی رہی تھی.. اور اُن میں ایک حدت تھی جو کسی بھی گلیشیر کے منجمد وجود کو پگھلانے پر قادر تھی..

خاور اُٹھا اور سر جھکا کر کشتی کے اندر جا کر لیٹ گیا..

راوی راسکاں!

اُس کے پنجے ربڑ کے لگتے تھے..

وہ ساری کی ساری ڈیکائے لگتی تھی..

ربڑ کی بنی ہوئی ایک پرفیکٹ جل مرغی..

لیکن اُس کی آنکھوں میں دھڑکنوں کے کھو جانے کی سراسیمگی تھی جو یہ عیاں کرتی تھی کہ وہ ایک کھلونا نہیں.. اپنے ہم جنس پرندوں کو فریب دینے کا ایک مصنوعی جال نہیں.. ربڑ کی بنی ہوئی نہیں.. ایک ابھی تک زندہ شے ہے جو بندھی ہوئی ہے اُس ڈور سے جس کا آخری سرا ایک نیم سیاہ توند پر تہبند اٹکائے موٹے بے ڈھب بدھا کے ہاتھوں میں ہے اور وہ قہقہے لگاتا ہے اور اُس ڈور کو کھینچتا اور کبھی ڈھیل دیتا ہے جو اُس جل مرغی کے پنجے کے ساتھ بندھی ہوئی ہے جو اپنے تئیں اس موٹے بدھا سے دور ہو جانے کے لئے سندھ میں تیرتی ہے اور ڈور نہیں ہو سکتی وہیں رہتی ہے کیونکہ ڈور سے بندھی ہوئی ہے..

سندھ کے کناروں سے ذرا دور... کشتی سے پرے.. جہاں شام اُترنے کی کوشش میں تھی اور پانی مکمل سیاہی میں اُترنے سے ابھی گریز کرتے تھے اور آخری کرنوں کی مدھم زرد روشنی میں وہ پانی ایک ڈھلی ہوئی پیلاہٹ میں رنگی چادر کی طرح بچھے تھے.. اُن پر.. پیلی سرسراتی چادر پر ایک جل مرغی تیرتی تھی.. ڈبکی لگاتی تھی.. کچھ لمحے زیرِ آب رہتی تھی' روپوش رہتی تھی اور پھر پانیوں میں سے اُبھرتی تھی... اپنے تئیں تیرتی تھی' کنارے سے دور ہو جانے کے لئے چھینٹے اُڑاتی تگ و دو کرتی تھی.. لیکن ایک ہی مقام پر جدوجہد کرتی چلی جاتی تھی.. پھر ڈبکی لگاتی تھی اور جب کچھ دیر بعد پانی پر ظاہر ہوتی تھی تو پھر وہیں کی وہیں ہوتی تھی..

بہت دیر اپنی عمر رسیدگی کی غنودگی میں گم... دریا بردگی کے عالم میں اشجار کی ننگی جڑیں ابھی تک ایک ہزار پائے کی صورت اُس کے نیم خوابیدہ بدن سے لپٹی ہوئیں.. پانیوں کے تحرک کے ہچکولے اُسے ایک آہستہ خرام جھولنے کی طرح ہلارے دیتے رہے اور وہ غنودگی میں گمشدہ غافل پڑا رہا اور پھر یہ جھولنا تھم گیا.. بہت دیر تک تھمار ہا تو وہ کسل مندی میں آنکھیں ملتا اُٹھا اور کشتی کی چھت کے نیچے جھک کر پائدان پر قدم رکھ کر باہر آ گیا..

باہر شام اُترنے کو تھی' کشتی تھمی ہوئی تھی اور پانی مکمل سیاہی میں اُترنے سے گریز کرتے تھے.. اور اُن گریز کرتے پانیوں پر ایک پرندہ ایک ہی مقام پر تیرتا جاتا تھا.. کبھی ڈبکی لگاتا تھا او جھل ہو جانے کی آخری کوشش میں.. اور پھر وہیں پر نمودار ہو جاتا تھا جہاں اُس نے ڈبکی لگائی تھی.. کیونکہ اُس کی ایک ٹانگ اُس ڈوری سے بندھی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا کنارے پر کھڑے نیم سیاہ توند پر تہبند اٹکائے... پرندے کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے

موٹے بدھا کے ہاتھوں میں تھا..

سرور اور ماماں جعفر بڑے اطمینان سے اور کسی حد تک اس کھیل تماشے سے محظوظ ہوتے کشتی کے برابر میں کھڑے دیکھتے تھے..

فہیم نے اُسے کسل مندی سے آنکھیں ملتے باہر آتے دیکھا تو اُس کے قریب ہو گیا "سائیں یہ اپنا عطااللہ ہے' میرے ساتھ سکول میں ٹیچر ہے.. شکار کا بہت شوقین ہے سائیں.. ابھی اس نے اس جل مرغی پر فائر کر کے اسے گرالیا ہے.. پر یہ مری نہیں.. ایک چھرا اس کے پروں کے اندر جا لگا ہے اور زخمی کر کے گرالیا ہے.. نمانی اُڑ نہیں سکتی.. تو عطااللہ اس کے پنجے میں ڈوری باندھ کر اُسے پانیوں میں چھوڑتا ہے تو جل مرغی سمجھتی ہے کہ میں بہت تیرتی ہوں تو آزاد پنچھی ہو جاتی ہوں.. پانی میں ڈبکی لگاتی ہوں تو غائب ہو جاتی ہوں... پر نمانی جا نہیں سکتی' ڈوری سے بندھی ہے اور اُس کا سرا عطااللہ کے ہاتھ میں ہے تو کہاں جائے گی.."

وہ عطااللہ سے کسی حد تک شناسا تھا..

جب کشتی روانی میں ہوتی.. دھوپ سے کناروں کے ٹیلے اور ریتلے ٹاپو روشن ہوتے.. یا کبھی شام کی سرخی کوہ سلیمان سے اُترنے والی ہوتی تو وہ ٹیلوں اور ٹاپوؤں میں سے کبھی ظاہر ہوتا اور کبھی بہت دیر تک اوجھل رہتا.. وہ صرف ایک تہبند میں ملبوس ہوتا جو بار بار اُس کی توند سے کھسکتا.. اور ہاتھوں میں ایک بندوق ہوتی اور نظریں آسمان کو کھنگالتی... وہ گرتا پڑتا کہیں نہ کہیں نظر آجاتا..

عطااللہ نے اُسے کشتی سے باہر آتے ہوئے دیکھا تو نہایت مؤدب ہو کر ایک ہاتھ سے سلام کیا.. دوسرے ہاتھ سے وہ ڈوری میں بندھی ہوئی جل مرغی کو ایک منہ زور ہوا کی زد میں آتی ہوئی پتنگ کی طرح تھامے رہا..

"سائیں آؤ کھیل کرو..." جس ہاتھ سے اُس نے سلام کیا تھا اُسی ہاتھ سے وہ اپنے گرتے ہوئے تہبند کو سنبھالتا اُس کے پاس آ گیا اور ڈوری اُس کی جانب بڑھا دی جیسے ماہر پتنگ باز کسی اناڑی پر مہربان ہو کر ڈور اُسے تھمانے کے لئے آگے کرتے ہیں کہ... ذرا دیکھو کیسی تنی ہوئی ہے..

جل مرغی ہمت نہیں ہارتی تھی.. ڈبکی لگاتی تھی اور باہر آنے پر اپنے پنجے میں بندھی الجھن کے باوجود تیرنے کی کوشش کرتی تھی..

وہ اُس پاگل خانے سے مختلف نہ تھی... شائد وہی تھی.. اُس کے پنجوں سے بندھی

ڈوری اُس کے گھر' خاوند اور بچوں کے ہاتھوں میں تھی لیکن اس کے باوجود وہ ڈبکی لگا کر آجاتی تھی.. زیرو پوائنٹ کی بلندی میں تادیر زیر آب رہتی تھی کہ شائد آزاد ہو جائے... وہ ڈبکی لگاتی تھی تو اُس کی غلافی آنکھیں پانیوں میں تیرتی تھیں..

عطااللہ نے اُس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کیا اور پھر اپنی توند سے کھسکتا تہبند اوپر کر کے دونوں ہاتھوں سے ڈوری کھینچنے لگا.. جل مرغی کی چونچ اور پورے وجود کا رُخ کھلے پانیوں کی جانب تھا لیکن وہ بے بس واپس کنارے کی طرف کھنچتی چلی آتی تھی.. ڈوری کے تناؤ میں ذرا سی ڈھیل آنے پر وہ پھڑ پھڑا کر پھر تیرنے کی سعی کرتی اور پھر لاچار ہو کر بے جان سی ہو جاتی... کنارے کے قریب آتی جاتی اگرچہ اُس کی چونچ اور آنکھیں کھلے پانیوں کی جانب ہی ہوتیں..

نسل انسانی کے نصیب کی چونچ اور آنکھیں بھی اگرچہ کھلے تاحد نظر پھیلے پانیوں کی وسعت پر تھیں لیکن اُس کے پنجوں میں بندھی ایک ڈوری تھی جو اُسے کسی اور جانب کھینچتی تھی..

کوئی تھا جو لُک چھُپ لُک چھُپ ڈور کھینچتا تھا..

اور ہم یہی کہہ سکتے تھے کہ جو چاہو ہو سو آپ کرے ہو... بے بس تھے.. چونچ پانیوں کی سمت کئے اپنے تئیں اُدھر تیرتے تھے.. آزاد ہوتے تھے.. لیکن نامعلوم انداز میں کھنچے چلے جاتے تھے واپس اُس کنارے کی جانب جہاں ایک موٹا بدھا ہمیں آج رات الاؤ پر بھوننے کے منصوبے بناتا تھا..

فہیم جھومر ڈال رہا تھا..

ریت میں اُس کے پاؤں دھنستے تھے لیکن جعفر کے گھڑے کی تال سے وہ مست ہوتا تھا.. سرور کی پرات کی تھاپ پر وہ الست ہوتا تھا اور بھڑکتے ہوئے رچ کی روشنی میں جھومر ناچتا وہ قونیہ کے گھومتے ہوئے درویشوں کی سنگت میں مست الست ہوتا تھا.. ساوی نے اثر کر دکھایا تھا..

عطااللہ رچ کے الاؤ کی قربت میں ہو بیٹھا.. آلتی پالتی مارے بیٹھا اُس کی آگ میں اپنی جل مرغی بھونتا تھا اور اُسکے ہونٹ گیلے ہوتے تھے..

کچھ دور بیٹھی پکھی.. اپنے بڑے اور بھاری کولہوں پر بیٹھی.. چپ بیٹھی.. لیکن وہ سب سے بڑھ کر بولتی تھی چپ بیٹھنے کے باوجود!

ابھی تک پکھی کے ہاتھوں کی اُپلوں کی آگ پر پکائی ہوئی موٹی روٹی کا سواد خاور کے منہ میں تھا اور جس میں دھوئیں کا ذائقہ بھی تھا اور پکھی کے سیاہ ہاتھوں میں سے بھی کوئی مہک اُس میں شامل ہو گئی تھی.. اُس نے پکھی نے کوئی نہ کوئی بس گھولا تھا' ٹونا کیا تھا اُس روٹی پر کہ وہ اپنے تالو کے نیچے اُس کے بدن میں سے پھوٹنے والے پسینے کی نمکین کیفیت کو محسوس کرتا تھا..

سرور نے سر جھکا کر گھڑے پر بندھے ململ کے کپڑے پر جمے آٹے پر سے اپنے ہاتھ اُٹھائے اور ایک دریائی گینڈے کی طرح پورا منہ کھول کر گانے لگا.. وہ تالو تک سیاہ تھا اور اُس کے مسوڑھے بھی کالے شاہ تھے..

پُراِیں موسم تیکوں بیڑی تیں میں پار دی سیر کرائی ہئی

بھوں چس آئی ہئی...

"جب وہ پہلے مصرعے کی تان اُٹھانے کے بعد "بھوں چس آئی ہئی.." پر آیا تو ماماں جعفر نے بھی یکدم جبڑا کھول دیا اور وہ مل کر گانے لگے..

پار کی سیر...

کوئی بھی اپنی مرضی سے پار کی سیر کو نہیں جاتا' اُسے بھیج دیا جاتا ہے..

ان برسوں میں پار کی سیر قربت میں محسوس ہوتی تھی..

اُس کی بیڑی بھی دھیرے دھیرے ہر سانس کے ساتھ دوسرے کنارے کی جانب کھل رہی تھی اور یہ قیاس کسی کے بس میں نہ تھا کہ وہ جان لے کہ یہ کونسے لمحے ایک دھچکے کے ساتھ دوسرے کنارے جا لگے گی... ہو سکتا ہے اگلے لمحے میں اور ممکن ہے کہ دو چار برس بعد.. پار تو بہر طور پر اُترنا تھا... پار کیا تھا؟ یہ آج تک کسی کی فہم میں نہیں آیا.. کوئی نہیں جان پایا... پار جانے والے کسی ایک نے بھی آج تک خبر نہیں کی کہ پار کیا ہے....

سندھ ساگر کا یہ ٹاپو جس پر فہیم جھومر ڈالتا مست الست ہوتا تھا اور سرور اور جعفر گلا پھاڑ کر تانیں بلند کرتے تھے.. دریا کی دو شاخوں کے درمیان میں کسی وہیل کے کوہان کی طرح ابھرا ہوا تھا اور سائز میں بھی اُس سے کچھ زیادہ بڑا نہ تھا.. اس کا رقبہ پانچ چھ مرلے سے زیادہ تو نہیں لگتا تھا.. اُس پر وہ پانچ تھے جو مقیم تھے' ایک خیمہ اور ایک الاؤ.. کوئی ایک اور ہوتا تو اُس کے بیٹھنے کی جگہ مشکل سے بنتی..

آج رات کرنے کے لئے سرور ایک بہت بڑے جزیرہ نما بیلے کے کنارے سے جا لگا تھا جو سروٹوں' کاہی اور قد آدم گھاس سے گھنا اور ڈھکا ہوا تھا.. اس کے درمیان میں کہیں دھن وال اپنے کچے کوٹھوں میں بسیرا کرتے تھے اور وہ بیلے میں اپنے مال ڈنگر چراتے تھے اور باہر کی دنیا سے غرض نہ رکھتے تھے.. اور اس بیلے کو صرف ساون کے مہینوں میں چھوڑتے تھے جب کاہی اور سروٹ چڑھتے پانیوں میں ڈوب جاتے تھے اور اُن پر سندھ ایسے بہنے لگتا تھا کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کے نیچے تہہ میں سروٹوں کے جنگل اور کچے کوٹھے ہیں جو پانی میں گھلتے ہیں... ساون میں بقول سرور... سندھ ٹھوکتا ہے سائیں.. اپنے آپ میں کسی شے کو اُترنے نہیں دیتا نہ کشتی کو نہ آدم کو.. اور جو اُترے اُسے بھی زمین پر واپس نہیں جانے دیتا.. پانی اُترنے پر یہ دھن وال واپس آتے تھے اپنے مال مویشی کو کشتیوں میں سوار کر کے اور کوٹھے دوبارہ تعمیر کر لیتے تھے۔ اُن کی ان پانیوں کے بیچ آباد بستیوں کو بھاناں کے نام سے جانا جاتا تھا..

اگرچہ جس مقام پر اُن کی کشتی ٹھہری تھی اور جہاں سرور رات کرنا چاہتا تھا وہاں سے وہ بھاناں بہت دور تھا.. صرف کبھی کبھار ڈنگروں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی مدھم سی آواز آتی تھی لیکن سندھ میں بسر کی جانے والی کسی بھی رات میں خاور اُس قطعۂ زمین پر اس شائبے سے بھی اُلجھن میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ وہاں آس پاس کوئی اور بھی ہے' بے شک بہت دور ہے لیکن کوئی ہے.. اُسے اپنا خود مختار جزیرہ درکار تھا..

"یہاں نہیں سرور.."

"کیوں سائیں.. اچھی جگہ ہے.."

"جب بھی رات کرنی ہے تو ایسی جگہ جہاں آس پاس آدم ہو نہ آدم زاد... اِدھر سے چلو.."

"کدھر سائیں؟" اُس نے بے دلی سے جھلائی ہوئی آواز میں کہا.. کہ اُسے آس تھی کہ وہ گلہ بانوں کے ڈیرے پر جا کر آج رات دودھ کا ایک گھڑا مانگ لائے گا.. مکھن کا ایک پیڑا حاصل کرے گا اور اُس پر صاحب کی چینی چھڑک کر نگلے گا تاکہ اُس کی آنتیں جو دھوپوں اور فاقوں اور دریا برد ہونے والی بستی میں سے کشتی کھینچتے خشک اور مروڑی جا چکی تھیں' چکناہٹ سے تر ہو جائیں' نرم ہو کر اُن کی گانٹھیں کھل جائیں..

"کہیں بھی.. جہاں اور کوئی آدم نہ ہو.."

سرور نے بانس اُٹھا کر پانی میں ڈالا اور اُس پر اپنا سینہ رکھ کر کشتی کو کنارے سے جدا کیا.. اور اُسی لمحے خاور کو افسوس ہوا.. اُس نے ایک وہم میں 'ایک عجیب خبط میں اُکتے تھکے ہوئے بدن کو خواہ مخواہ پھر سے مشقت کرنے پر مجبور کر دیا تھا.. یہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی ترنگ تھی لیکن اُس کی خصلت کی مجبوری تھی..

ماماں جعفر بھی بیزار ہو کر پچھلے حصے میں جا بیٹھا اور بوٹی کا کپا کھول کر اُس میں سے گہرے گھونٹ بھرنے لگا..

عطاءاللہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ خفتی ہو گیا تھا اور جل مرغی کے ساتھ تماشہ کرنے کے بعد اُسے حلال کر چکا تھا..

رات ہونے والی تھی جب پانیوں کے درمیان ایک سیاہ اُبھار نظر آیا.. وہ دور سے ایک جہازی سی دکھائی دیتی تھی یا ایک بڑا اسرار ا پتھر جو بہاؤ کے درمیان میں سے سر اُٹھاتا تھا پر وہ پانیوں کی چادر میں سے نمودار ہوتا ایک مختصر سا ریتلا ٹاپو تھا..

"سرور... یہ جگہ کیسی ہے؟"... وہ واقعی ایک وہیل کی پشت سے زیادہ بڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی کچھ دیر کے لئے سانس لینے کو اُبھرا ہے اور ابھی پانی میں غرق ہو جائے گا..

"کیا پتہ کیسی ہے سائیں.." اُس کے لہجے میں ناپسندیدگی سے آگے نفرت کی ایک چنگاری کا شائبہ ہوتا تھا "میں تو پہلے ادھر نہیں آیا.... آیا ہوں تو یہ پہلے ادھر نہیں تھا.."

"ادھر رات کر لیں؟"

"بہت چھوٹا ہے سائیں.. ادھر رات کریں گے تو کیا پتہ رات کی رات سندھ سائیں کے پانی چڑھ آئیں اور مشکل ہو جائے.. اس پر تو آپ کے تنبو لگانے کے لئے بھی جگہ دکھائی نہیں دیتی.. پر آپ مالک ہو.. حکم کرو"

"تم لے چلو.. رات ادھر ہی کرتے ہیں.. میں کشتی میں سو جاؤں گا"

وہ ٹاپو حقیقت میں اتنا ہی مختصر تھا کہ جب اُن کی کشتی اپنے زور میں اُس کی ریت کے اندر تک گئی تو اُس کا دل رُک گیا کہ یہ ابھی اسے دھکیل کر پانیوں میں گرا دے گی...

اور اب رات کی سیاہی میں وہی ٹاپو تھا جس پر فہیم جھومر ڈالتا تھا..

اور اس لمحے اگر سندھ کی گہری تاریک رات میں پانیوں پر کوئی بادبانی کشتی دور سے

گزرتی جاتی تھی تو اُس میں اونگھتا کوئی شخص اگر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں یونہی ادھر نظر کرتا تو یقیناً ششدر رہ جاتا.. اُسے اور کچھ نظر نہ آتا.. صرف پانیوں کے تاریک پھیلاؤ میں ایک الاؤ کی روشنی میں جھومر ڈالتا ہوا فہیم دکھائی دیتا.. جیسے وہ پانیوں پر ناچتا ہو.. اُسے اس بادبانی کشتی میں سوار اونگھتے ہوئے شخص کو وہ کوہان نما ٹاپو تو دکھائی نہ دیتا.. صرف فہیم کا نیم روشن بھوت گردش میں نظر آتا... اور وہ یقیناً اس منظر کو نظر کا دھوکا سمجھتا.. کوئی آفت یا کرشمہ سمجھتا.. کہ ایک شخص بہت دور پانیوں کے تاریک پھیلاؤ میں رقص کر رہا ہے اور ڈوبتا نہیں...

اُس کی گزشتہ زندگی کے تھیٹر میں جتنے بھی کردار تھے.. اُس کی تینوں بیٹیاں.. دوست احباب... ٹیلی ویژن کے رفیق... کبھی اپنے بے حد بے مہار تصور میں بھی یہ نہیں لا سکتے تھے کہ وہ... اس لمحے... جب وہ زرد شیطان کے شہروں میں ڈالروں کی آرزو اور حصول کے لئے نڈھال ہوتے تھے' اپنے ڈرائنگ رومز میں ٹیلی ویژن کے سامنے اونگھتے تھے یا اپنی بیویوں کے بوڑھے بدنوں سے منہ موڑ کر سوتے تھے.. وہ تصور کے آخری سرے پر چلے جانے کے باوجود یہ خیال نہیں کر سکتے تھے کہ وہ... خاور.... اس لمحۂ موجود میں جب گھڑی پر اتنے بج کر اتنے منٹ ہوئے ہیں وہ سندھ ساگر کے ایک ایسے ٹاپو کی رات میں ہے.. جہاں آج تک کسی نے رات نہیں کی.. اُس کے سامنے فہیم جھومر ڈال رہا ہے.. ماماں جعفر بوٹی کو اپنے سے بڑھ کر پی گیا ہے اور اب ذرا احتیاط سے حرکت کرتا ہے کہ کہیں لڑھک نہ جاؤں.. اور اگر لڑھکوں گا تو سیدھا سندھ میں جا گروں گا اور بہہ جاؤں گا.. ایک موٹا بدھا الاؤ پر جل مرغی کو بھونتا اور پلٹتا ہے.. پکھی ٹاپو کی کم مائیگی کے باعث بہت قریب بیٹھی ہے اور اُس کی حدت سے گلیشیر پگھل سکتا ہے.. اور سرور اپنے حال میں مست... صاحب کے لئے اپنی بیزاری بھول چکا ہے اور منہ کھولے گا رہا ہے..

داساں کہیں بے دیس دے واقف نئیں
بس بیڑی پانی دیس ای اپنا دیس اے...
پانی دیس کی رات میں...

پانی دیس کے باسی... اور اُن میں صرف ایک الگ اور غیر ذات... جسے وہ روٹی پانی کے لئے برداشت کرتے تھے اور ابھی تک یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ادھر کیوں آیا ہے.. نہ پکھیرو کو اور نہ پکھی کو ڈھانے آیا ہے تو کیوں آیا ہے.. اور یہ کب تک بے وجہ اسی طور بیڑی

میں ٹھلتا رہے گا.. اس کا کونسا ٹھکانہ ہے اور اس نے جانا کہاں ہے.. نہ پرندوں کے پیچھے جاتا ہے نہ دار و پیتا ہے اور نہ پکھی کو اُن نظروں سے تکتا ہے جن نظروں سے سب سائیں لوگ اُسے کشتی میں سوار ہوتے ہی تکتے تھے..

لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی نظروں میں فتور آرہا تھا.. وہ اُنہی نظروں سے اُسے تکتا تھا اس کی جانب دیکھے بغیر اُسے تکتا تھا.. اور ذرا پرے بیٹھی پکھی کے کولہوں تلے جو اُن کے بھارے ریت کھسکتی تھی تو اس کے ایک ایک ذرے کے ساتھ وہ بھی سرکتا تھا..

فہیم کے جھومر قدم تھکنے لگے.. وہ نڈھال ہو کر اپنے بے قابو اور مست سانسوں کو سنبھالتا ریت پر گر گیا..

وہ منظر سے ہٹا تو سرور نے اپنے گھڑے سے ہاتھ اُٹھالیا.. اور جعفر نے پرات کو پرے کر دیا.. اور سندھ کی شب سیاہ کا سناٹا جو اُن کے شور سے ٹاپو کے باہر پانیوں میں دبکا بیٹھا منتظر تھا دندناتا ہوا اُن پر وارد ہو گیا اور وہ سب اس کی چپ آغوش میں چلے گئے اور ہر ہستی جدا جدا ساکت ہو گئی...

ٹاپو پر اُترتے ہی ماماں جعفر نے کہا تھا "بچ لگائیں سائیں؟"

پالی کے یہ نوجوان بوٹی پینے کے علاوہ بچ لگانے کے بے حد شوقین تھے..

"ادھر تو لکڑی نہیں ہے جعفر..."

"ساتھ لے کر آئے ہیں سائیں... رات کو بچ نہ لگائیں سائیں تو پانیوں کے اندر جو بھوت پریت اور بلائیں بسیرا کرتی ہیں ناں تو وہ سب ٹاپو پر آکر رات کرنے والوں کے لئے جنجال بن جاتی ہیں.."

یہ بچ بھی اب راکھ ہونے کو تھا جب سندھ کا سناٹا اُن پر غالب آیا تھا..

فہیم ابھی تک ہانپ رہا تھا..

ماماں جعفر بہت تردد اور احتیاط کے ساتھ اُٹھا اور اُس کے سامنے بوٹی کا کٹورا رکھ دیا... فہیم نے اُسے منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور بحال ہو گیا..

"بہت زبردست جھومر ڈالتے ہو فہیم..." اُس نے مناسب سمجھا کہ اس کی شدید اور لگاتار مشقت کی حوصلہ افزائی کی جائے "زبردست..."

"جھومر تو یہ قبروں پر ڈالتے ہیں سائیں.." ماماں جعفر نے اُٹھنے کی کوشش کی اور

ریت میں پاؤں دھنس جانے سے لڑکھڑا کر پھر وہیں ڈھیر سا ہو گیا.. "اور سائیں ننگ دھڑنگ ہو کر"

"قبروں پر؟"

"جی سائیں.. یہ ڈڈا پارٹی کے ممبر ہیں ناں... بیٹرگ پارٹی کے... راتوں کو ویرانوں میں اور قبرستانوں میں جا کر ننگے پنگے جھومر ڈالتے ہیں سائیں.."

"کیوں فہیم؟"

"نہیں نہیں صاحب.." فہیم بوٹی کا پورا کچا چڑھا ہونے کے باوجود فوراً ذی ہوش ہو گیا "یونہی خبر اُڑ گئی ہے کہ.. ہم لوگ مزمل شریف کا ورد کرتے ہوئے قبروں کے گرد کپڑے اُتار کر ناچتے ہیں... یونہی ہوائی بات ہے.. بیٹرگ پارٹی کے لوگ ذرا زندہ دل ہوا کرتے تھے.. بیٹرگی کہلاتے تھے تو ذرا دل لگی کو اور من کا رانجھا راضی کرنے کو ایسے کسب کیا کرتے تھے..."

"بوٹی پی کر ایسے کسب کرتے تھے؟"

"بوٹی بنا تو ایسے کام کہاں ہو سکتے ہیں سائیں... پر سنجیدہ بات نہیں تھی، تھوڑا کھیل تماشہ تھا.. پر اب بیٹرگ پارٹی نابود ہو چکی ہے.."

"تم اس کے ممبر تھے؟"

"نہیں سائیں یونہی خبر اُڑ گئی ہے.." فہیم ڈولتا ہوا سندھ میں ڈولتی ایک کشتی کی مانند ڈولتا ہوا اُٹھا "آپ کی اجازت سے میں ذرا اپنے آپ کو خالی کر آؤں... بہت بھر گیا ہوں" وہ چند قدم آگے ہوا تو اس کا پیر پانی میں گیا اور وہ فوراً اپنے آپ کو سمیٹ کر پیچھے ہو گیا "سرور یہ رات کرنے کے لئے تم کیسے ٹاپو میں لے آئے ہو... پکھی کی چھاتی جتنا.."

سرور خوش ہو گیا "میں تو نہیں لایا... مالک اودھر لے آیا ہے"

فہیم چپ ہو گیا اور اپنے آپ کو خالی کرنے کے ارادے سے تائب ہو کر پھر الاؤ کی راکھ کی قربت میں آ بیٹھا "پھر تو سائیں آج کی رات تو آنکھوں میں کٹے گی.. آنکھ لگ گئی تو ایک کروٹ بدلنے سے سندھ میں بہہ جائیں گے... میں تو بیٹھ کر رات کرتا ہوں" اس نے ٹانگیں جوڑ کر ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ کیا اور اسی حالت میں رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا..

جب سے سفر کا آغاز ہوا تھا.. کب سے.. اس کا کچھ حساب کتاب اور سراغ نہیں ملتا تھا.. تب سے خاور نے پہلی مرتبہ بجھتے ہوئے الاؤ کی لو میں کنارے کے ساتھ جڑی

مہانوں کی کشتی کو غور سے دیکھا.. وہ اپنا اگلا دھڑ ریت میں دھنسائے اور پچھلے حصے کو دریا کے پانیوں میں ٹھہرائے بجھے بجھے تاریکی میں ڈولتی حرکت کرتی تھی.. اور اُس کے چوبی بدن پر نہایت دل کش اور رنگین نقش و نگار تھے..

"سرور..."

"جی سائیں..." وہ ہڑبڑا کر بولا..

"یہ کشتیاں تم خود بناتے ہو؟"

"نہیں سائیں.. ہم مہانے تو انہیں کھینا جانتے ہیں بنانا نہیں جانتے.... لیہ کے گاؤں لسکانی والا میں کاریگر ہیں جنہیں گھاڑو بنانے والے بولتے ہیں بس وہی بنا سکتے ہیں...

بھلے وقتوں میں تو سنا ہے کہ لکڑی کا خرچہ ہوتا تھا اور کاریگر روٹی پانی کے ساتھ بنا دیتا تھا پر اب تو نکمی کشتی بھی ڈیڑھ دو لاکھ سے کم میں نہیں آتی.. کالا باغ میں ایک کاریگر ہے رضا نام کا.. پر بد دماغ ہے بہت.. پر کشتی بناتا ہے تو ایسی کہ حور پری لگتی ہے.. طالب حسین بھی بڑا ماہر ہے پر اب دریا چھوڑ گیا ہے تونسہ جا کر پکے مکانوں میں رہنے لگا ہے.. کشتی جب تیار ہو جاتی ہے ناں سائیں تو بڑا موج میلہ ہوتا ہے.. کاریگر کو سہرے باندھ کر کشتی کو اُس کے سمیت پانی میں دھکیلتے ہیں دیکھنے کے لئے کہ کہیں ڈوبی تو نہیں کھڑی اور جب تیرنے لگتی ہے تو سب مبارکباد کرتے ہیں اور کاریگر کو سہروں سمیت پانی میں دھکا دے دیتے ہیں.. یہ رسم ہے سائیں.. اور پھر سب مل کر بوٹی پیتے ہیں اور دریا اور کشتیوں کے گیت گاتے ہیں.. ماماں جعفر ہوئے.."

ماماں جعفر او گھ گیا تھا سرور کی ہوئے سن کر ہڑبڑایا اور کہنے لگا "سرور یوں یکدم تراہ نہ نکالا کر.. میں تو ناپو سے لڑھک کر پانی میں گرتا گرتا کھڑا تھا.."

بچ بہت دیر سے سرد ہو چکا تھا.. اندھیرا نہ دیکھتا تھا نہ قیاس کر سکتا تھا نابینا تھا.. لیکن وہ ایک دوسرے کے چہروں کے اتنے آشنا ہو چکے تھے کہ اُن کے خدوخال نابینائی کے باوجود تاریکی میں سے نمایاں ہوتے تھے... جیسے وہ ایک زیرِ زمین گھپ اندھیری کوٹھڑی میں بند ہوں اور پہرے دار ایک مشعل اُٹھائے کب کا وہاں سے گزر چکا ہو لیکن پھر بھی روشنی اُن کے ناک نقشے پر ٹھہر گئی ہو اور وہ ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہوں..

بے نام غلافی آنکھوں کی کوٹھڑی کی مانند.. خاور ریت کو اُنگلیوں سے کرید تا تھا.. اُس نے کوئی اتنا بڑا جرم نہیں کیا تھا.. صرف ایک جراب اور ایک بوٹ اتارنے کو کہا تھا.. اور

جہاز سے نکلتے ہی اتنی پشیمان ہوئی تھی کہ مالک سے باندی بن گئی تھی.. پاؤں پڑنے کو تیار تھی.. وہ کیسے نارمل ہو سکتی تھی اگر اُس کی پوری زندگی ایک ابنارمل چاہت کے حصول کے لئے گزری تھی.. اُس نے اتنا بڑا جرم نہیں کیا تھا.. خاور کا ردِ عمل ایک معمول کی صورتِ حال میں تو قابلِ فہم تھا لیکن وہ تو پاگل پن کی غیر معمولیت کا شکار تھی.. نفسیاتی مریضوں اور ذہن میں فتور رکھنے والوں کو جرم کی سزا نہیں دی جاتی... وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا.. اُس کی کمی کو شدت سے محسوس کرنے لگا..

گئی رات میں وہ کشتی کے اندر... کہ باہر ناپو پر اُس کے خیمے کے لئے جگہ نہیں تھی.. کروٹیں بدلتا رہا.. شدید احساسِ جرم کا شکار رہا.. اُن گدوں اور غلیظ رضائیوں میں جن پر مل جل کا ایسا کام ہو چکا تھا کہ کشتی کناروں سے ٹھک ٹھک ٹکراتی تھی.. باہر ناپو پر پکھی کے بھاری کولہوں تلے ریت سرکتی تھی کسی بھار کے باعث اور ریت کا ہر ذرہ جب کھسکتا تھا تو اُس کی چبھن سے اُس کا بدن ٹھٹھکتا تھا... اُس نے ایک اور کروٹ بدلی...

پپوٹوں پر ایک ہلکی روشنی سی تیری.. خاور نے آنکھیں کھول دیں.. کشتی کا اندرون روشن ہو رہا تھا.. آوازوں کی ہلکی بھنبھناہٹ آ رہی تھی.. لوگ باتیں کر رہے تھے ہنس رہے تھے.. پانیوں کے بلوئے جانے کی ایسی گہری اور گونجدار سرسراہٹ تھی جیسے سندھ کے سینے میں ایک بہت بڑی مدھانی اُتری ہوئی ہے جسے طاقتور ہتھیلیاں گھماتی ہیں... پانی تلاطم میں تھے اور شور کرتے تھے..

کشتی کے اندر روشنیاں پڑتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں اور پھر جھولتی ہوئی ہر شے کو روشن کرتی تھیں... خاور کی نگاہ کیل کے ساتھ ٹنگے پلاسٹک کے فریم والے آئینے تک گئی.. اُس میں انڈس کوئین تیرتی تھی.. اور اُسی لمحے اُسے خالی کر گئی..

کشتی کا اندرون پھر سے اندھیرے میں ڈوب گیا.. بلوئے گئے پانی پھر سے ہموار ہو کر چپ میں چلے گئے.. صرف ایک کرلاتی کونج کی... اکیلی کونج کی کرلاتی ہوئی چیخ سنائی دی اور وہ بھی چپ میں چلی گئی..

لیکن آئینے کی تاریک سطح پر ایک جل مرغی کی شبیہ اُبھرتی تھی جو پھڑ پھڑاتی ہوئی تیرتی تھی اور اُس مقام سے آگے نہ جا سکتی تھی کہ نجات اُس کے نصیب میں نہ تھی.. ایک ڈوری اُس کے پاؤں میں بندھی ہوئی تھی جس سے وہ پیچھے ہی پیچھے کھنچی چلی جاتی تھی..

کشتی کے دونوں جانب بلند کنارے تھے اور وہ نہایت سہمی ہوئی اُن کے درمیان.. اتنی خاموشی سے بہتی ہوئی جا رہی تھی کہ زیرِ آب اگر کوئی ڈولفن تھی تو اُسے بھی خبر نہ ہو سکتی تھی کہ پانی کے سینے پر سے کوئی شے گزرتی ہے..

کنارے اونچے تھے اور اُن پر لائی اور سروٹوں کے گھنے ذخیرے تھے..

اتنے گھنے کہ صبح کی مدھم ہوا اُن کے اندر جانے کی کہیں گنجائش نہ پاتی تھی اور اُن کے اوپر سے سرسراتی گزرتی تھی... وہ سب کے سب اُن کے تیز دھار والے پتے اور آپس میں گتھی ہوئی شاخیں بے حد ساکن' چپ سکوت میں' بے حس و حرکت خاموش کسی سامری کے سحر میں پھونکے ہوئے لب بستہ تھے کہ ہوا اُن کے اندر نہ آسکتی تھی کہ وہ سرگوشیاں کر سکتے اور دونوں کناروں کے بیچ ایک چوڑی آبی گزرگاہ تھی.. ایک نہر تھی اور وہ بھی ہموار اور خاموشی کے طلسم میں تھی اور اُس کے سنّاٹے میں دم بخود اُن کی کشتی تھی جو بے آواز اُس میں سے گزرتی تھی۔

تہہ در تہہ گھنے کنارے اُس کچھ یکدم ظہور پذیر ہو جانے والی خاموشی سے حاملہ تھے جس میں سے ہارٹ آف ڈارکنیس کی مانند اس سکوت کو توڑتے وحشی قبائل برآمد ہو کر کشتی پر زہر آلود تیروں اور بھالوں کی بوچھاڑ کر سکتے تھے..

عجیب سا ٹھہرا ہوا گمشدہ سنّاٹا تھا جس میں اُن کی کشتی ایک ہموار رفتار سے آگے بڑھتی جاتی تھی..

خاور کشتی کی نوک پر کھڑا سویر کی ہوا کو اپنے سینے پر محسوس کرتا ہوا.. ایسے کہ پوری کشتی اُس کی پشت پر تھی اور گویا صرف وہ تھا جو پانیوں کا سینہ چیرتا آگے چلا جاتا تھا..

ایک سمندری جہاز کے آگے نصب کسی دیوی کے اُس مجسمے کی مانند جو نمکین پانیوں کی پھوار اپنے بدن پر سہتی ہے اور اُسے کچھ علم نہیں ہوتا کہ اُس کی پشت پر جو جہاز چلا آتا ہے اُس کے مکین کون ہیں اور اس لمحے کیا کر رہے ہیں.. اُس کا مد مقابل صرف سمندر ہوتا ہے..

اُس نہر کے خاتمے پر.. جہاں دونوں کنارے اختتام کو پہنچ رہے تھے ایک بے انت پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا جو انڈس کا مرکزی دھارا تھا اور یہ نہر دریا کی ایک بڑی شاخ کو اس دھارے سے جا ملاتی تھی۔ وہ بڑی شاخ کہیں بہت آگے جا کر بل کھاتی ہوئی اگرچہ اسی دھارے میں جا شامل ہوتی تھی لیکن یہ نہر ایک شارٹ کٹ تھی.. اور وہ اُس شاخ سے الگ ہو کر اس کی تنگنائی میں داخل ہو گئے تھے اور اس میں یونانی دیومالا کی کسی ایسی کشتی کی طرح رواں تھے جس کے آس پاس کے جنگلوں میں سے کسی بھی لمحے ڈائنیں اور چڑیلیں برآمد ہو سکتی تھیں یا خاموش پانیوں میں سے کوئی یک چشم عفریت اُبھر سکتا تھا..

وقت کا یہ لمحہ اور یہ بھید بھری چپ سینکڑوں برس پیشتر کا افریقہ بھی ہو سکتی تھی... ہارٹ آف ڈارکنیس.. جاوا سماٹرا کے اُلجھے ہوئے گھنے جنگلوں میں اُترتی مگر مچھوں سے کلبلاتی کوئی ندی بھی ہو سکتی تھی.. لیکن ایک فرق تھا.. کناروں کے گھنے ذخیروں میں سے کسی انجان پرندے کی کوک سنائی نہ دیتی تھی.. اور نہ کسی لگڑ بگڑ یا دل کو دہلا دینے والی کسی جنگلی جانور کی آواز آتی تھی اور نہ ہی ڈھول کی مدھم تھاپ کوئی پیغامِ مرگ بھیجتی تھی.. بس سنّاٹا تھا اور گھنی چپ تھی اور وہ ایک ویران خواب کے آبی سنّاٹے کے اندر چلے جاتے تھے... پچھلی شب کے مسلسل جھومر ڈالنے سے فہیم کا بدن تھک ٹوٹ چکا تھا اور وہ بے سُدھ نیند میں گم تھا..

کشتی کے پچھلے حصے میں پکھی براجمان تھی اور وہ کچھ نہ دیکھتی تھی کہ اُس کے آس پاس کیا گزرتا ہے' اتنی چپ کیوں ہے.. وہ جیسے غازی گھاٹ کے پل کے نیچے بے پرواہ بیٹھی تھی اور وہ سنگھاڑا مچھلی صاف کر رہی تھی جو آج سویرے اُس مختصر ٹاپو کی خصوصی عنایت سے سرور کے جال میں آ گئی تھی... اور سرور نے بھی کل اس کشتی کو دریا برد ہونے والی بستی کے کھیتوں اور صحنوں میں کاندھے پر رسہ ڈالے بہت دیر کھینچا تھا.. پھر شاید پچھلی شب بھی اُس نے پکھی کے کولہوں تلے سے ریت سرکانے میں بہت مشقت کی تھی تو وہ اُس کے قریب ایک گدے میں سمٹا ہوا منہ کھولے سو رہا تھا..

عطااللہ اُس کے قدموں میں ڈھیر تھا... اُس کی تُوند پانیوں میں سے اُبھرنے والی کسی سیاہ رنگ کی وہیل کی طرح اُٹھتی تھی اور نیچے ہو جاتی تھی.. وہ بھونی ہوئی جل مرغی کی ہڈیاں تک چبا گیا تھا...

ماماں جعفر چوڑے چپو کے ساتھ بہاؤ کے زور میں آئی ہوئی خود بخود رواں کشتی کی سمت کا دھیان کر رہا تھا..

کشتی کی نوک پر کھڑے ہوئے اُسے لگتا تھا کہ اُس کے پاؤں تلے کچھ بھی نہیں، وہ ہوا میں ساکت ہے اور وہ تنہا اس آبی گزرگاہ کے درمیان میں معلق ایک ہی مقام پر کھڑا ہے لیکن دائیں بائیں جو اونچے کنارے ہیں صرف وہ دھیرے دھیرے سرکتے پیچھے رہتے جاتے ہیں اور نہر کی تنگنائی اُس پر حاوی ہوتی جاتی ہے.. اب تک کے سفر میں اُس نے سندھ کے پھیلاؤ میں کھلے سانس لئے تھے جن کی کوئی حد نہ تھی کوئی روک ٹوک نہ تھی لیکن اب دونوں جانب سرحدیں تھیں اور درمیان میں پانی کی ایک چوڑی پٹی کی ریاست تھی اور ویران تھی..

اُسے اُلجھن ہونے لگی کہ یہ چپ کیوں نہیں ٹوٹتی.. کوئی ایک پرندہ ہولے سے کوک دے.. کوئی جھینگر ٹرائے.. صرف ایک مچھلی سطحِ آب میں سے کود کر باہر آئے اور پھر شپاک سے گم ہو کر کوئی دائرہ اپنے وجود کا چھوڑ جائے..

سویر کی دھوپ میں گئی رات کے سناٹے یہاں سفر کے رفیق تھے..

وہ پانیوں کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا..

کسی یونانی دیوی کے مجسمے کی مانند... بت بنا.. سمندر کو اپنی جانب لپکتا ہوا دیکھتا.. اور بے شک اُس کے عقب میں جو جہاز تھا اُس میں سینکڑوں افراد سوار ہوں.. بال رُوم میں رقص کرتے شور مچاتے ہوں.. ڈائننگ ہال میں گلاسوں اور چھری کانٹوں کی چھنک گونجتی ہو.. دھڑکتے دل اور خوبصورت چھاتیاں ہوں لیکن وہ اُن سے بے خبر ایک گارڈین اینجل کے کردار میں جہاز کی نوک پر کھڑا ہوا... اُس کے چہرے کو نمکین پانیوں کے چھینٹے بھگوتے ہوں اور وہ اُنہیں پونچھ بھی نہیں سکتا تھا.. اس لئے کہ وہ محض ایک مجسمہ تھا..

اور سمندر کے مقابلے میں تھا..

اُس کے ایک جہاندیدہ اور عملی رجحان رکھنے والے دوست کا کہنا تھا کہ ایک

عورت کو، کسی بھی عورت کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور اکثر اوقات اُسے اپنی محبت میں گرفتار کر لینا محض ایک باضابطہ اور میکانکی عمل ہے.. اس کے لئے خوش شکل ہونا، متاثر کرنے والی شخصیت یا ذہانت وغیرہ قطعی طور پر درکار نہیں... صرف پرچۂ ترکیب سامنے رکھ کر اُس پر شق در شق عمل کرتے جانا ضروری ہے... کوئی بھی مناسب شخصیت کا حامل مرد اگر شطرنج کے مہروں کی طرح ذرا سوچ سمجھ کر ایک طے شدہ ضابطے کے تحت چالیں چلتا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مطلوبہ نتائج بر آمد نہ ہوں... ملکہ کو مات نہ ہو..

ظاہر ہے یہی ضابطے، یہی چالیں صنفِ نازک بھی آسانی سے اپنا سکتی ہے اور بادشاہ کو زیر کر سکتی ہے..

عابدہ سومرو اسی باضابطہ اور میکانکی حساب کتاب کی ماہر کھلاڑی تھی جس کے نتیجے میں وہ کسی بھی مرد کو نیم دیوانگی کی حدوں تک لے جا سکتی تھی اور اُسے چت کر کے اُس پر سوار ہو سکتی تھی.. وہ ہرگز ایک پر تاثیر اور بندے کو اوندھا کر دینے والی عورت نہ تھی..

چھریرے اور لچکیلے بانس ایسی... ایک سکول گرل ایسے بدن کی.. ایک بیٹھی اور بھرائی ہوئی... بھری ہوئی جنسی آواز کی مالک عورت تھی جو اناڑی نہ تھی.. بساط پر بیٹھتی تھی تو طے کر کے بیٹھتی تھی کہ اتنی چالوں میں بادشاہ کو اوندھا کرنا ہے.. جو چند لمحوں میں اپنی عام سی شکل اور شخصیت کو بھلا دیتی تھی اور مرد اُس کی گہری گیلاہٹ سے بھری آواز کے بھنور میں ڈوبنے لگتا تھا۔

وہ بھی اُنہی دنوں اور وقتوں میں اُبھری جن دنوں غلافی آنکھیں مسلسل آنسو بہاتی تھیں.. وہ اُس کے آنسوؤں کے بیچ میں سے اپنی جگہ بناتی ایسے نمودار ہوئی جیسے وہ اُنہیں پونچھنے کے لئے آئی ہو..

خاور کو بہت دیر کے بعد احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے..

وہ ایک اور ٹیلی فونک کال تھی..

ابھی اُس جہاز نے لینڈ نہیں کیا تھا جس کے اندر غلافی آنکھوں نے اُسے شرمندہ کیا تھا..

ابھی اُس جہاز سے باہر آتے ہوئے اُس نے 'تم ایک شرمناک عورت ہو۔ میں آج کے بعد کبھی بھی تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا' نہیں کہا تھا..

بشیر اپنی نوبیاہتا بیوی کی آگ میں سلگتا بے چین ہوتا اُس کا کھانا لگا کر اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا.. بارہ کہو کے گھر کے اندر.. اپنے ڈرائنگ رُوم کے اکلاپے میں وہ ٹیلی ویژن سکرین کو دیکھے بغیر اُسے دیکھتا جا رہا تھا کہ اُسے بہر حال کچھ دیر تک جاگنا تھا.. اور اُسے یہ بھی آس تھی کہ شاید اُس کی تینوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کو اُس کا خیال آجائے اور وہ اُسے ٹیلیفون کر دے..

فون کی گھنٹی بجی تو وہ بے حد اشتیاق سے اُٹھا.. اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا کہ پُر اشتیاق ہونے کے باوجود اُٹھنے سے اُس میں ایک ٹیس بھی اُٹھتی تھی..

"ہیلو..."

یہ نہ اُس کی بے چین اور ٹیلی فون بل کو کم سے کم رکھنے کی کوشش میں کسی بیٹی کی چہکتی ہوئی ہائے ڈیڈ.. ہاؤ آر یو.. آر یو او کے.. میں ذرا جلدی میں ہوں.. گڈ بائے اور پلیز اپنا خیال رکھیں" آواز تھی اور نہ ہی دوسری جانب خلائی آنکھوں میں سے برستی کوئی سسکی تھی.. خاموشی تھی..

"ہیلو" اُس نے پھر کہا..

"سائیں آپ سو تو نہیں گئے..؟" یہ پہلی چال تھی..

"نہیں.."

"سائیں آپ اگر آرام کر رہے تھے تو ہم معافی کے خواستگار ہیں.. دوبارہ فون کریں گے"

"نہیں.. لیکن آپ کون ہیں؟"

"ہم تو آپ کے مرید ہیں سائیں.." یہ وہی آواز تھی. بیٹھی ہوئی.. جنس کی رطوبت میں گندھی ہوئی.. رچی اور نچڑتی ہوئی" آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا سرکار..."

"جی نہیں... فرمایئے.."

"سائیں اب اتنا فارمل ہو کر ہمارا دل تو نہ دکھایئے... ہم نے کیا فرمانا ہے.. فرمان تو آپ کا چلے گا.. آپ حکم کرنے والے ہیں اور ہم تعمیل کرنے والے..."

"آپ ہیں کون؟"

"ہم سے آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ہم کون ہیں.. ہمیں خبر ہوتی تو آپ کو بتا دیتے.."

خاور نے فون رکھ دیا..

ایسی کالیں آتی رہتی تھیں.. کوئی ابناکشس کال.. خاوند یا گھر والوں کی غیر موجودگی میں گئی رات گھر اکیلے تماشہ کرنے والی کال..

ابھی وہ واپس جا کر اپنے صوفے میں دھنسنے کو تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بلند ہوگئی.. بہت دیر تک اُس کے اعصاب پر دستک دیتی رہی.. اتنی دیر تک کہ اُسے شک ہوا کہ شاید اُس کی کوئی ایک بیٹی مسلسل کوشش کر رہی ہو..

"فون بند نہ کریں سائیں..." بھری ہوئی بھراتی ہوئی اُسی آواز نے سرگوشی کی

"آپ ہمارا دل نہ توڑیں.. بے رُخی نہ برتیں.. فقیر لوگوں کی صدا بھی سن لیا کریں.. فون تو بند نہ کریں.."

"میں.. آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" اُس نے زچ ہو کر کہا..

"سائیں جو کرنا ہے ہم نے آپ کے لئے کرنا ہے.. آپ کو پڑھتے ہیں' دیکھتے ہیں' سنتے ہیں.. تو پسند کرتے ہیں.. مرید ہیں آپ کے.. مرشد نظر کرے تو ہمارے دن بھی پلٹ جائیں.. بھاگ جاگ جائیں ہمارے.."

"خاتون میں تعارف کے بغیر آپ سے مزید گفتگو نہیں کر سکتا.. آپ پہلے بتائیں کہ آپ کون ہیں.."

ناراض نہ ہوں سائیں.." بہت لبریز.. بھری ہوئی اور بیٹھی ہوئی وہ آواز نگیرس گلوکارہ ارتھا کٹ ایسی تھی.. اگر تم چاہتے ہو تو تم حاصل کر سکتے ہو.. ایسی آواز.. اور وہ کسی صورت فون بند نہیں کرنا چاہ رہا تھا.. یہ ایسی آواز تھی.." ہم کیا ہمارا تعارف کیا.. آپ کی نظر کرم کے محتاج ہیں.. آپ کے در پر آئے ہیں تو آپ دھتکارتے ہیں.. بس ہمارا تعارف یہی ہے کہ ہم دھتکارے ہوئے لوگ ہیں اور آپ کی پناہ میں آنا چاہتے ہیں"

"دیکھیں اس قسم کی سوڈو صوفیانہ گفتگو پر مجھے بھی ملکہ حاصل ہے.." وہ جھلا گیا

"آپ اپنا تعارف نہیں کروائیں گی تو میں فون بند کر دوں گا.."

"فون تو رب نے ملایا ہے آپ کیسے بند کر دیں گے سائیں.... ویسے مجھ فقیر حقیر کو عابدہ سومرو کہتے ہیں.. ایک اچھی شکل کے نوجوان اور ڈیشنگ سندھی وڈیرے کی سندھی منکوحہ ہوں.. ایک بچی ہے میری.. دیہات کے رہنے والے دیہاتی ان پڑھ لوگ ہیں

سائیں.. ابھی ادھر کراچی شہر کے ڈیفنس ایریا میں جھگی ڈال کر گزارہ کرتے ہیں... پوسٹل ایڈریس اگر درکار ہے تو عرض کر دیتے ہیں.. ذاتی موبائل بھی حاضر ہے جو سینے کے ساتھ لگا رہتا ہے کوئی اور نہیں سن سکتا.. اس کے سوا کچھ اور حکم کرو تو وہ بھی بیان کر دیتے ہیں مرشد..."

وہ گڑبڑا گیا.. عجیب خاتون تھی... کم از کم اِس کے مرنے کے بعد وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتا.. اُس نے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھا تھا.. سب کچھ کھول کر بیان کر دیا تھا... وہ اگرچہ تھیئٹریکل انداز میں بات کرتی تھی جیسے یہ لہجہ اُس نے خصوصی طور پر اُس سے بات کرنے کے لئے اپنایا ہو.. اس کی ریہرسل کی ہو لیکن اُس کے لہجے میں بناوٹ نہ تھی ایک قدرتی بہاؤ تھا..

"آپ چاہتی کیا ہیں؟" اس کے سوا وہ اور کیا کہہ سکتا تھا..

"بس حاضری کے تمنائی ہیں سائیں.. آپ کے حکم کے بندے ہیں' آپ سے بندھے ہوئے ہیں' ذرا سی ڈور کھینچئے تو ہم چلے آئیں گے... یا آپ ادھر کا پھیرا لگا لیں.."

"کہاں کا؟"

"میں نے ابھی عرضی میں عرض کیا تھا کہ مریدوں کی جھگی کراچی میں ہے.."

"آئی ایم سوری لیکن... میرے لئے شاید یہ ممکن نہ ہو.." حالانکہ وہ ہر ہفتے کراچی جاتا تھا.. لیکن محض ایک فون کال پر کوئی بھی شخص.. خاص طور پر ایک عمر رسیدہ زوال پذیر شخص کیسے ایک انجانے اور تاریک جنگل میں اُتر سکتا تھا.. اگرچہ اُس کے اندر جو سدا بہار وجود قائم تھا اس کی انا کو بہت تشفی ہوئی' تقویت ملی..

"تو پھر ہم حاضر ہو جائیں سائیں اگر آپ اجازت بخشیں.."

سمندر مقابل میں تھا..

دونوں جانب بلند کناروں کے ذخیروں کے گنجلک وجود کے اوپر سویر کی ہوا سرسراتی ہوئی آتی تھی..

اس کے پاؤں تلے کچھ نہ تھا' وہ تنہائی اس آبی گزرگاہ کے درمیان میں معلق ایک ہی مقام پر کھڑا تھا اور دائیں بائیں جو کنارے تھے وہ گہری چپ میں سرکتے تھے..

کوئی ایک پرندہ نہیں کوکتا تھا..

کوئی ایک جھینگر نہیں ٹراتا تھا..

سطح' آب میں سے کوئی ایک مچھلی اُچھل کر اس غیر قدرتی ڈر سے لبریز چپ کو نہیں توڑتی تھی..

صرف عابدہ سومرو کی گہری بھرائی ہوئی سرگوشیاں تھیں جو بولنے لگی تھیں.. اور اُن کا ایک ایک لفظ واضح اور کھلا تھا.. وہ ایک کھلی کتاب تھی اور جانے اُسے کس کس نے کھولا تھا..

بارہ کہو کی پہاڑیوں کے پیچ و خم میں نو تعمیر شدہ تارکول کی سڑک کے کنارے جو بڑا پتھر تھا.. اُس کی کوکھ میں کچھ بھی نہ تھا..

یہ وہ بستی تھی جو صرف غلافی آنکھوں کی موجودگی سے آباد ہوتی تھی' یہاں چہل پہل شروع ہو جاتی تھی... لمبی تکونی دُم والا چھپکلا جھاڑیوں میں سے نکل کر سڑک کے پار جاتا تھا.. گھاس میں سانس آ جاتے تھے اور جھاڑیوں کے پتوں کی رگوں میں زندگی حرکت کرتی تھی.. اس کے بغیر یہ محض ایک بڑا پتھر اور ویرانے پر چلتی ہوا کی ہلکی بے جان سرسراہٹ تھی..

آج سویرے وہ اپنی مارننگ واک کے لئے معمول کا راستہ تبدیل کر کے خاص طور پر ادھر آیا تھا.. اگرچہ چڑھائی چڑھتے ہوئے اُس کے پاؤں تو کیا جو گرز بھی دُکھتے تھے اور سانس پھولتا تھا لیکن وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ غلافی آنکھیں کیا رات کی تاریکی میں یہاں آتی تھیں اور سنیکس اور ڈرنکس رکھ جاتی تھیں یا ملاقات طے ہو جانے پر پہلے ادھر آتی تھیں اور پھر مرگلہ روڈ تک واپس جاتی تھیں.. کیونکہ وہ کبھی بھی اپنے اس بھید کو ظاہر نہیں کرتی تھی..

اور اُس کوکھ میں کچھ بھی نہ تھا.. البتہ سڑک کے کنارے سگرٹوں کے مسلے ہوئے کچھ فلٹر تھے جن پر اُس کی لپ سٹک کے نامعلوم سے نشان تھے.. وہ شاید جب پھینکے گئے تو گہرے رنگ کے تھے لیکن دھوپوں نے اُنہیں دھندلا دیا تھا..

غلافی آنکھوں نے اُسے کل ملنا تھا...

وہ گھر لوٹا تو تھکاوٹ اُس کے گھٹنوں اور پنڈلیوں میں ایسے رچی ہوئی تھی کہ اُن

میں سے ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اگرچہ ایک طویل سیر کا بدن کو کھولنے اور متحرک کر دینے والا لطف بھی اُن میں شامل تھا اور اُنہیں قابل برداشت بناتا تھا..

ناشتے سے پیشتر وہ گریپ فروٹ کی نیم سرخ پھانکوں پر نمک اور سیاہ مرچ چھڑک رہا تھا جب فون کی گھنٹی نے صبح کی سیر کے بعد محسوس ہونے والی تھکن کے پر لطف احساس اور سکون کو زائل کر دیا..

"ہم حاضر ہو گئے ہیں سائیں.. اب حکم کریں.." براہ راست بغیر کسی تمہید کے...

"جی..." وہ ذہنی طور پر بالکل بلینک تھا ابھی تک بدن کے کھلنے اور تازگی کی کیفیت میں تھا اور اُسے فوری طور پر کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ کون ہے جو حاضر ہو گیا ہے..

"مرشد آپ بے رخی برتتے ہیں تو ہمیں اچھا لگتا ہے.. آپ فرمائیں تو ہم ایک مرتبہ پھر اپنا تعارف پیش کر دیں.. ہمیں یہ بھی اچھا لگتا ہے کہ آپ بھول جائیں اور ہم بتاتے رہیں کہ سائیں..." اور خاور اُسی لمحے اپنی سکوت بھری کیفیت میں سے باہر آ گیا کہ اُس کی بیٹھی ہوئی آواز کا بھنور ایسا تھا کہ اُس کی شناخت لاکھوں آوازوں میں سے فوراً الگ ہو جاتی تھی "نہیں نہیں.. وہ دراصل میں... آپ عابدہ سومرو ہیں؟"

"صرف عابدہ کہئے سائیں.. سومرو تو کوئی اور ہیں..." اُس کی آواز میں ایک ایسا تسلسل تھا جیسے وہ کسی سے مخاطب نہ ہو خود کلامی میں گم ہو "مرشد آپ نے ارشاد کیا تھا کہ آپ کا کراچی کا پھیرا نہیں لگتا تو ہم ادھر آپ کے شہر میں حاضر ہو گئے ہیں... مجھے افسوس ہے کہ آپ سے یہ کیوں پوچھا کہ آپ کراچی کا پھیرا لگاتے ہیں کہ نہیں.. متلاشی تو ہم ہیں' ہمیں کو آنا چاہئے تھا سو ہم آ گئے..."

وہ لفظوں کا بیوپار کرتا تھا.. اُن کے ہیر پھیر اور بناوٹ کا ایسا ماہر تھا کہ پرندوں کو درختوں سے اُتار سکتا تھا.. جالا بنتی مکڑی کو اُن کے زور سے پھنسا سکتا تھا.. یہ اُس کا کاروبار تھا لیکن گلے میں سے پھنس پھنس کر نکلنے والی اس آواز کے سامنے وہ بے بس اور لاچار محسوس کر رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہے.. یا تو وہ جھوٹ کی اس کاریگری میں اُس سے کہیں بڑھ کر ماہر تھی اور یا پھر وہ ایک بہت بڑا سچ تھی جس سے وہ آگاہ نہیں تھا..

"جی بالکل..." اُس نے صرف اتنا کہا..

"ہم آ گئے ہیں سائیں.."

"آپ کسی ذاتی نوعیت کے کام کے لئے اسلام آباد آئی ہیں؟" سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اُس نے بے حد سرکاری لہجے میں دریافت کیا اور فوری طور پر بے حد بیوقوف محسوس کیا..

"ہماری ذات آپ سے الگ تو نہیں ہے سائیں.. من تو شدی والا معاملہ ہے.. تو من شدی کا انحصار تو آپ کی نظر کرم پر ہے... فیڈرل لاج کے فیملی سویٹ ڈیرہ ہے.. اب آپ اجازت دیں تو ہم خود آستانے پر حاضر ہو جائیں.."

"جی جی.." وہ ابھی غلافی آنکھوں کے معمے کو حل نہیں کر پایا تھا اور ایک اور گتھل میں اُلجھ گیا تھا "لیکن آپ تو کراچی میں تھیں تو.."

"سائیں ان گورے کافروں نے جو یہ جیٹ ہوائی جہاز بنایا ہے تو صرف اس لئے بنایا ہے کہ یہ عشق کی مسافتوں کو مختصر کر کے مرشد کی چوکھٹ پر پہنچا دیتا ہے.. ہم پہنچ گئے ہیں.. آپ کے لئے.. تو اب حکم کریں..." وہ نہ کوئی رد عمل ظاہر کرتی تھی اور نہ اُسے کوئی جلدی تھی..

عجب آشفتہ سری تھی.. اگر تھی.. اور کیسی دیوانگی تھی.. اگر تھی.. اور وہ اس سے اب واقف ہو رہا تھا.. اس آشفتہ سری نے عمر کے اُن برسوں میں سر کیوں نہیں اُٹھایا دستک کیوں نہیں دی جب اس کی تمنا ہوتی ہے.. اس کی تڑپ میں جسم گھلتا اور بے چین ہوتا ہے.. خواہش اور حرص کا بھنیر سانپ پھن اُٹھا کر منتظر رہتا ہے کہ کوئی بدن ہو.. کیسا بھی ہو.. اور کسی بھی تناسب کا ہو اُس کو میں ڈس سکوں.. اپنے زہر سے نجات حاصل کر لوں.. تب یہ غلافی آنکھیں اور اپنے آپ کو نچھاور کر دینے والے مرید کہاں تھے.. اُس کے لُعاب میں کڑواہٹ بھری تھی اور وہ اُسے نگلنے میں دقت محسوس کرتا تھا "میں.. کچھ مصروف ہوں.. تو..."

"تو کیا ہوا.. ہم انتظار کرتے ہیں سائیں.. چوکھٹ پر پڑے رہتے ہیں جب تک دیدار کی اجازت نہیں ہوتی.. ہمیں دنیا کا اور کوئی کام نہیں... ہم ادھر پڑے رہیں گے جب تک کہ آپ کی مصروفیت ختم نہ ہو جائے اور جب تک.. ملاقات نہ ہو جائے"

"لیکن آپ کسی سلسلے میں مجھ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں؟" یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اب وہی پرندہ ہے جو درخت سے اُتر آتا ہے.. وہی مکڑی ہے جو اپنا تانا بانا ترک کر کے

پھنس جاتی ہے اور وہ بادشاہ ہے جو مات کھا چکا ہے اور اگر وہ اسی لمحے اُس سے غفلت برتنے لگے تو وہ اُس سے ملنے کے لئے اُس کی منت سماجت پر اُتر سکتا ہے.. اُسکے پاؤں پڑ سکتا ہے.. یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس نے اپنی باتوں سے اُس کے پنجے میں ایک ڈور باندھ دی ہے اور وہ لاکھ کوشش کرے اُس سے دور نہیں ہو سکتا.. ڈبکی لگائے تو بھی اُسی مقام پر رہے گا فرار حاصل نہیں کر سکتا.. اُس نے بے دلی سے یہی کہا کہ لیکن آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں..

"سلسلہ تو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ایک ہی ہوتا ہے سائیں.. اسے کوئی سا بھی نام دے دیں.. لیکن سلسلہ تو ایک ہی ہوتا ہے.. حکم کریں تو ہم آپ کے در پر آ جائیں؟"

"نہیں.." وہ جیسے ابھی تک نیند میں تھا یکدم بیدار ہوا" آج تو نہیں.. آج مجھے یہاں سے اسلام آباد جانا ہے ایک بہت ہی اشد ضروری کام ہے.. میں.. دراصل اتھارٹی کے بل ڈوزر کبھی کبھار ادھر آ نکلتے ہیں اور میرا گھر... نقشے اور اجازت کے بغیر بنا تھا تو.. مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ میرے گھر کو بھی مسمار نہ کر دیں تو اتھارٹی کے دفتر میں..."

"سائیں وہ سجدہ کریں گے' سلام کریں گے اور واپس چلے جائیں گے.. ہم مرشد کی چوکھٹ کی حفاظت کریں گے... اپنے سسر کو کہہ دیں گے کہ ایسا نہ ہو.. اور ایسا نہیں ہو گا.. آپ اس کام کے لئے تو اپنے آستانے سے نہ نکلیں سائیں.. مجال ہے کسی کی.."

"تھینک یو.. لیکن.. وہ.. مجھے بہر طور اتھارٹی کے دفتر جانا ہے یہ طے ہے.."

"دفتر تو سائیں دو بجے بند ہو جائیں گے.."

"تو میں وہاں سے فارغ ہو کر... واپسی پر.. میں پوری کوشش کروں گا تو.."

"آنکھیں بچھائے منتظر ہیں سائیں... سرمد کی طرح.."

"سرمد؟"

"ہاں سائیں.. وہ بھی تو انا الحق کہتا تھا.. اور ہم بھی یہی کہتے ہیں..

آنکس کہ ترا کار جہانبانی داد۔ مارا ہم اسباب پریشانی داد

پوشانہ لباس ہر کرا عیب داد۔ بے عیباں را لباس عریانی داد

اُس کا فارسی لہجہ اہل فارس کی مانند تھا.. اگرچہ اُن کے نصیب میں ایسی بھرائی ہوئی

بھنور میں ڈوبتی آواز نہ تھی..

اونچے کناروں کے درمیان جو خاموش پانیوں کی نہر سکوت میں تھی اُس میں کوئی بھنور نہ تھا.. ایک ہلکی سی لہر بھی نہ اُٹھتی تھی..

نہ کوئی پرندہ.. نہ جھینگر اور نہ کوئی مچھلی..

ایک سناٹے میں سفر کرتی ایک کشتی.. اور اُس کی نوک پر بُت بنا کھڑا ایک شخص جس کے چہرے کو پانی کے چھینٹے نہ بھگوتے تھے..

ان بل ڈوزروں نے کل خدائی کو ڈھا دینا تھا.. اُس کی چوکھٹ کو سجدہ کرنا تھا اور سلام کر کے واپس چلے جانا تھا.. مرشد کی چوکھٹ کی حفاظت اُس کا مذہب تھا..

اگر تصور میں کہیں اس کشتی پر اس لمحہ سکوت میں.. اس سناٹے میں عابدہ سومرو اُس کے برابر میں کھڑی ہوتی تو کیا اُس کا صوفیانہ انداز کلام برقرار رہتا یا وہ ایک عام عورت ہو جاتی.. پکھی کے بھاری کولہوں اور بھرے ہوئے سینے کو دیکھ کر حسد میں مبتلا ہو جاتی.. اُسے سرور اور جعفر سے گھن آتی اور اُن دونوں کے درمیان مرشد اور مرید کا رشتہ تڑک کر کے ٹوٹ جاتا اور وہ کہتی "ڈیم اِٹ.. گیٹ می آؤٹ آف ہیئر..."

لیکن یہ تصور ممکن نہ تھا.. کیونکہ غلافی آنکھیں اپنی احتیاط پسند خصلت میں سراسر آؤٹ ڈور تھیں.. اور عابدہ سومرو ایک ان ڈور برڈ تھی جو دن کے وقت بھی بیڈروم کے پردے کھینچ کر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں گہرے سانس لیتی تھی..

سندھ کا وسیع پاٹ اگرچہ یہاں سے دکھائی دے رہا تھا لیکن ابھی ایک طویل فاصلے پر تھا اور فی الحال اونچے کناروں کے گھنے ذخیرے تھے اور چپ تھی..

فیڈرل لاج کے فیملی سویٹ نمبر انیس کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا..

اُس کے اندر دھندلے سے لیمپ کی جو روشنی تھی وہ طویل برآمدے کی تاریکی میں ایک عمودی روشن لکیر کی صورت دروازے کے وا ہونے کا پتہ دیتی تھی.. اسی لئے اُسے دستک دینے کی ضرورت پیش نہ آئی..

وہ اُسے احتیاط سے ڈرتے ڈرتے دھکیل کر اندر چلا گیا..

باہر سے بالکل اندازہ نہ ہوتا تھا کہ فیملی سویٹ اندر سے ایک ہوٹل کالٹن اور روزویلٹ ہوٹل کی مانند ایک قدیم اور شاہانہ اقامت گاہ کی مہک میں رچی ہے.. بلند چھتیں ہیں جن کے قدیم شہتیروں پر تازہ سفید پینٹ ابھی تک لشکتا ہے اگرچہ لیمپ کی روشنی وہاں تک بمشکل پہنچتی تھی.. بھاری اور بڑے وجود کے صوفے ہیں.. فرش پر شکارگاہ ڈیزائن کے اگرچہ بوسیدہ ہو چکے ایرانی قالین ہیں لیکن اُن پر بنے ہوئے ہرنوں اور لپکتے چیتوں کی آنکھیں ابھی تک زندہ ہیں اور قالینوں کی بُنتر سے الگ ہو کر آپ کو دیکھتی ہیں.. دیواروں پر کانسٹیبل کی لینڈ سکیپ پینٹنگز کی سنہری فریموں میں جڑی ہوئی کاپیز ہیں جن میں ایک سست اور مدھ بھرا اور سرسبز ندیوں اور درختوں میں سے جھانکتا انگلستان ہے..

یہاں برطانوی راج پوری شان و شوکت اور آب و تاب سے ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا..

اُسے دیکھ کر وہ کچھ کہے بنا خاموشی سے اُٹھی.. بھاری وکٹورین صوفے میں سے بلند ہوئی کہ وہ بلند قامت تھی.. ایک مہنگے سلک گاؤن کے اندر حرکت کرتی ہوئی اُس کے قریب آئی اور کچھ کہے بغیر اُسے اپنی لامبی بانہوں میں لپیٹ لیا اور پھر اُس کے شانے پر سر رکھ کر ایک مجسمے کی طرح ساکت ہو گئی.. اُس کا چھریرا لچکیلا بانس بدن ہولے ہولے تھراتا تھا.. خاور کے بازو نہ اُسے لپٹا سکتے تھے اور نہ ہی فضا میں معلق رہ سکتے تھے..

"تھینک یو فار کمنگ..."

"جی..."

"سرمد منصور نے کہا تھا جو آپ کی طرح ایک مرشد ہیں..." وہ اُس کے شانے پر سر رکھے بولتی رہی.. اُس کے بالوں میں سے تازہ شیمپو کی مہک آتی تھی.. "اُنہوں نے فرمایا تھا کہ... وہ جس نے تمہیں حکومت عطا کی.. اُسی نے ہمیں بھی پریشانی کے اسباب دیئے.. جس کے اندر اُسے عیب نظر آیا اُسے لباس دے دیا اور جو بے عیب تھے اُنہیں لباسِ عریانی دیا.."

ریشم کے مسلے جانے والی کیفیت میں مبتلا گاؤن کے اندر... اُس میں مشکل سے پوشیدہ.. گاؤن کے نیچے لباسِ عریانی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور وہ جو کچھ بھی تھا وہ دھڑکتا ہوا اُس کے سینے پر دستکیں دیتا تھا..

"آپ نے ہمیں پریشانی کے اسباب دیئے.." وہ کہتی گئی اور اُس نے اب تک نہ اُس کا چہرہ دیکھا تھا اور نہ شکل سے واقف ہوا تھا صرف اُس کی بے عیب ذات کے لمس سے شناسا ہوا تھا.. خاور نے ایک سراسر اجنبی اور انوکھے تجربے سے پہلی بار روشناس ہوتے.. اپنے ڈھلکتے ہوئے بدن پر ایک کھنچے ہوئے' تنے ہوئے وجود کی حدت محسوس کرتے اور جواب میں ایک سرد اور خزاں آشنا وجود کی ٹھنڈک اور منجمد ٹھہراؤ لئے اُسے ایک نامردگی کے عالم میں اپنے بازوؤں کے حلقے سے الگ کیا... تو وہ الگ ہو گئی.

اور اُسی لمحے خاور نے مختصر لاؤنج میں رکھے بھاری صوفوں کے سامنے اُس قالین کو دیکھا جس پر ایک آٹھ نو برس کی دُبلی سی بچی ایک کھلونا ریل گاڑی میں چابی بھرتی تھی اور اُسے قالین پر کنڈلی مارے پٹڑی پر چھوڑتی تھی' ریل گاڑی یکدم تیزی سے اپنے ٹریک پر چل کر فوراً ہی اوندھی ہو جاتی تھی اور بچی نہایت بیزاری اور بے دلی سے اُسے اُٹھا کر پھر سے اُس کی چابی گھمانے لگتی تھی.. وہ بظاہر اُس کی موجودگی سے بے خبر تھی یا باخبر ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش میں تھی.

خاور نے بہت عجیب سا محسوس کیا کہ وہ ابھی اُس سے الگ ہوا تھا.. اور وہ بھی وہاں تھی..

"سویٹی..." اُس کی.. عابدہ سومرو کی آواز اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے بالکل مختلف اور نارمل تھی اُس میں بھراہٹ نام کو نہ تھی.. جیسے کوئی بھی ماں اپنی بچی کو بلاتی ہے..

بچی نے نہ اُس کی جانب نگاہ کی اور نہ ہی جواب میں کچھ کہا صرف گاڑی کو چابی دینا موقوف کر دیا..

"سویٹی.. آپ نے انکل کو سلام نہیں کیا شوگر..."

سویٹی نے نظریں اُٹھائے بغیر یہ دیکھے بغیر کہ اُدھر کون اور کونسے انکل ہیں ایک ناگواری کا "ہیلو انکل" کہا اور پھر سے اپنے کھلونے میں چابی بھرنے میں مصروف ہو گئی..

"ڈو یو کیئر فار اے ڈرنک؟"

"نو تھینک یو.."

"جُوس آر سم تھنگ.."

"نہیں..."

"پلیز گومی اے سگرٹ.." اُس کی لامبی انگلیاں بھی کپکپاتی تھیں پاگل خانے کی طرح لیکن ان دونوں کی کپکپاہٹ میں کہیں کوئی فرق تھا.. لرزش کی وجوہات مختلف تھیں..

اُس نے اپنے لئے بھی ایک سگریٹ سلگالیا.. وہ باتوں کے گنجلک فریب میں اُلجھ کر آگیا تھا.. اُس کی مردانہ انا کو باتوں کے انجکشن نے جو سرور دیا تھا اُس کے تابع وہ یہاں چلا آیا تھا.. ایک عجیب و غریب صورت حال میں جو عام فہم نہیں تھی..

وہ چپ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا.. سٹیج پر پرفارم ہونے والے ایک بالکل سمجھ میں نہ آنے والے ڈرامے کے تماشائی کی طرح چپ بیٹھا رہا.. دل ہی دل میں پچھتاوے کی ایک شدید لہر تھی کہ میں نے ٹکٹ خریدنے سے پیشتر بل بورڈ پر نظر کیوں نہ ڈالی.. اچھی طرح اطمینان کیوں نہ کرلیا کہ اس کھیل کو لکھنے والا کون ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے...

وہ بھی یقیناً کانونٹ سلف تھی بلکہ اس سے بھی کہیں آگے کا نسخہ تھا.. یہ وہ مواد تھا جو کسی بھی جائز یا ناجائز خواہش بھلے یہ بدن کی ہو یا زندگی کرنے کی.. وہ اُس کی ناتمامی اور ناآسودگی سے آشنا نہ تھا.. ویک اینڈز پر کسی سوس ریٹریٹ میں جاتا تھا.. بی ایم ڈبلیو یا مرسڈیز کاروں سے کہیں برتر تھا.. مانٹی کارلو ہاربر میں لنگرانداز کسی یاٹ میں کاک ٹیل پارٹیز کو ایک نارمل روٹین سمجھتا تھا بلکہ اُس سے بھی اُکتا چکا تھا اور زبان نہایت میٹھی ملائم اور کلچرڈ رکھتا تھا اور اپنے آپ کو درویشوں اور فقیروں کی صف میں شمار کرتا تھا... یہ سب کچھ عیاں تھا.. سٹیج پر لائٹنگ بہت مؤثر اور دھیمے سروں میں تھی.. اور صرف دو کردار نیم تاریکی میں سے اُبھر کر واضح ہو رہے تھے.. قالین پر اپنے کھیل میں مگن بچی سٹیج کے ایک کونے میں اور عابدہ سومرو اُس کے مقابل میں صوفے میں دھنسی ایک مرکزی کردار کی صورت میں اپنے مکالمے بولتی تھی اور اُس کے سگرٹ کی راکھ تیزی سے بڑھتی جاتی تھی..

"آپ آگئے تو ہم پر کرم کیا سائیں.. بس اپنا حال احوال سنانا تھا.. جب بھی آپ کو سکرین پر دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ اگر اپنا حال کہنا ہے تو اسی کو کہنا ہے.. کوئی اور نہیں ہے سائیں جو ہمارا حال سنے 'ہمارا محرم ہو جائے.. تمہیں کیا پتہ سائیں کہ ہم کراموبیل ہاسپٹل میں بیمار پڑے تھے اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا. تمہیں کیا پتہ..."

اُس کے بدن کے تانے بانے میں تھکاوٹ اور پژمردگی میں کوئی ایک گرہ تھی جو اُسے دیکھنے سے ذہن میں اٹکی تھی 'اُلجھن سے دوچار کرتی تھی... بس یہی تھی.. وہ تندرست

نہیں تھی.. اُس نے "تمہیں کیا پتہ.." اس انداز میں بھی نہیں کہا تھا کہ وہ فوری طور پر افسوس کے لہجے میں پوچھے کہ کیا ہوا تھا.. لیکن اس کے بعد وہ شاید اپنا لہجہ بھول گئی یا اُسے جان بوجھ کر ترک کر دیا اور مرشد اور مرید کے کردار سے نکل گئی اور جیسے نارمل انداز میں اپنی بیٹی سے مخاطب ہوتی تھی ویسے بولنے لگی "میں وہاں بالکل اکیلی پڑی تھی اور ڈاکٹروں کو حیرت ہوتی تھی کہ مجھے کوئی بھی ملنے نہیں آتا.. ہاں سائیں ایسا ہی ہوا تھا میرے ساتھ... خدا بخش' میرا خاوند بھی میری خبر کو نہ آیا.. اُس کو اپنی سیاست سے ہی فرصت نہ تھی.. پیروں فقیروں کا بیٹا تھا مریدوں کے دم درود سے ہی فرصت نہ تھی.. لیکن فون روزانہ کرتا تھا.. پھولوں کے انبار ہر روز پہنچتے تھے.. ڈاکٹروں کو ذاتی طور پر ہدایات دیتا تھا میری حالت کی پوری خبر رکھتا تھا لیکن خود نہیں آتا تھا... گرنڈلیز کا ایک اکاؤنٹ صرف میرے نام تھا اور میں صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اُس میں کتنی رقم جمع ہے چیک کاٹتے ہوئے خواہ مخواہ دو تین صفر بڑھا دیتی تھی اور تب بھی وہ کیش ہو جاتا تھا... لیکن یہ تو کافی نہیں ہوتا سائیں.. رفاقت چاہئے ناں سائیں' محبت درکار ہوتی ہے.. انسان مرتا ہو تو اذیت کی شدت میں نرس کا ہاتھ تھامے ہوئے رونا تو آتا ہے ناں.. اور میں.. کوئی گری پڑی چیز تو نہیں تھی.. وہ مجھے کسی کوٹھے سے اُتار کر تو نہیں لایا تھا.. میرا باپ بھی وڈیرہ ہے' آدھے سندھ کا مالک ہے... اُس کی لینڈ کروزر ہماری زمینوں پر چلتی ہے تو اُس کے ٹائروں کے نیچے سے جو دھول اٹھتی ہے اُس کے ہر ذرے سے ایک خدا بخش بن سکتا ہے.. لینڈ کروزر کا ڈیزل ختم ہو جاتا ہے پر میرے بابا سائیں کی زمین ختم نہیں ہوتی.. تو میں گری پڑی شے نہیں ہوں.. میں آکسفورڈ میں تھی.. اور یہ جو تمہارا عمران خان ہے... امی... تو میرا کلاس فیلو تھا.. یہ کرسٹینا اور جمائمہ تو بہت بعد کی پیداوار ہیں' وہ مجھ پر مرتا تھا... منت کرتا تھا میرے پاؤں پکڑتا تھا کہ شادی کے لئے مان جاؤ پر سائیں میں کیسے مان جاتی.. میں تو ایک حیادار مشرقی لڑکی تھی اونچے خاندان کی تھی کیسے مان جاتی.. جمائمہ کے بعد بھی میرے پاس آتا رہا.. منت کرتے ہوئے میری کلائی اتنے زور سے تھامتا تھا کہ ابھی تک وہاں درد ہوتا ہے.. پھر میں ہارورڈ میں چلی گئی سائیں.. اسی سے پیچھا چھڑانے کے لئے.. اور وہاں خدا بخش ٹکر گیا.. جانے اُسے وہاں داخلہ کیسے مل گیا تھا پر ان وڈیروں کے بڑے کونیکشن ہوتے ہیں.. خدا بخش اسی کی طرح متکبر نہ تھا' دھیمے لہجے میں مٹھاس سے بات کرتا تھا... ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو جاتا تھا... رونے لگتا تھا' چپ نہ ہوتا تھا' کہتا تھا میں مر

جاؤں گا تمہارے بغیر.. اور وہ واقعی مر جاتا اگر میں اُس کے ساتھ شادی نہ کرتی... میں نے شادی کر لی سائیں.. "اُس کی آنکھیں بھرنے لگیں' بدن کپکپانے لگا جیسے اُسے سردی لگ رہی ہو" اور وہ میری خبر تک نہ لینے آیا کرامویل ہوسپٹل لنڈن میں اور میں مر رہی تھی.."

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اُس میں ریا اور مکر کا شائبہ تک نہ تھا.. جو کہہ رہی تھی دل سے پورے یقین سے کہہ رہی تھی.. خاور اپنے تجربے کی بنا پر یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کامیاب اداکاری نہیں کر رہی.. اس میں اگر فریب کا دھوکے کا ایک ذرہ بھی ہوتا تو وہ فوراً اُس کی چبھن کو محسوس کر لیتا.. اُسے اُس پر ترس آنے لگا..

وہ سر جھکائے اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی رہی اور اُس کا ناتواں بدن ہر سسکی کے ساتھ کانپتا...

وہ ذرا آگے ہوا اور اُس کے گھٹنے کو تھپک کر کہا.. آئی ایم سوری..

گھٹنے پر تھپک ایک دستک تھی جس سے دروازہ وا ہو گیا' وہ اپنے دُکھ میں سسکتی پہلو بدل کر اس کے ساتھ آ گئی.. وہ مختصر وجود کی مالک تھی اور زیادہ جگہ نہیں گھیرتی تھی اور اُس کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا..

بے عیبوں کو دیا جانے والا لباس عریانی نہ صرف محسوس ہوتا تھا بلکہ متحرک کرتا تھا..

اُس کی بیٹی اپنی ریل گاڑی میں مگن تھی اور ماما کی جانب اُس نے ایک بار بھی نہ دیکھا کہ وہ کس حال میں ہے.. اُس پر کیا گزرتی ہے وہ کیوں روتی ہے..

"سائیں' خدا بخش جو ہے..." اُس کے سانسوں کی ہواڑ خاور کے کان کی لویں گرم کرتی بولتی تھی اور بانس کی لچک اُس کے گرد لپٹتی تھی.... ایک بوڑھے ٹیگرو کی مانند بیٹھی ہوئی درد انگیز آواز میں وہ اپنی بپتا سناتی تھی "اُس کے لئے تو میں ایک آب جیکٹ ہوں.. نمائش کے لئے.. وڈیروں کی بیٹیاں کہاں اتنی پڑھی لکھی ہوتی ہیں.. آکسفورڈ اور ہارورڈ... اور کہاں ایسے ڈریس کرتی ہیں کہ لوگ ماڈلز کو بھی بھول جائیں اور اُنہیں دیکھتے رہیں.... بیچ پارٹیز پر.. سیاسی جوڑ توڑ کے ڈنرز پر... وہ اپنے آپ کو مجھ سے نمایاں کرتا ہے... اُس کے بابا سائیں کو تم بھی جانتے ہو.. فیڈرل منسٹر ہے.. اسی لئے تو ہم نے کہا تھا سائیں کہ انتارٹی کے بل ڈوزر کل خدائی کو ڈھا دیں گے پر آپ کی چوکھٹ پر آکر سلام کریں گے اور چلے جائیں گے.. اُن کی مجال نہیں.. سائیں آپ کی ٹانگیں تھک تو نہیں گئیں.. میرا وزن تو بیماری سے

بہت گھٹ گیا ہے... آپ کہو تو میں اُٹھ جاؤں.."

اُس نے صرف سر ہلایا..

"اور تم یقین نہیں کرو گے..." وہ بڑی آسانی سے پھر نارمل انداز کی طرف لوٹ آئی "ہاں سائیں جو باہر کے لوگ ہوتے ہیں وہ یقین نہیں کرتے کہ ایسا بھی ہوتا ہے لیکن بڑے سومرو صاحب جب ڈرنک ہو جاتے ہیں تو اپنے بیٹے کے سامنے مجھ سے فلرٹ کرنے لگتے ہیں اور خدا بخش بہت خوش ہوتا ہے کہ بابا سائیں اُس کی بیوی کو یہ اعزاز بخش رہے ہیں... لیکن مجھے بابا سائیں سے کچھ خدشہ نہیں' وہ بالکل خلاص ہو چکے ہیں.. مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں اُن کی کونسی اور مجھ سے بھی کم عمر بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ بڑے سائیں بس چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اور کچھ نہیں... وہ میری ہمراز ہے.. مجھے سب کچھ بتا دیتی ہے.."

خاور نے کن اکھیوں سے بچی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بے حد مصروف تھی اور پھر مسکرا کر کہا "مجھے یقین ہے کہ اُن کا بیٹا تو کچھ بہتر ہو گا..."

"نہیں سائیں.." اُس نے اُس کی کمر میں گدگدی کرتے ہوئے نہایت معصومیت سے اپنے آنسو پونچھے اور ہنسی روکتے ہوئے سرگوشی کی "وہ تو بابا سائیں سے بھی گیا گزرا ہے.. اُس نے تو پہلی رات ہی مجھ سے معافی مانگ لی تھی.. یہ وڈیرے لوگ کم سنی میں ہی اپنی عمر سے بڑی خرانٹ اور تجربہ کار گھریلو خادماؤں اور مزارعوں کی بیٹیوں کے ساتھ چُہلیں کرنے لگتے ہیں.. اور جب ہم تک پہنچتے ہیں تو خلاص ہو چکے ہوتے ہیں.. اُنہیں عادت ہوتی ہے ناں سائیں خدمت خاطری کی.. ہر شے کی حاضری کی.. خود کچھ نہیں کرتے سب کچھ اُن کے لئے کر دیا جاتا ہے تو جب سب کچھ خود کرنا پڑتا ہے تو رہ جاتے ہیں.."

"اور... یہ بیٹی.."

"بھولے ہو سائیں.. وہ پھر ہنسی.. اور ہنسنے سے اُس کا چھریرا وجود لچکتا ہوا اُس میں سمٹتا گیا "اتنا بندوبست تو ہو جاتا ہے ناں... کچھ ہاتھ پاؤں مار کر..."

پھر وہ چپ ہو گئی..

بہت دیر تک اُس کے کندھے پر ماتھا ٹکائے اور آزردہ اور گمشدہ بچے کی طرح آرام کرتی رہی.. جیسے نیند میں اُتر گئی ہو...

لیمپ شیڈز کی روشنی اونچی چھت کی کڑیوں میں سائے اور نقش بناتی تھی..

صرف ایک چابی کے گھمانے کی گرر گرر کی آواز آتی تھی اور بچی مگن تھی..

"پلیز ہیلپ می.." وہ یکدم اپنی نیند سے بیدار ہوئی۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں اور اُن میں تھکاوٹ اور بیزاری تھی "پلیز..."

اُس کی آواز میں اتنی رقت تھی.. نارسائی کی دُکھ بھری اتنی کسک تھی کہ اُس کی آنکھیں بھی نمی سے دوچار ہوئیں' وہ حقیقت کی سطح سے نیچے اُن گہرائیوں میں اُتر گیا جہاں صرف وہ تھی.. اپنی گہری سسکتی ہوئی آواز کے ساتھ.. اپنے اُس سلک گاؤن میں جس کے نیچے اگر کچھ تھا تو عیب عریانی کے سوا کچھ نہ تھا..

"ہم تمہیں جب بھی دیکھتے تھے تو دل پہ ہاتھ پڑتا تھا.. تم ہمارے دل پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھو"

عیب برہنگی کے سوا دل کے راستے میں اور کوئی عیب نہ تھا..

بچی نے ایک مرتبہ پھر ریل گاڑی کے پٹڑی سے اُتر جانے پر جھلا کر اُسے اُٹھایا' ایک نظر ماما کی جانب دیکھا.. انکل کی طرف دیکھا.. اور سر جھکا کر مکمل لاتعلقی سے پھر اپنے کھیل میں مشغول ہو گئی..

"پلیز ہیلپ می..."

وہ اُس پر حاوی ہو گئی... خاور کے زوال پذیر بوسیدہ وجود کے باوجود اُس پر حاوی ہو گئی اور عیب برہنگی کو بھی عیب نہ رہنے دیا' عیاں کر دیا.. کہ یہی اناالحق تھا..

کشتی جیسے اُس آبی گزرگاہ کے سناٹے سے زیر ہو کر تھم گئی تھی.. اگرچہ دونوں کناروں پر اُبھرے ہوئے گھنے ذخیرے آہستگی میں حرکت کر رہے تھے.. اتنی خاموشی تھی.. اُسے اپنے سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی..

"ماماں جعفر..."

"جی سائیں.." کشتی کے پچھلے حصے میں سے اُس کی آواز تیرتی ہوئی خاور کے کانوں میں آئی..

"کشتی رُک گئی ہے؟" خاور نے پلٹ کر پوچھا اور پہلی بار اُس کی نگاہ نہر کے اُن پانیوں پر گئی جو پیچھے رہ گئے تھے اور سندھ کی وہ شاخ اب خاصی دور تھی جہاں سے وہ اس

تنگنائے میں داخل ہوئے تھے..

"نہ سائیں.." جعفر بدستور چپو تھامے کھڑا تھا "چلتی کھڑی ہے... بس اودھر ہوا کا میل ہو گیا ہے.. تو لگتا ہے کہ رُکی کھڑی ہے.. مامن ماسا بتاتا ہے کہ اُس کے زمانوں میں ادھر کسی پیر سائیں اور پانی کی عورت کا ملاپ ہوتا تھا.. پھر وہ عورت جس کا آدھا دھڑ مچھلی کا تھا پیر سائیں کو پانی میں لے گئی.. وہ کہتا تھا کہ وہ اب بھی اس نہر کی تہہ میں گھر بنائے کھڑے ہیں اور ہنسی خوشی رہتے ہیں پر وہ اودھر سے کسی کشتی کو گزرنے نہیں دیتے.. اُن کے گھر کے اوپر سے جو شے گزرتی ہے اُسے نیچے بلا لیتے ہیں.. تب سارے مہانے اوپر سے پینڈا کر کے سندھ کے ملاپ کو جاتے تھے... پر ایسا نہیں سائیں.. مامن ماسا تو اوپر دماغ میں ہل گیا ہے اور بوٹی پی پی کر بھاوا ہو گیا ہے اس لئے ایسی باتیں کرتا ہے.. میں اور سرور تو ہمیشہ ادھر سے آتے ہیں پر کلمہ شریف پڑھ کے آتے ہیں تو ہمیں تو پیر سائیں اور اُن کی عورت کچھ نہیں کہتے.. آج کچھ بات ہو گئی ہے یا لگتا ہے کہ ہو گئی ہے.. بس ذرا ہولے سے آگے بڑھتی ہے.. پانی میں تیرتے تنکے دیکھو تو وہ پیچھے رہتے جاتے ہیں.. کنارے بھی ایک جگہ نہیں کھڑے تو کشتی چلتی ہے سائیں فکر نہ کرو.. آج بھی کلمہ پڑھ کر آئے تھے.."

سامنے سندھ کا چوڑا پاٹ بہت دیر سے دکھائی دے رہا تھا لیکن اتنا ہی دکھائی دیتا تھا جتنا بہت دیر پہلے دکھائی دیتا تھا نزدیک نہ آتا تھا..

"ابھی تک کوئی ڈولفن نظر نہیں آئی جعفر... شنید تھی کہ ان پانیوں میں بہت ہیں' اودھر بسیرا کرتی ہیں.."

"جی سائیں؟" جعفر کی شکل سپاٹ تھی اور اُس پر حیرانی کا ایک سیاہ رنگ تھا "کیا بولتے ہو سائیں.."

"ڈولفن.."

"جی سائیں؟"

"سائیں بُلھن کا پوچھتے ہیں جعفر..." فہیم سوتے میں بڑبڑایا "بُلھن..."

"ہاں آں بُلھن... وہ تو مرضی کی مالک ہے سائیں' دیدار نہیں کروانا چاہتی تو اُس کے ساتھ زبردستی کون کرے.. پر ملاپ کے آس پاس ضرور دکھائی دے گی' جہاں پانی ملتے ہیں آپس میں.. اُودھر سندھ کے اندر دونوں طرف سے جب لہریں آتی ہیں تو وہاں ایک

علاقہ بنتا ہے جہاں پانی بالکل اطمینان سے ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ایک بڑے گھڑے میں ہوں تو اُدھر بہت مچھلی ہوتی ہے.. اور اُسے کھانے کے لئے بلہن آتی ہے.. اُدھر دیدار کرائے گی...''

''اندھی ہوتی ہے؟''

''آنکھیں نہیں ہوتیں پر اندھی تو نہیں ہوتی سائیں... قدرت کی مرضی سے جسے دیکھنا چاہے دیکھتی ہے جسے نہ دیکھنا چاہے نہیں دیکھتی... عورت کی مانند!''

کشتی ٹھہری ہوئی لگتی تھی اگرچہ نہیں تھی..

عابدہ سومرو' غلافی آنکھوں کی مانند ایک کراس ورڈ پزل نہیں تھی جس کے تمام خانے خالی ہوں..

اُس کے خانے ہی نہیں تھے..

وہ ایک جگ سا پزل تھی.. لیکن اُس کے بہت سے ٹکڑے ملتے نہیں تھے چنانچہ لاکھ جوڑنے کے باوجود جو تصویر بنتی تھی اُس میں بے ڈھنگے خلا باقی رہ جاتے تھے.. وہ گمشدہ ٹکڑے اُس نے جان بوجھ کر اوجھل نہیں کر رکھے تھے' وہ تو کچھ بھی نہیں چھپاتی تھی.. ہر عیب کو عیاں کرتی تھی لیکن تصویر مکمل نہیں ہوتی تھی.. اور ہر ملاقات پر گفتگو کے بعد اُس جگ سا پزل کے ٹکڑوں کے نقش بدل جاتے تھے.. جو تصویر پہلے بنتی تھی ہر بار بدل جاتی تھی اور کچھ اور بن جاتی تھی..

خاور نے ایک شام جب زیرو پوائنٹ نیم تاریکی کے نرغے میں آ رہا تھا اور وُہ واپس جانے کو تھے غلافی آنکھوں کو اُس کے بارے میں بتایا.. فیڈرل لاج میں جو کچھ بیتا تھا ہو بہو نہیں کہیں کہیں سے بتایا.. ایک بری طرح سنسر شدہ فلم کی طرح.. اُس کی آنکھیں دمکنے لگیں اور پھر آنسوؤں سے بھر گئیں لیکن اُن کا پانی بھی دمکتا تھا.. وہ خوش لگتی تھی..

''واقعی؟''

''ہاں...''

''یہ تو کوئی انہونی سی کہانی لگتی ہے..''

''میں اگر اُسے یہ بتاؤں کہ تم اپنے آخری بیٹے کو بیاہ کر سیدھی میرے پاس آ گئی

تھی اور تمہیں میری وارڈروب کی ایک ایک شے کا علم ہے اور تم مجھے ایک کوٹھڑی میں بند رکھنا چاہتی ہو تو وہ بھی یہی کہے گی..''

''میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں..'' نہ حسد نہ رقابت' وہ ایک بچے کی طرح پُر مسرت تھی..

''مجھے ابھی خود نہیں معلوم کہ میں اُسے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں یا نہیں..''

''نہیں نہیں خاور... یہ نہ کرو.. اُسے ضرور ملو.. پلیز پلیز..'' اُس نے بچوں کی طرح ہی سر ہلاتے ہوئے آنکھیں جھپکتے اصرار کیا..

''کیوں؟ تمہیں اس سے کیا غرض ہے' کیا دلچسپی ہے..''

''کیونکہ جو میں کہتی ہوں اُس نے اُس کی تصدیق کر دی ہے.. جو میں محسوس کرتی ہوں اُس نے اُن محسوسات پر سچائی کی مہر ثبت کر دی ہے... ایک ہسپتال میں ایک ہی نوعیت کے دو کیس آ جائیں تو معالج کو یقین آ جاتا ہے کہ یہ بیماری عام ہے.. اور وہ پوری سنجیدگی سے اُن کا علاج کر سکتا ہے.. وہ اور میں ایک ہی پاگل پن کا شکار ہیں اس لئے میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں.. مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل مجھ جیسی ہو گی..''

''نہیں تم دونوں بالکل مختلف ہو.. الگ دنیا میں ہو.. تم میں کچھ بھی مشترک نہیں.. سوائے ایک جذبے کے جس کے بارے میں میں ہمیشہ اُلجھن میں مبتلا رہتا ہوں کہ مجھے اس پر نازاں ہونا چاہیے یا میرے کردار اور میری زندگی میں کوئی ایسی کجی ہے کہ صرف ابنارمل عورتیں مجھ پر مہربان ہوتی ہیں..''

''میں تم پر مہربان نہیں ہوئی.. تم مجھ پر مہربان ہوئے ہو کہ مجھے ملنے سے انکار نہیں کیا.. ہم دونوں کا قبیلہ ایک ہے' ایک ہی نسل ہے' ہم مختلف نہیں ہیں..''

''تم ہو....'' ...زیرو پوائنٹ نیم تاریکی سے اندھیرے میں اُتر تا رہا ''تم مختلف ہو'' اور اُس نے فیڈرل لاج کی ملاقات میں جو کچھ بیتا تھا وہ ہو بہو بیان کر دیا... جو سنسر شدہ ٹکڑے تھے اُنہیں جوڑ کر کل کہانی سنا دی.. نہ اُسے کوئی صدمہ پہنچا اور نہ وہ برہم ہوئی اور نہ ہی کسی عیب برہنگی سے اُسے کوئی دھچکا پہنچا بلکہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ دمکنے لگی..

''اُس کے پاس مرزا صاحب نہیں ہیں ناں خدا بخش ہے جو وہ کہتی ہے کہ بخشا ہوا ہے تو تم بھی اُسے کچھ بخش دو تو تمہارا کیا جاتا ہے..''

عجیب ناہنجار لیکن دل کو یکدم خوشی دینے والی عورت تھی کہ اس میں نسوانی حسد نام کو نہ تھا اور وہ ایک اور عورت کے لئے رقابت کا جذبہ رکھنے کی بجائے اس کی تمناؤں کی آسودگی کی سفارش کرتی تھی' وہ بھی بے اختیار ہنسنے لگا اور اُس کے گرد بازو لپیٹ کر.. جیسے ترنگ میں آکر کسی پر بہار درخت کے تنے کے گرد باہیں لپیٹ کر اُسے گرفت میں لیتے ہیں' کہنے لگا "لیکن میرے پاس تو بخشنے کے لئے بہت کچھ نہیں ہے.. ورنہ تم یہ نہ کہتی کہ میں مرزا صاحب جیسا نہیں ہوں.."

وہ اُسے پرے دھکیل کر الگ ہو گئی اور تاریکی میں بھی اُس کی شرمندگی لو دینے لگی... نیلے سویٹر کی رات کا تذکرہ اُن کے درمیان کبھی نہیں آیا تھا.. وہ دونوں زیرو پوائنٹ پر ہوتے تھے تو اُس سے بچ کر اُسے فراموش کرتے ہوئے' جیسے وہ جذبے کی دستک اُن کے رشتے کے دوران کبھی سنائی نہیں دی تھی... معمول کی باتیں کرتے رہتے تھے..

"ایسا نہ کہو... تمہارے پاس بخشنے کے لئے بہت کچھ ہے.. ایک وقتی اُبال کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی.. اگر ہوتی تو میں مرزا صاحب کو ترک کر کے تم سے ملنے کے لئے اتنے جتن کیوں کرتی... بلکہ تم کیا جانو کہ میری خوشی کا انت نہیں ہے کہ میں تو صرف تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں اور وہ تمہیں برتنا بھی چاہتی ہے.. نیلا سویٹر اب تم اُسے پہنا سکتے ہو اور میں مجرم محسوس نہیں کروں گی کہ میں اجتناب کر کے تم سے زیادتی کر رہی ہوں.. وہ تو مجھ پر احسان کر رہی ہے.. میرا بوجھ اپنے سر لے رہی ہے.. تو وہ نیلے سویٹر میں اور میں اپنے پرس میں سے چابی نکال کر قفل کھول کر تمہیں اس کوٹھڑی میں بند.. صرف دیکھتی ہوئی!"

وہ گہری نیند میں ہوتا تو اُس کا فون آ جاتا..

"ہیلو..." بھرائی ہوئی بوجھل قدرے مردانہ گہری آواز میں وہ مخاطب ہو جاتی "سائیں آپ سو تو نہیں گئے تھے؟.. ہمیں نیند نہیں آتی مرشد... کچھ ادھر بھی دھیان کرو.. ہمارے دُکھ کا بھی مداوا کرو.. ہم بیابان ہونے کو ہیں' ویران ہو رہے ہیں ہم پر برس کر ہمیں سیراب کرو.. کچھ تو کرو... ہم آپ کی مٹی ہیں اس پر پھوار پڑ جائے تو کونپلیں پھوٹیں گی سائیں.. اور ایک ایک کونپل آپ کے ناک نقشے کی گواہی دے گی.. نیند نہیں آ رہی سائیں.. مٹھی بھر سکون آور گولیاں بھی پھانکی ہیں تب بھی نیند پہلے سے بھی دور ہوتی ہے.. پرے

پرے ہو کر چلی جاتی ہے' رُوٹھ جاتی ہے.. آپ سو تو نہیں گئے تھے؟"

"نہیں..." وہ اُٹھ کر فون کا چونگا سنبھالتا سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مار کر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا لیمپ کے بٹن کو تلاش کر کے اُسے دبا دیتا..

"آپ ڈسٹرب تو ہوئے ہوں گے سائیں.. ہمیں شرمندگی ہے لیکن ہم کیا کریں.. ہم ادھر تنہا پڑے ہیں جیسے کرامویل ہوسپٹل میں تھے.. اور نیچے ہمارے لان میں... شہر میں جو بدامنی ہے اور ہر شے غارت ہوتی ہے اُس کو غارت کرنے والے بہت سے ہیں اور امن سے ہیں... خدا بخش کے بابا سائیں نے اپنے دوستوں اور حلیفوں اور مریدوں اور اُن کی گرل فرینڈز کے لئے ایک پارٹی دے رکھی ہے اور وہ سب کے سب ڈرنک ہیں.. اور کسی کو کچھ نہیں پتہ کہ وہ کس کے ساتھ آیا تھا اور اب کس کے ساتھ محو ہے.. لان بہت بڑا ہے ناں سائیں تو اُس میں جھاڑیاں بھی بہت ہیں تو اُن کی اوٹ میں اُنہیں شکلیں تو دکھائی نہیں دیتیں کہ کس کی ہیں.. ابھی تو ابتدا ہو رہی ہے.. بیڈ روم بھی تیار ہیں.. لیکن ابھی جھاڑیاں ہیں..."

"تم سونے کی کوشش کرو... صبح ہو گی تو پھر بات کریں گے"

"صبح نہیں ہو گی سائیں.." اُس کی بھرائی ہوئی آواز ہچکیوں میں بدل گئی "میں بھی اس پارٹی میں تھی اور میں نے ایک زرد رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی.. اور تمہیں پتہ ہے کہ بابا سائیں نے میرے ساتھ کیا کیا... تمہیں نہیں پتہ.."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سائیں آپ تو جیسے معصوم خود ہیں ویسے ایک معصوم دنیا میں رہتے ہیں.. آپ کو کیا خبر کہ اس... ہماری دنیا میں کیا ہوتا ہے.. یہی ہوتا ہے اور کوئی اعتراض نہیں کرتا.. بابا سائیں تعویز گنڈا بھی کرتے ہیں' مذہب کے شیدائی اور جانثار بھی ہیں اور سیاست بھی کرتے ہیں اور وہ کچھ بھی کرتے ہیں جو اُنہوں نے آج میرے ساتھ کیا.. میری زرد ساڑھی کے ساتھ کیا.. سن رہے ہو سائیں.."

"ہاں..."

"تو میں نے خدا بخش سے شکایت کی.. میں یہ تو نہیں کہتی کہ میں سوبر تھی.. بہت تھوڑا خمار تھا باقیوں کی نسبت تو میں بہت ہوش میں تھی جب میں نے شکایت کی.." ہچکیوں میں اتنی شدت تھی کہ خاور نے بمشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پایا "اور تمہیں پتہ ہے مرشد کہ

اُس نے مجھے مارا... ہاں.. ہی سلیپڈ می رائٹ اِن فرنٹ آف ایوری باڈی.. اور پھر مجھے اِس کمرے میں بند کر کے باہر سے تالہ لگا دیا.. ذرا سنو میں ہاتھ بڑھا کر فون ذرا کھڑکی سے باہر کرتی ہوں... کیا تمہیں اس پارٹی کی آوازیں آ رہی ہیں..."

کراچی کی سمندری ہوا کی سرسراہٹ.. مدھم موسیقی.. آوازوں کا دبا دبا شور.. کبھی کبھار کوئی قہقہہ..

"سائیں آپ ہمیں بچالو..." وہ بہت خوفزدہ اور سراسیمہ سنائی دیتی تھی..

"تم نے اُس کے ساتھ شادی کیوں کی تھی؟"

"نادان تھے سائیں.. وہ پاؤں پڑ کر رو رو کر اُنہیں گیلا کر دیتا تھا سائیں.. ہم ترس کھا گئے.. اور جب میرے بابا کو خبر ہوئی کہ اُدھر ہارورڈ میں سائیں بادشاہ کا بیٹا خدا بخش میری بیٹی عابدہ میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ خود اُن کے علاقہ میں پہنچ گیا... بیٹی والے تو کبھی رشتے کے لئے نہیں جاتے پر وڈیرے ایسی روایت کو اُلجھن نہیں بناتے جو اُنہیں اس سے بھی بڑا اور طاقتور وڈیرہ بنا سکتی ہو. وہ خود سائیں بادشاہ کے پاس چلا گیا اور.. مجھے فروخت کر دیا... اُس کی بیٹی بڑے سائیں کے گھر میں ہو یہ کوئی معمولی بات تھی.."

"لیکن فیصلہ تو تمہارا تھا.. آکسفورڈ اور ہارورڈ نے بھی تمہیں انکار کر دینے کی ہمت نہ دی.."

"معصوم دنیا کے باسی ہو ناں سائیں اس لئے ایسے سوال کرتے ہو... تمہیں کاراکیری کا کچھ اتہ پتہ تو ہوگا.. لیکن کچھ قصور ہمارا ہے.. ہم نے بتایا ہے کہ ہمیں اُس پر ترس آ گیا.. پھر ہمارا بابا سائیں اُن کے در پر جا حاضر ہوا تو انکار کی گنجائش نہ رہی... ہم قصوروار تو ہیں پر ہم سے نادانی ہو گئی.. ہمیں معاف کر دو... ہمیں بچالو..."

بہت مدھم آوازیں.. کبھی اُس کی سرگوشیاں سنائی دیتیں اور کبھی صرف گمان ہوتا کہ کوئی آواز ہے جو جانے کیا کہتی ہے.... وہ گھنٹوں باتیں کرتی رہتی جیسے اُس کے ٹیلی فون کے چونگے میں رہائش پذیر ہو.. خاور کا وہ کان دُکھنے کو آتا.. اُس کی لویں اتنی دیر تک دبی رہتیں کہ اُن میں ٹیسیں اُٹھنے لگتیں.. اور وہ کروٹ بدل کر رسیور کو دوسرے کان سے لگا دیتا... پھر کچھ دیر بعد وہ بھی دوہرا ہو جاتا اور دُکھنے لگتا تو وہ رسیور کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیتا اور وہاں سے بھی اُس کی بوجھل اور بھاری اور نیم خوابیدہ آواز بیڈ روم کے سناٹے میں سنائی دیتی رہتی... ایک

لامتناعی بے اختیار اور بے بس تسلسل کے ساتھ وہ باتیں کرتی چلی جاتی یہ پرواہ کئے بغیر کہ دوسرے سرے پر اُسے کوئی سن بھی رہا ہے یا نہیں..

کبھی وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو وہ اٹکتی ہوئی رُک جاتی جیسے کسی نے اُسے ایک خواب میں ٹوک دیا ہو.. اور وہ چونک کر کہتی "جی سائیں؟"

جیسے وہ ایک بیان دے رہی ہو.. اقرار کر رہی ہو.. اور اُسے کچھ غرض نہ ہو کہ سامنے کون ہے.. وہ سن بھی رہا ہے یا نہیں... وہ بولتی چلی جاتی..

وہ کبھی یہ نہ کہتی کہ میں اپنے خاوند سے الگ ہونا چاہتی ہوں... میں اُسے ناپسند کرتی ہوں اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں.. صرف یہی کوکتی اور بھرائی ہوئی ناآسودہ آواز میں کوکتی کہ... سائیں ہمیں بچالو..

جیسے اڈولف ہٹلر کے عہد میں آدھی رات کے وقت کسی یہودی کے دروازے پر دستک ہوتی تھی تو وہ جان جاتا تھا کہ اس لمحے یہ مرگ بلاوا ہی ہو سکتا ہے اور وہ خوفزدہ ہو جاتا تھا اسی طور اُس کا فون بھی ہمیشہ نصف شب کے بعد دستک دیتا اور وہ ڈر جاتا..

کبھی اُسے شک ہوتا کہ جو کچھ وہ بیان کرتی ہے وہ سکون آور گولیوں کے زیر اثر نیند اور اونگھ میں اپنے آپ سے ماورا ہو کر بیان کرتی ہے.. اور کبھی وہ اپنے آپ پر لعنت بھیجتا کہ اُس نے ایسا کیوں سوچا کہ اُس کی پکار میں دُکھ اور سچائی کے سوا کچھ نہ تھا.. کوئی فریب کوئی دھوکا نہ تھا..

لیکن ہمیشہ جب وہ رسیور اُٹھاتا تو اُس کے پہلے "ہیلو" کو سن کر وہ نارمل نہ رہتا' ڈر جاتا..

اُس "ہیلو" میں ایک گھٹتا ہوا نشہ اور مرنے والے کی آخری سانس کا ہوکا ہوتا..

اُس کے اندر عابدہ سومرو کے لچکیلے وجود میں بہر طور کہیں نہ کہیں وہ سچائی تھی جو بعید از قیاس تھی.. ایک ایسے بھید میں پوشیدہ تھی جس کی تہہ تک وہ پہنچ نہیں پا رہا تھا..

عابدہ سومرو اور غلافی آنکھیں پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں..

آنکھوں کو علم تھا کہ وہ بھی رقیب ہے پر وہ اُس کی آمد سے دکتی تھی' بجھتی نہ تھی.. اور عابدہ اپنے درد و بچھوڑے کا حال اتنے تسلسل کے ساتھ بیان کرتی تھی کہ اُس میں غلافی آنکھوں کی موجودگی کا اقرار کرنا ممکن نہ تھا..

وہ اپنی غلافی آنکھوں سمیت اُس کی حیات کے کھیت میں آنسو بہاتی تھی اور عابدہ لاپرواہ ایک ٹیلی فون لائن پر سسکتی اپنے دُکھڑے بیان کرتی تھی..

"تم اُس سے ملو... وہ ایک دکھی عورت ہے.. اُس کے لئے کچھ کرو.. جو وہ کہتی ہے وہ کرو... وہ میری ہمزاد ہے"... نہ رقابت اور نہ جلن... وہ عابدہ کو جتنا بھی جانتا تھا اُسے بہر حال یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور عورت کے حوالے پر بھڑک بھی سکتی ہے.. بھک سے اُڑ سکتی ہے اور کچھ بعید نہ تھا کہ تشدد پر بھی اُتر آئے کیونکہ اُس میں کچھ علامتیں تھیں.. لیکن غلافی آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا نہ رقابت نہ جلن!

عابدہ سومرو باقاعدگی سے اُسکے ساتھ رابطہ نہ رکھتی تھی' کئی کئی دن اُدھر سے خاموشی رہتی اور پھر یکدم وہ نصف شب کے بعد ٹیلی فون پر نمودار ہو جاتی.. ایک طویل وقفے کے بعد گئی رات اُس کا فون آ گیا..

"ہیلو..." وہی بھاری نیند میں ڈوبی نشہ آور آواز "سائیں آپ سو تو نہیں گئے تھے؟"

"نہیں..... بہت دنوں کے بعد فون کر رہی ہو... کیسی ہو؟"

"شہلا آفریدی از ڈیڈ.... سائیں شہلا مر گئی ہے.." اُس نے صرف اتنا کہا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی" وہ میری بہترین دوست تھی سائیں.. وہ مر گئی سائیں مر گئی..." اور پھر اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ بول نہ پائی.. بچوں کی طرح بلکتی رہی..

ہمدردی اور اُس کے لئے دُکھ کے آثار خاور کے ماتھے کی سلوٹوں میں نمایاں ہونے لگے.. اُس پر اتنا اثر ہوا کہ جواب میں فوری طور پر کچھ بھی نہ کہہ سکا.. اور کہنے کو بھی کچھ نہ تھا وہ شہلا آفریدی سے واقف ہی نہ تھا اور نہ یہ اس کے علم میں تھا کہ وہ اُس کی بہترین دوست تھی.. وہ سوائے خدا بخش اور بابا سائیں کے اپنے کسی قرابت دار کسی دوست کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہتی' اپنی بیٹی کے بارے میں بھی صرف اُس کے استفسار پر کچھ بتا دیتی... اُس نے عابدہ کو پرسکون کرنے کے لئے اپنے تئیں بہترین لفظوں کا چناؤ کیا... اُس کے غم میں کسی حد تک شریک ہونے کا اقرار کیا لیکن وہ نہیں سن رہی تھی' صرف ہچکیاں لے رہی تھی اور درمیان میں یکدم اونچی آواز میں رونے لگتی..

خاور بستر سے اُٹھا اور ٹیلی فون تھامے ہوئے سامنے صوفے پر جا بیٹھا..

"یہ کیسے ہوا عابدہ؟"

"میں ذمے دار ہوں خاور.. میں کلپرٹ ہوں اُسے میں نے ہلاک کیا ہے.." وہ شاید اپنے بال نوچ رہی تھی کہ اُس کے رونے میں یکدم اذیت کی کوئی سسکی بھی در آتی.. وہ بین کرتی رہی "میں نے اُسے مار دیا ہے اپنی بہترین دوست کو.. میں سکم آف ارتھ ہوں.. میں بہت بری ہوں.. میں نہ اُسے ڈیز رو کرتی تھی اور نہ تمہیں.. میں ڈائن ہوں اُسے کھا گئی ہوں.."

"پلیز گیٹ ہولڈ آف یور سیلف عابدہ.. پلیز.. مجھے بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے.. پلیز.."

وہ کچھ سنبھل گئی اور ہولے ہولے بولنے لگی "میں نے اُسے فون پر کہا کہ میں بہت تنہا ہوں آج کی شام تم میرے ساتھ گزارو.. اور اُسے بہت تیز بخار تھا' اُٹھ نہیں سکتی تھی بستر سے.. اور میں نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے یا اُس کی کوئی اور اپائنٹمنٹ ہے اور بہانے بنا رہی ہے تو میں نے بہت اصرار کیا.. اُسے عجیب عجیب قسمیں دے کر مجبور کیا تو وہ بخار میں پھنکتی ہوئی آ گئی.. وہ بہت کمزور تھی اور اُس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور میں اپنی حماقت پر بہت پچھتائی اور میں نے معافیاں مانگتے ہوئے اُسے گھر واپس چلے جانے کو کہا لیکن وہ نہیں مانی.. ہنستی رہی.. کہتی رہی کہ اب تمہیں میری دوستی کا یقین آ گیا.. گھر جا کر بھی بستر پر لیٹی رہوں گی.. تم مجھ سے باتیں کرو میرا دل لگا رہے گا.. سائیں میں نے بھی آج تک کسی سے تمہارا ذکر نہیں کیا تھا' شہلا سے بھی نہیں اور میرے دل پر بہت بوجھ تھا' میں نے اُسے تمہارے بارے میں بتایا' تفصیل سے بتایا.. سب کچھ بتایا تو وہ بہت ناراض ہوئی' مجھے لعن طعن کرنے لگی کہ عابدہ ہوش کرو وہ تم سے عمر میں کہیں بڑا ہے' عمر رسیدہ شخص ہے یہ تم کیا کر رہی ہو.. اگر خدا بخش کو علم ہو گیا تو وہ تمہارے ساتھ اُسے بھی ختم کر دے گا.. اُس نے مجھے بہت ڈانٹا سائیں کہ یہ سلسلہ فوری طور پر بند کر دو.. اور میں ہنستی رہی کہ یہ تو مرشد اور مرید کا رشتہ ہے ایک مرد اور ایک عورت کا نہیں لیکن اُس کی ناراضگی کم نہ ہوئی... وہ بہت تھوڑی دیر میرے ساتھ رہی اور پھر اُس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اُسے چکر آنے لگے.. میں نے بہتیرا کہا کہ میں تمہیں گھر چھوڑ آتی ہوں.. کسی ڈرائیور کو بھیج دیتی ہوں لیکن وہ کہنے لگی میں نے اپنی ماں کو یہ نہیں بتایا کہ میں تمہارے ہاں آ رہی ہوں اور تم جانتی ہو کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتیں اس لئے میں چلی جاؤں گی... میں اُسے رخصت کر کے واپس اپنے بیڈ روم میں آئی ہوں... ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھی ہیں اور پھر لیٹ گئی ہوں تو فون آ گیا.." وہ پھر بے قابو ہو گئی.. دیر تک

غزہ بلیوں کی طرح روتی رہی.. وہ اُسے دلاسے دیتا رہا مگر وہ اُن سے بے نیاز اپنے آپ میں گم روتی رہی... اور پھر تھک گئی اور چپ ہو گئی..

"پھر کیا ہوا عابدہ؟" وہ چاہتا تھا کہ اُس کے بدن میں اُبلتا اُبال دیگچی کے کناروں سے باہر آ کر ٹھنڈا ہو جائے اور وہ بہتر محسوس کرنے لگے..

"تم سننا چاہتے ہو؟"

"ہاں..." اُس نے چونگا دوسرے کان سے لگایا "ہاں میں سننا چاہتا ہوں"

"فون جناح ہاسپٹل سے آیا تھا۔ کہ میرے گھر سے نکلتے ہی اُس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ایک واٹر ٹینکر کے ساتھ اور وہ بری طرح کچلی گئی تھی.. اور بار بار میرا نام لے رہی تھی.. اور خاور جب میں وہاں پہنچی ہوں تو وہ اکڑی ہوئی تھی اور اُس کا کچلا ہوا چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا.. صرف اُس کے ڈائمنڈ کے بُندے تھے جو خون آلود کانوں میں چمکتے تھے.. تم سن رہے ہو خاور... وہ اکڑی ہوئی تھی ایک لاش کی طرح.. بلکہ وہ ایک لاش بن چکی تھی میرے پہنچنے سے پہلے مر چکی تھی... میں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا کر بہت پیار کیا تو وہ بہت سرد بہت ٹھنڈی تھی جیسے ڈیپ فریزر میں رکھی سبزیاں ہوتی ہیں.. شی واز ڈیڈ... یہ میرا قصور ہے خاور کہ وہ اب ڈیپ فریزر میں رکھی ہوئی سبزی کی طرح سرد ہو گئی ہے..."

"تم اب آرام کرو عابدہ.. کوشش کرو سونے کی.. سلیپنگ پلز لے لو..."

"میرے ماتھے پر ابھی تک اُس کا خون ہے سائیں جب میں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹایا تھا اور جہاں اُس کے گال تھے اُس خون کی دلدل کو چوما تھا.. میں نے اُسے مار ڈالا ہے سائیں.." اُس کی آواز بیٹھتی جاتی تھی اور اُسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی..

"ہمیں کسی بھی تعین پہ اختیار نہیں عابدہ..." ایک عرصے کے بعد اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے آشنا ہوئیں "ہم بے بس ہیں اُس کی رضا کے آگے.. اُس کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے.. نہ جھکائیں تو اور کیا کریں.. تم آرام کرنے کی کوشش کرو.. پلیز.. میرے لئے.. تمہیں پتہ ہے ناں کہ مجھے بھی تمہاری بہت ضرورت ہے.. پلیز.."

"میں کل اُس کے جنازے پر نہیں جا سکتی سائیں..." اُس کی ہچکیاں تھمنے میں نہ آتی تھیں..

"نہ جاؤ.. بالکل نہ جاؤ.. تم اپنے آپ کو بیمار کر لو گی.. آرام کرو..."

خاور نے فون رکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں..

کشتی تھمی ہوئی لگتی تھی.. سناٹے کے سحر کی گرفت میں تھی لیکن آس پاس کے سروٹ پیچھے رہتے جاتے تھے..

"تم اپنے لئے کونسا سینٹ یا یوڈی کلون استعمال کرتے ہو؟" اُس نے ایک مرتبہ پوچھا تھا..

"میں نے آج تک سوائے آفٹر شیو لوشن کے.. کبھی کچھ بھی استعمال نہیں کیا.... میں ان چیزوں کا شوقین نہیں ہوں"

"ہوں... تمہیں ضرورت بھی نہیں.. تمہارے جسم میں جو مہک ہے وہ کسی بھی فرنچ پرفیومری میں مینوفیکچر نہیں ہو سکتی..."

اگلے روز ایک بڑا پارسل اُس کے دروازے کی چوکھٹ پر پڑا تھا اور اُس میں ڈھیروں نہایت قیمتی یوڈی کولون اور آفٹر شیو تھے.. کول واٹرز.. جاز اور پتہ نہیں کیا کیا.. سینٹ مائیکل کی بنیانیں اور انڈر ویئر تھے..

سروٹوں کے ذخیرے میں سے ابھی تک کسی پرندے کی کوک سنائی نہیں دی تھی مگر اُس لمحے کشتی کے اُوپر سے چار مرغابیاں اپنے پروں کی شوکر سناتی گزر گئیں.. حالانکہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا..

"ہیلو..."

"جی..."

"سائیں ہم حاضر ہو گئے ہیں... اذن باریابی کب ہو گا؟"

وہ پھر اسلام آباد میں تھی..

وہ شہر بے مراد اپنی مردنی اور بے نوری میں گم تھا.. فیڈرل لاج کی فیملی سویٹ نمبر 19 کی کھڑکی پر وہ مردنی دستک دیتی تھی اور اُس کے اندر گھٹے گھرے اور دھنستے ہوئے

صوفوں پر وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے..

وہ پہلے سے کہیں زیادہ دبلی اور بیمار سی لگ رہی تھی.. شہلا آفریدی کی موت نے اُسے نڈھال کر دیا تھا.. اُس کی شلوار تلے جو گھٹنے تھے ان کی چوکور بناوٹ اُبھری ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے..

اُس کی بیٹی قالین پر آلتی پالتی مارے' اپنی ٹھوڑی کو بند مٹھی سے سہارتی ٹیلیویژن پر تیزی سے حرکت کرتے کارٹون پروگرام میں بظاہر کھوئی ہوئی تھی..

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے.. عابدہ بھی خاموش بیٹھی ایک نظر اُس پر ڈالتی تھی اور پھر چھت کو گھورنے لگتی تھی..

یکدم... ایک کھٹاک کے ساتھ کھڑکیوں پر مردنی کی بجائے تیز ہوا دستکیں دینے لگی... پھر مرگلہ کی رات میں روپوش پہاڑیوں کے اندھیرے میں سے گھنے سیاہ بادل اُترے اور اُن کے ساتھ ہی زمین اور چھتوں میں چھید کر دینے والی تیکھی تیز بارش اُتری اور کھڑکیوں کے شیشے اس کی کیلی بوندوں کی بوچھاڑ کی زد میں آ کر ٹوٹنے کو آئے.. اُس کی مٹھیاں بھنچنے لگیں اور اکہرا بدن بے اختیار کانپنے لگا اور وہ خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی جیسے اُس کی مدد کی خواستگار ہو... اُس کے ہونٹ نیلے پڑتے جاتے تھے..

بالآخر وہ بے حد سہمی ہوئی اپنے آپ میں سمٹی جیسے برفباری میں ایک سُوتی شلوار قمیض میں.... گھر سے باہر نکل آئی ہو وہ اُٹھ کر اُس کے پاس آ گئی "مجھے ڈر لگ رہا ہے خاور..."

"موی... کین آئی گو ٹو بیڈ ناؤ..." بیٹی نے ریموٹ کا بٹن دبا کر سکرین پر حرکت کرتے غل مچاتے کارٹون خاموش کر دیئے..

"مومی ول ٹیک یو ٹو بیڈ سویٹی..." وہ پلٹ کر اُس کی جانب ایک ماں کی والہانہ شفقت سے لپکی' اُسے اُٹھایا' چوما اور اپنی چھاتی سے لپٹا کر ڈرائنگ رُوم سے ملحقہ بیڈ روم میں چلی گئی.. جب وہ واپس آئی تو پھر اسی سلک گاؤن میں تھی جو اُس کے ناتواں گھٹنوں سے اوپر ہی اوپر دم توڑ دیتا تھا... اور اُس کے نیچے عیب برہنگی کے سوا کچھ نہ تھا.. وہ اُس کی نہیں سرمد کی مرید تھی..

باہر فیڈرل لاج کے درختوں کی ٹہنیاں پانیوں کی بوچھاڑ سے ٹوٹتی تھیں اور بارش کا اندھا دُھند شور کھڑکیوں کے بند شیشوں پر دستکیں دیتا' اجازت بنا سیدھا اندر آتا تھا اور

کانوں کو بہرا کرتا تھا..

صرف ایک دراز قد لیمپ کونے میں ایک پہرے دار کی طرح کھڑا تھا جس کی روشنی بلند دیواروں سے لگ کر چھت تک پہنچنے کی کوشش کرتی تھی..

وہ ایک رنجیدہ اور سوگ کی حالت میں پھر اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی.. اُس نے اپنی ایک ٹانگ کو دوہرا کر کے دوسری پر رکھا تو گاؤن گھٹنوں سے کھسک کر اُس کے کولہوں تک سرک گیا..

"سائیں آپ ازل سے میرے رازداں ہیں.. جب تمہیں پڑھتے تھے تو تمہارے حرف ہم سے باتیں کرتے تھے اور ہم اُنہیں اپنا رازِ دل بیان کرتے تھے.. تمہیں دیکھتے تھے تو تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم سے اپنے دُکھ درد کہتے تھے.. بالکل اسی طرح.. جس طرح تم سے فون پر باتیں ہوتی ہیں.. ہمارے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی رات بھی ہو گی جب آپ سچ مچ ہمارے سامنے بیٹھے ہوں گے.... تم تو نہیں دیکھتے تھے صرف ہم دیکھتے تھے.. تم بھی تو دیکھو سائیں.." اس نے اپنے کندھوں سے گاؤن ڈھلکایا اور پھر اُس کی جانب پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی.. گاؤن اُس کے پاؤں کے گرد ڈھیر ہو گیا "دیکھو..."

اُس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے نمایاں تھے اور گنے جا سکتے تھے اور اُن کے گرد اُس کی پشت پر عجیب مشکوک سے دھبے تھے جیسے کسی جلدی بیماری کے آثار ہوں.

"دیکھو سائیں.." اُس نے پیچھے نہیں دیکھا.. اُس کی جانب پشت کئے کھڑی رہی اور پھر قدموں میں ڈھیر شدہ گاؤن میں سے پاؤں نکال کر پلٹی اور اُس کے روبرو ہو گئی..

اُس کے سارے بدن پر.. ٹانگوں پر... چھاتیوں پر... ہر جگہ وہی دھبے نظر آ رہے تھے.. جیسے زخم مندمل ہو رہا ہو تو اُس پر کھرنڈ نمودار ہونے لگتا ہے.. ایسے دھبے..

وہ ایک اناڑی طبیب کی طرح سر سے پاؤں تک اُس کا معائنہ کرتا رہا..

"تم جو دیکھ رہے ہو تمہیں اس پر یقین کرنا پڑے گا.. کہ نہیں" وہ ہنسنے لگی.. اُس کے برہنہ ہونے میں خاور کو کوئی عیب نہ لگا کیونکہ اُس کا بدن ایک بچی کی طرح دُبلا اور کچا تھا... اُس میں کوئی ہیجان نہ تھا.. "کرامویل ہاسپٹل کا ڈاکٹر اینڈریو کینیڈی.. آئرش نیلی آنکھوں والا... ایم ڈی... خاص طور پر لنڈن سے فلائی کر کے صرف میرے لئے دو گھنٹوں کے لئے کراچی آیا تھا... اینڈ..." وہ اپنے اکہرے بدن کو ذرا چھپاتے ہوئے شرمندہ ہو گئی"

اینڈ ڈویونو ویت ہی ازان لو ودی.. ہاں.. ڈیئر اینڈریو بہت ہی فیمس اور معروف ڈاکٹر ہے اور کسی پریذیڈنٹ یا پرائم منسٹر کے لئے بھی ملک سے باہر نہیں جاتا.. اور وہ میرے لئے آ گیا.. اگرچہ اُس کی فیس کا کچھ حساب نہیں.. بس ہم جتنے بھی سانس لیتے ہیں اتنے سو پاؤنڈ اُس کی کنسلٹیشن کے ہوتے ہیں... پھر بھی وہ صرف میرے لئے آ گیا.. امریکہ میں جو تازہ ترین تحقیق ہوئی ہے اینڈریو سمجھتا ہے کہ اُس میں کوئی اُمید ہے اور اُس نے اُس کے مطابق مجھے کچھ میڈیسن دی ہیں...'' وہ جھکی اور اپنے ہینڈ بیگ کو اٹھا کر اُس کے اندر ٹٹولتی ہوئی.. اس میں سے چند گولیاں اور کیپسول نکال کر انہیں اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پھر انہیں پانی کے بغیر پھانک کر نگل لیا... اور پھر سیدھی ہو گئی ''یہ سب کچھ ایک تاخیری حربہ ہیں.. یہ مجھے بچا نہیں سکتیں.. اور میں جانتی ہوں کہ میں مر رہی ہوں..''

ویت نام جنگ کی سب سے مشہور اور اثر انگیز... اس جنگ کی تباہ کاریوں پر لکھی جانے والی تمام کتابوں پر بھاری... تمامتر تجزیوں کی نفی کرتی ہوئی.. ایک تصویر تھی..

ایک ویت نامی بچی... امریکی نیپام بموں کے بھڑکتے شعلوں اور آتش برساتے پس منظر میں سے.. دھماکوں اور اپنے جھونپڑے کی بربادی کے شاک میں منہ کھولے روتی ہوئی' بالکل ننگی بھاگتی ہوئی آ رہی ہے..

عابدہ سومرو بھی... اُس ویت نامی بچی کی طرح کانپتی... اپنی موت کے خوف سے روتی.. اُس کے سامنے ننگی کھڑی تھی..

اُس کا اکہرا ناپختہ... بے ہیجان بدن بھی ایک بچی کا تھا.. خوفزدہ اور ہراساں.. صرف اُس کے پس منظر میں نیپام کی آگ نہ تھی' ایک کھڑکی تھی جس کے شیشوں پر مینہ کی منہ زور بوندیں برستی تھیں اور دستکیں دیتی تھیں..

کشتی اگرچہ ٹھہری ہوئی ایک انجانے سکوت کی گرفت میں لگتی تھی لیکن سطح آب پر خاموشی سے کھسکتی رواں تھی..

وہ آخر کار تنگ آبی گزرگاہ سے باہر آئی.. اُس نہر کے اختتام تک آ گئی جس کے دونوں کناروں پر سروٹوں کے جو ذخیرے تھے اُن میں قیام کرتے پرندوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک وہ وہاں سے گزرتی ہے وہ چونچیں نہیں کھولیں گے... اور جھینگر بھی جان بوجھ

کر ٹر آنے سے باز رہے تھے..

اور پھر وہ تنگ آبی گزرگاہ میں سے نکل کر سندھ کے لشکیلے.. کراں تا بہ کراں.. پھیلے ہوئے.. گنگ کر دینے والی وسعت کے حامل چوڑے دھارے میں داخل ہو گئی..

یہ دریا نہ تھا.. ایک بے انت پانیوں کا پھیلاؤ اُفق تک جاتا تھا.. کرۂ ارض پر زمین کا کوئی وجود نہ تھا' صرف پانی تھے... ایک سمندر تھا..

اس کا کنارا... تمنا کے دوسرے قدم کی طرح کہاں تھا..

کشتی جو کناروں کے درمیان رواں ہونے کی عادی تھی اُس میں داخل ہوئی تو جھجک گئی اور اُس کے درمیان میں جا کر اپنی قسمت آزمانے کی بجائے کنارے کے ساتھ لگ لگ کر چلنے لگی..

فہیم کسل مندی سے بیدار ہوا.. ایک انگڑائی لے کر اُٹھا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنی ٹیوب کو سینے سے لگا کر دریا میں کود گیا..

ایک غڑاپ کی سی آواز آئی اور وہ پانیوں میں گم ہو گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کشتی سے کچھ فاصلے پر دریا میں سے اُبھرا اور تیرتا ہوا دور ہونے لگا..

خاور جو کشتی کی نوک پر بُت بنا کھڑا تھا.. اور یکدم نہر میں سے باہر آ کر سامنے کے وسیع آبی پھیلاؤ کی حیرانی میں تھا... اس غڑاپ کی آواز پر پلٹا اور جعفر کی جانب سوالیہ نگاہیں کیں..

''سائیں حوصلہ رکھو...'' جعفر کو کشتی کو کنارے کے ساتھ ساتھ رکھنے میں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا ''فہیم اپنے گاؤں کو جاتا ہے.. آپ کے لئے دیسی مرغی اور انڈے لانے کے لئے... پڑاؤ کرنے تک لوٹ آئے گا''

سندھ کا پاٹ اتنا وسیع تھا کہ دور دور تک کسی کنارے کسی آبادی کا نشان نہ تھا.. اور فہیم.. نکا مکان کے صحرا ایسی آبی وسعت میں ایک ٹیوب کے سہارے تیرتا دور ہوتا چلا جاتا تھا..

اُسے شہر میں دیر ہو گئی تھی..

اگرچہ تقریب کے بعد ایک نہایت پر تکلف ڈنر کا اہتمام تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ

اُس کی بے حد مرغوب غذائیں ٹیبل پر سج رہی ہیں.. لیکن وہ سب کی سب بھاری' چربی والی اور تلی ہوئی تھیں.. اُس کی بھوک کو اُن کی ہال کے اندر آتی اشتہا انگیز مہک بہت بے چین کرتی تھی لیکن اُس نے اپنے آپ پر جبر کیا.. اُسے سختی سے ان چیزوں کی مناہی تھی.. اُس کے خون میں چربیلے مادے گھٹے ہو رہے تھے اور وہ کہیں نہ کہیں کسی وقت بھی رکاوٹ ڈال سکتے تھے.. زندگی کو ہلاک کر سکتے تھے اس لئے اُسے منع کر دیا گیا تھا..

میزبانوں نے بہت اصرار کیا صرف چند لقمے لے لینے پر اصرار کیا لیکن وہ جانتا تھا اپنے آپ کو جانتا تھا کہ اگر ایک بار اُس نے ہاتھ میں پلیٹ پکڑ لی تو پھر وہ ہر قسم کی احتیاط تیاگ دے گا اور چند لقموں تک محدود نہیں رہے گا اس لئے اُس نے معذرت کر لی... گھر میں کچھ عزیز متوقع ہیں' دراصل میری بیٹی کے سسرال.. اور کھانا مجھے اُن کے ہمراہ کھانا ہے بلکہ فوری طور پر واپس جا کر بندوبست کرنا ہے..

موتنگیا رنگ کے پھاٹک کے قریب پہنچ کر وہ جونہی بریک لگاتا تھا تو بشیر اگرچہ نظر نہیں آتا تھا لیکن پھاٹک فوری طور پر کھلتا جاتا تھا... اُسے ہارن دینے کی ضرورت کم ہی پیش آتی تھی لیکن آج وہ منتظر رہا.. پھر متعدد بار ہارن دیئے.. بالآخر اُسے کار سے اُترنا پڑا.. اُسے یقین تھا کہ بشیر اپنی نئی بیوی میں محو ہو گیا ہے اور کسی ایسے مقام پر ہے جہاں انسان کچھ نہیں سن سکتا.. اُس نے متعدد بار گھنٹی پر دباؤ ڈالا اور پھر بھی بہت دیر بعد بشیر برآمد ہوا.. اُس نے خاموشی سے پھاٹک کھولا اور پھر اُس کے ساتھ معمول کی گفتگو کرنے یا اُس دن کی رپورٹ پیش کرنے کی بجائے کہ صاحب فلاں فلاں نے فون کیا تھا.. فلاں ملنے آئے تھے اور رات کے کھانے کے لئے میں نے یہ کچھ تیار کیا ہے اور آپ کھانا کتنے بجے کھائیں گے.. وہ کچھ کہے بغیر اپنے کوارٹر کی جانب جانے لگا..

"بشیر.."

"جی صاحب.."

وہ ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا تو بشیر اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا..

"تم کہاں تھے؟"

"کہیں بھی نہیں صاحب.. بس..."

"اپنے کوارٹر میں تھے.. بیگم کے پاس؟" اُسے غصہ آ رہا تھا کیونکہ بشیر کبھی بھی اتنا

رُوکھا اور لاپرواہ نہیں ہوا تھا..

"نہیں جی.. ادھر ڈرائنگ رُوم میں تھا اور... فون سن رہا تھا.."

خاور نے اُس لمحے اپنے غصے میں سے باہر آ کر بشیر پر نگاہ کی.. اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ رو رہا تھا اور اپنی ہچکیوں کو دبانے کی کوشش میں تھا..

"کیا ہوا ہے؟.." وہ فوراً اُسکے قریب ہوا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے پوچھا.. بشیر جیسا بھی تھا ایک ہمدرد اور غمخوار انسان تھا.. اور ایک مدت سے اُس کی ملازمت میں تھا..

"کچھ نہیں صاحب..." اُس نے ایک اور ہچکی لی اور رومال سے تادیر اپنی ناک صاف کی..

"کس کا فون تھا؟" یہ پوچھتے ہوئے غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہ نے اُس تپائی کی جانب سفر کیا جس پر فون رکھا ہوا تھا.. چونگا کریڈل پر نہ تھا.. اپنے دونوں منہ چھت کی جانب کئے چت پڑا تھا..

"ہیلو.." اُس نے چونگا اُٹھا کر آہستہ سے کہا..

"یہ تم ہو سائیں... میں بشیر سے باتیں کر رہی تھی.. تم گھر پر نہیں تھے تو میں اُس سے باتیں کرتی رہی..

تم آرام کرو سائیں ابھی ابھی لوٹے ہو.. میں دوبارہ کروں گی.."

بشیر ابھی تک سر جھکائے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا.. خاور نے پہلے تو سوچا کہ وہ اُس سے دریافت کرے کہ وہ کیا باتیں کر رہی تھی پھر اُس نے اپنے ایک ملازم کو اپنی اس خلوت میں داخل کرنا مناسب نہ سمجھا "کھانا ابھی لگا دو.. جو کچھ بھی ہے.."

بشیر فوری طور پر کچن میں جانے کی بجائے کھڑا رہا.. اور پھر نہایت غمناک لہجے میں بولا.. کم پڑھے لکھے لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھ کر دوسروں کو بیوقوف بنانے کا گر نہیں جانتے اور جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اُن کے چہروں پر عیاں ہوتا ہے.. اور اُس کے چہرے پر کسی حد تک ایک ناپسندیدگی تھی "صاحب آپ ان بی بی جی کا کچھ کر لیں... بہت برے نصیب والی ہیں.. بہت دُکھی ہیں.."

خاور کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگیں.. اُس نے پتہ نہیں کیا کیا اس بشیر سے

کہا تھا. کیا تھپیڑ لگایا تھا.. اسی لئے وہ آبدیدہ تھا.. اُس نے عابدہ سومرو کو اس لمحے سخت ناپسند کیا جس نے اُسے ایک ملازم کے سامنے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا..

"اگر اُس نے میرے لئے فون کیا تھا تو تم نے صرف یہ کہنے کے سوا کہ میں فی الحال گھر پر نہیں ہوں اور اپنا نام بتا دیں.. اس کے سوا تم نے گفتگو کو آگے کیوں بڑھایا.."

"وہ ہمیشہ مجھ سے باتیں کرتی ہیں جی.."

"ہمیشہ.."

"انہیں پتہ ہوتا ہے جب آپ گھر پر نہیں ہوتے تو وہ مجھ سے باتیں کرنے کے لئے فون کرتی ہیں.. صاحب وہ بہت نیک دل بی بی ہیں اور آپ اُن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے.. بہت دکھی عورت ہیں صاحب جی.. اُن کا خاوند اُن کو لنڈن کے ہسپتال میں دیکھنے تک نہیں آیا.. اُن کی سہیلی فوت ہو گئیں صاحب جی.." بشیر کے آنسو پھر اُبل پڑے.. "اور وہ مر رہی ہیں جی.. آپ اُن کا کچھ کر لیں.. شریفاں خاتون بھی ان کے لئے روتی رہتی ہے اُن کی زندگی کی دعائیں کرتی رہتی ہے.. وہ تو میرے ساتھ بھی میل ملاپ کے قصے بھول گئی ہے اُن کے دُکھڑے سن سن کر...."

"وہ.. تمہاری بیوی کے ساتھ بھی باتیں کرتی رہتی ہے؟"

"جی صاحب جی.. ایک عورت کا دُکھ تو ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے ناں.. وہ کہتی تھی تم میری طرف سے صاحب جی کی منت کرو کہ وہ بی بی کو بچا لیں.. میں کھانا لگاتا ہوں جی.."

اُس نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا.. دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا.. یہ عجیب سی صورتِ حال تھی.. عابدہ سومرو کیا کر رہی تھی.. کیوں ایسا کر رہی تھی.. اُس کی ذاتی زندگی میں کواڑ کھول کر بشیر کو... حتیٰ کہ اُس کی بیوی کو.. جس کی شکل بھی اُس نے مشکل سے دیکھی ہو گی.. کیوں داخل کر رہی تھی.. پاگل خانہ بالکل پوشیدہ تھی اُسے اُس کا نام بھی معلوم نہ تھا اور عابدہ بالکل برہنہ تھی اُسے ہر کوئی دیکھ سکتا تھا.. اُس کے ملازم بھی..

حسب معمول گئی رات ٹیلی فون کی گھنٹی بلند ہوئی اور وہ منتظر تھا..

"ہیلو.." بھاری کراہتی ہوئی آواز... جس کا وہ منتظر تھا..

وہ برس پڑا...

"سنو تو سہی سائیں.. ہماری بھی تو سنو.." اُس کی آواز میں اُس کے برسنے سے.. اس کی شدید ناراضگی اور غصے سے کوئی ہلچل نہ ہوئی.. کوئی تموّج نہ آیا.. وہ دھیرج میں ہی رہی.. ہمیشہ کی طرح ایک بپے تلے ٹھہراؤ میں ہی بولتی رہی "سائیں ہم کیا کریں.. آپ گھر میں نہ ہوں تو ہم کیا کریں.. یونہی اپنے کمرے کی قید میں مرتے رہیں.. کچھ بھڑاس نکال لیتے ہیں صرف اس لئے کہ غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست... ہم تو بوئے دوست سے باتیں کرتے ہیں اُن کے ساتھ تو نہیں کرتے اور آپ خواہ مخواہ جلال میں آ گئے.. اور سنو سائیں... مرشد کے در پر بیٹھے کتے بھی ہمیں پیارے لگتے ہیں... صرف اس لئے کہ وہ در پر بیٹھے ہیں.. نصیب والے ہیں اور ہم اُس در سے دور ہیں.. دھتکارے ہوئے ہیں.. تو کتوں سے باتیں کرنے پر آپ خفا ہوتے ہیں تو آئندہ نہیں کریں گے.."

اس کا کھولتا ہوا غصہ جو بدن کی دیگچی کے کناروں سے اُبل کر باہر آ رہا تھا.. ٹھنڈا ہونے لگا.. اس میں حرج کی کوئی ایسی بات نہ تھی.. اُس پر جو گزر رہی تھی.. تنہائی اور موت کے شکنجے میں وہ جو جکڑی ہوئی تھی اگر اُس نے بشیر اور اُس کی بیوی کو اس میں شریک کر لیا تھا تو قصور نہیں کیا تھا.. ڈوبتا ہوا شخص ہر تنکے کو سہارا سمجھتا ہے.. بچانے والی کشتی اگر دور ہو تو اُسے ہاتھ پاؤں مارنے سے آپ روک تو نہیں سکتے..

"تم کیسی ہو؟" اُس نے اس سوال میں اپنی معذرت اور کسی حد تک یکدم غصے سے پھٹ پڑنے کی شرمندگی کو سمو دیا..

"مرشد نے پوچھ لیا کہ تم کیسی ہو تو... ہم جی اُٹھے.. بے شک مر رہے تھے لیکن آپ کے پوچھنے سے جان واپس آ گئی.. کہاں گئے تھے؟"

"ایک بے مقصد سی تقریب تھی.. جس میں جانے سے حاصل حصول کچھ نہیں ہوتا... صرف منتظمین کے بار بار فون کرنے سے.. درخواستیں کرنے سے انسان مجبور ہو کر چلا جاتا ہے تاکہ اُسے متکبر اور بد دماغ نہ سمجھا جائے.. وہیں دیر ہو گئی.."

"سائیں ایک تو آپ پرانے فیشن کے ہیں.... ڈرائنگ روم میں تپائی پر پڑا ٹیلی فون تو اب ایک پتھر ہے.. اس میں جان نہیں ہے.. آپ موبائل کیوں نہیں رکھتے تاکہ آپ جہاں بھی ہوں ہم آپ کے سانس سن سکیں.."

"میں موبائل افورڈ نہیں کر سکتا" وہ ہنسنے لگا.. اُس کی ناراضگی اور غصہ اُس کی باتوں

کی حدت سے پگھل کر بہہ چکا تھا.. "اور یوں بھی گھر سے نکل کر میں چاہتا ہوں کہ میں ذرا لاتعلق ہو جاؤں... موبائل کی گھنٹی مجھے دنیا کی بھدی ترین آواز لگتی ہے... میرے رگ و ریشہ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے.."

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ بہت بھولے ہو سائیں.. کسی اور دنیا میں دھونی رمائے بیٹھے ہو اور اُس کے باہر ایک اور دنیا ہے جہاں سے میں تمہیں فون کرتی ہوں.. بھدی آوازوں والے موبائل تو شوقیے اور نودولتیے لوگ رکھتے ہیں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے.. ایسے موبائل بھی ہیں کہ سینے کے ساتھ لگائے رکھو تو ہولے ہولے دستک دیتے ہیں اور آس پاس کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی.. میں صرف اجازت مانگتی ہوں.. کل سویرے تمہاری چوکھٹ پر ایک ایسا ہی موبائل دھرا ہوگا..."

"نہیں.. مجھے واقعی اس کی ضرورت نہیں ہے.. پہلے ہی تم نے جو پرفیوم اور یوڈی کلون بھیجے ہیں وہ زندگی بھر کے لئے کافی ہیں.. تم کیسی ہو؟" اُس نے پھر پوچھا..

اُس نے جواب میں کچھ نہ کہا..

"ہیلو..." وہ لائن پر تو تھی لیکن بولتی نہ تھی "عابدہ..."

"جی سائیں.."

"تم اب کیسی ہو؟.. پہلے سے بہتر ہو؟.. شہلا کے جنازے پر تو نہیں گئی تھی؟"

"نہیں سائیں آپ نے منع کر دیا تھا تو میں نہیں گئی.." اُس نے ذرا سوچ کر رُکتے رُکتے کہا "سائیں آپ اب تو غصے میں نہیں؟.. میں ڈر گئی تھی سائیں.. آپ غصے میں نہ آیا کرو میری جان نکل جاتی ہے... سنو سائیں.. میں جو آج بار بار فون کر رہی تھی اور آپ گھر پر نہیں تھے تو میں مجبور ابشیر کے ساتھ باتیں کرتی رہی تو ایک وجہ تھی.. سائیں میں نے ایک درخواست پیش کرنی تھی.."

وہ پھر چپ ہو گئی..

"تم حکم کرو سائیں.." اُس کا وجود جو ہمیشہ برقرار رہتا ہے.. جو کبھی زوال سے آشنا نہیں ہوتا.. جس کے لب پنکھڑیوں کی طرح ہمیشہ کھلے رہتے ہیں کبھی پژمردہ نہیں ہوتے اور جس کے دانت سلامت رہتے ہیں' بدن کسا ہوا رہتا ہے اور جو کچھ آئینے میں دیکھتا ہے اس پر یقین نہیں کرتا صرف اپنے اندر سے اُٹھنے والی آتش صفت ہوک پر یقین رکھتا ہے جو کبھی

راکھ نہیں ہوتی... اُس وجود کی بولی میں وہ کھنکتا ہوا بولا "یہ تو... تو من شدی اور من تو شدی والے معاملات ہیں جن میں یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ مرشد کون ہے اور مرید کون ہے.. ہم تو اُس چھڑے برساتی تیز بارش کے بھی مرید ہیں جو آپ کی کھڑکیوں کے شیشے توڑتی تھی.. اور عیب بر ہنگی کے بھی چاکر ہیں.. تو آپ حکم کریں سائیں.."

جواب میں جو کچھ اُس نے کہا اُسے سن کر اُس کا برقرار وجود برقرار نہ رہا.. زوال آشنا ہوا.. لب پژمردہ ہو گئے.. دانت ہلنے لگے' بدن ڈھیلا پڑ گیا اور وہ لمحہ وجود میں آ گرا..

"سائیں تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ.. میرے مرنے کے بعد تم میری بیٹی کا خیال رکھو گے.. پلیز..."

"یار تم حوصلہ رکھو... تم اپنی اولاد کا خود خیال رکھو گی... مجھے یقین ہے"

"نہیں خاور... تم نے تو وہ دھبے دیکھے ہیں ناں میرے بدن پر.. خدا بخش نے کبھی نہیں دیکھے کیونکہ وہ ایک عرصے سے میرے نزدیک نہیں آیا.. ڈاکٹر اینڈریو نے بھی مجھے... میرے گال پر بوسہ دے کر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا تھا کہ.. ڈیئر گرل میں تم سے محبت کرتا ہوں.. تمہیں ایک عام مریض نہیں سمجھتا اس لئے بتا رہا ہوں کہ یہ گولیاں اور کیپسول چند دنوں کے لئے تاخیر کر سکتے ہیں لیکن انجام نہیں بدل سکتے.. تم جو کچھ طے کرنا چاہتی ہو کر لو... سائیں آپ وعدہ کرو کہ میرے بعد آپ میری بچی کا خیال رکھو گے...."

اُس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور اطمینان تھا... ایک ناقابل واپسی زندگی کی حقیقت جان لینے کا اطمینان..

"آئی پرامس..."

اگلی دوپہر زیرو پوائنٹ کی دھوپ اور ویرانی میں.. جب کہ وہ تکونی لمبی دم والا کرلا منتظر تھا کہ کب چٹان کی قربت میں کھڑے یہ دو انسان غافل ہوں اور کب میں رینگتا ہوا تارکول کی سڑک کو پار کر جاؤں اُس نے پچھلی شب عابدہ کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی اُس کا تفصیلی تذکرہ کیا.

اُس کی غلافی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں.. چھلکنے لگیں..

وہ اپنے کالج دنوں کے زمانے سے اُس کے لئے بھڑکنے والے الاؤ کو بجھا دینے پر

پچھلی شب کی مانند ریت کا ایک چھوٹا سا کوہان پانیوں میں اُبھرا ہوا نہ تھا.. بہت وسیع تھا..

اس لئے فہیم یہاں بے خطر جھومر ڈال سکتا تھا اور وہ ڈال رہا تھا..

جعفر پانی میں لڑھک جانے کے خدشے سے بے نیاز بوٹی پی سکتا تھا اور وہ پی رہا تھا..

فہیم جھکا ہوا چہرے کو ایک جانب کئے ہوئے جیسے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہو.. دونوں ہاتھ فضا میں اُٹھائے پاؤں مارتا جھومر ڈالتا تھا.. مرغابی کی موت ایڈورٹائز ہو رہی تھی..

چونکہ وہ حلال تھی اس لئے اُسے ذبح کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی... صرف گردن کاٹ کر اُس کی بے مثال چونچ اور ابھی تک زندہ کانچ کی آنکھوں سمیت اُسے پرے پھینک دیا گیا اور پھر پروں کو نوچ کر اُسے صاف کر لیا گیا.. ان پروں کے گچھے اور اکا دکا پَر اُس ریت پر بکھرے ہوئے تھے جس پر فہیم رقص کر رہا تھا اور اُس کے پاؤں اُن پر پڑتے تو اُن کی پرجوش زد میں آکر کوئی ایک پَر ذرا بلند ہوتا... اُس کا رنگ کچھ بھی ہو سکتا تھا.. سیاہ' بھورا' نارنجی یا چمکیلا سرمئی.. یا سفید بھی.. اور پاؤں کی دھمک سے اُٹھا پَر ہوا میں کچھ دیر ٹھہرا رہتا اور الاؤ کی روشنی سے زندہ لگنے لگتا.. یہ پَر بھی ایک مرغابی تھی جو ابھی تک اُڑنے کی سعی کرتی تھی... اپنا کل نہ سہی ایک جز سہی' پھر سے پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی..

خاور گھٹنوں پر سر رکھے مسحور ہوا صرف فہیم کے پاؤں کو تکتا تھا اور انتظار کرتا تھا کہ کب کوئی ایک اور پَر اُس کے تلووں کے نیچے سے جنم لینے والی ہلکی ہوا کی زد میں آکر ریت میں سے بلند ہو اور الاؤ کی روشنی میں ظاہر ہو... ڈولتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتا جائے.. وہ جس نے انسان کو پانی کی ایک بوند سے تخلیق کیا تھا اور روزِ حشر اُس کی ہڈیوں کو سمیٹ کر پھر سے زندہ کر دیتا تھا.. یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس پرندے کے سارے پَر جو ریت پر بکھرے ہوئے ہیں اُنہیں بھی سمیٹ کر اُسے پھر سے بنا دے' تیار کر دے' زندہ کر دے اور اُسے اپنے آبائی گھونسلے کہیں جھیل بیکال کے سرکنڈوں میں منتظر گھونسلے کی طرف لوٹا دے..

جب تک یہ نہیں ہوتا تھا وہ فہیم کے پاؤں میں سے اُٹھنے والے ہر پَر سے وہی ایک مرغابی تخلیق کرتا تھا اور اُسے اس جزیرے کی گھنی رات میں سے بلند کر کے اُن بلندیوں پر بھیجتا تھا جہاں سے راستے سیدھے اُس کے گھونسلے کو جاتے تھے..

ایک مرغابی کا اگرچہ خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ اُس کے لئے از حد آزردہ

ہو رہا تھا.. اور یہ آزردگی کتنی جعلی اور کھوٹی تھی.. ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اسی مرغابی کا گوشت دیسی گھی میں بھنا ہوا ہانڈی سے اُترا تھا اور اُس میں اُن اُپلوں کی بُو تھی جو پکھی کے ہاتھوں نے سلگائے تھے تو اس نے اُسے کتنی رغبت سے کھایا تھا.. ایک ایک ہڈی چوسی تھی... کسی بھی احساسِ جرم کے بغیر... چنانچہ دراصل وہ خود ہی وہ شکاری تھا جس نے بنا جھجک اُسے مار گرایا تھا... اور اب خود ہی آزردہ ہوا تھا کہ اس آزردگی کے لئے حسِ جمال ایک بہانہ تھی ورنہ زبان کے ذائقے نے تمام جمالی اخلاقیات کو... کسی بھی احساسِ جرم کے بغیر تہہ تیغ کر دیا تھا..

اور اب وہ شرمندہ محسوس کر رہا تھا.. قتل کرنے کے بعد شرمندگی کی آڑ میں اُلٹا ثواب لے رہا تھا..

اس احساس میں کہیں بھی یہ ضمانت نہیں تھی کہ اگر کل رات بھی اُس کے سامنے دیسی گھی میں بھنی ہوئی ایک اور مرغابی ہانڈی سے اُترتی ہے تو وہ اُسے کھانے سے پرہیز کرے گا.. وہ اپنی خصلت کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا اور اسی خصلت میں جو آزردگی تھی وہ بھی اُس کے بس سے باہر تھی..

جہاں کشتی بندھی تھی.. دونوں خیمے تاریکی میں تھے' چولہا جلا تھا اور مرغابی کے پروں کے گچھے کچھ ریت پر پڑے تھے اور کچھ فہیم کے رقص کرتے پاؤں کے طفیل ہوا میں بلند ہو کر سندھ کے سیاہ پانیوں میں جا اُترے تھے اور اُن پر بہتے ہوئے جانے کہاں تک چلے گئے تھے.. دریا کا ایک بہت چوڑا میدان نما ریتلا کنارا تھا.. بہت دور جا کر یکدم اونچا ہوتا تھا اور وہاں سے سروٹوں کے ذخیرے کا آغاز ہو جاتا تھا..

فہیم حسبِ معمول جھومر ڈالنے کا فرض ادا کر کے ہانپتا ہوا بیٹھ گیا..

"میں اپنے گاؤں سے ہو کر آیا ہوں سائیں.. پورے گاؤں میں گھوم گیا پر ایک مرغی بھی نہ ملی.. انڈوں والی مرغیاں لوگ فروخت نہیں کرتے.. پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ غلام محمد شمر سے پتہ کروں اُسکے پاس تو دنیا جہان کی مرغیاں جمع ہوتی ہیں... خود نہیں پالتا سائیں.. آس پاس کے گاؤں سے 'کھیتوں سے پکڑ لاتا ہے' کہتا ہے کہ آوارہ مرغیاں تھیں... تو آج اُس کا صحن بھی خالی تھا.. واپسی پر دریا میں ٹہلتا آ رہا تھا تو سوہنے رب نے یہ تحفہ تیرتا بھیج دیا..."

"عجیب سا نام ہے غلام محمد شمر..."

تیار ہو گئی.. پچھلی شب کی درخواست سننے کے بعد وہ عابدہ سومرو کے حق میں دستبردار ہونے کو... اپنی رضا سے اور خوشی سے تیار ہو گئی..

"تم نے اُس کے آخری دنوں میں.. جیسے بھی ہو خوش رکھنا ہے.. اُسے دُکھ نہیں دینا اُس کا خیال رکھنا ہے.. اُس کی بچی کو سنبھالنا ہے.." اور اُس کی غلافی آنکھوں میں پانیوں کا اتنا ذخیرہ کبھی نہ تھا جو اُمڈتا ہوا.. ایک سیلاب کی صورت اُس کے گالوں پر ایک ندی کی طرح بہتا تھا.. پاگل خانے کی نظروں میں.. بشیر اور اُس کی شریفاں خاتون کی نگاہوں میں وہ مجرم ٹھہر گیا تھا.. اُس کے خلاف ایک جذباتی بغاوت ہو چکی تھی کہ وہ کیوں اِس دُکھیا اور قریب المرگ عورت کے لئے کچھ نہیں کرتا.. اُس کے لئے دوا کیوں نہیں ہوتا..

لیکن دوا کیا تھی؟..

ڈھلتی دھوپ میں سندھ 'پارے کا ایک سمندر تھا.. آنکھ اُس پر ٹھہرتی نہ تھی..

جیسے کسی تیل بردار جہاز میں شگاف پڑنے سے پٹرول بہہ نکلے اور دور دور تک سمندر کی سطح پر پھیل جائے اور پھر کوئی ماچس کی ایک جلتی ہوئی تیلی اُس پر پھینک دے اور وہ بھڑک اُٹھے... ایسے سندھ کے پانی ڈھلتی دھوپ میں لشکتے تھے کہ اُن پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی..

اور اس سیماب صفت چمک کو چیرتی اُن کی کشتی تھی..

اور اس تھر تھراتی لشکتی وسیع پارہ چادر میں تیرتا فہیم تھا جو کشتی کے قریب ہوتا جا رہا تھا.. جیسے سیال چاندی میں ڈوبتا اُبھرتا بڑی بڑی مونچھوں والا ایک لدھڑ ہو..

وہ جعفر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر عرشے پر آ گرا اور اُس کے بدن سے نچڑتا پانی کشتی کے تختوں میں جذب نہیں ہوا بلکہ سطح پر ٹھہر گیا اور وہ بھی جھلملانے لگا.. جیسے وہ اپنا پارہ ساتھ لے آیا ہو.. تھوڑی دیر اُسی حالت میں پڑا فہیم ہانپتا رہا کپکپاتا رہا اور وہ جو اسے دیکھتے تھے اُنہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا اور پھر اپنے سر کے بالوں کو یوں جھٹکا جیسے ایک کتا اتفاقاً پانی میں جا گرے تو وہ باہر نکلتے ہی پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے بدن کو خشک کرنے کی خاطر اُسے خوب جھٹکتا ہے..

"دیسی مرغی تو نہیں مل سکی سائیں.. پر اُس سے بہتر شے مل گئی ہے.." اُس نے کندھوں پر بندھی نچڑتی ہوئی پوٹلی اُتار کر اُس کی گانٹھ کو مشکل سے کھولا.. انگلیوں سے نہیں

کھلی تو دانتوں سے کھولا... اُس میں ایک مرغابی تھی.. گردن ڈھلکی ہوئی تھی' چونچ سے پانی بہہ رہا تھا اور اُس کی پرکشش آنکھیں زندہ اور کھلی تھیں.. "مرغی نہیں ملی ناں تو مایوس واپس آ رہا تھا.. تو میں تیرتا ہوں تو یہ میرے آگے سے بہتی ہوئی جا رہی ہے.. میں نے تھوڑا پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا.. کسی شکاری کے فائر سے زخمی ہو کر گری ہے تو سندھ پر گری ہے اور وہ اسے نکال نہیں سکا اور یہ بہاؤ کے اندر آ کر اُس کی پہنچ سے دور ہو گئی ہے.. دیکھیں.." اُس نے مرغابی اُٹھا کر اُس کا ایک تیز دھڑکتے رنگوں والا پر چٹکی میں لے کر اونچا کیا "ادھر... اُڑتے ہوئے پر کے نیچے چھرّے نے ماری ہے... حلال ہے سائیں' شکاری پڑھ کر فائر کرتے ہیں... ہاتھ لگا کر دیکھیں ابھی گوشت میں گرمی ہے.."

خاور نے ہاتھ بڑھا کر اُسے محسوس کیا.. پر کے نیچے.. ابھی تک زندگی کی کچھ حرارت باقی تھی اگرچہ زندگی رخصت ہو چکی تھی اور یہ حرارت اُس کی اُنگلیوں کی پوروں کے راستے سارے بدن میں پھیلتی گئی اور ایک شاہکار پرندے کی مرگ پر ماتم کرتی گئی.. اُس کے چپو نما پنجے حیرت انگیز طور پر کسی کھلونے کے لگتے تھے' ربڑ کے بنے ہوئے لگتے تھے... چونچ پلاسٹک کی لگتی تھی.. البتہ کھلی آنکھوں میں کوئی شک نہ تھا اُنہیں کوئی کاریگر نہ بنا سکتا تھا.. وہ زندہ اور دیکھتی تھیں..

انسان اپنی متوقع موت کو کتنا مشتہر کرتا ہے.. اپنے آپ کو اور دوسروں کو رُلاتا ہے کہ... اوڑک جاناں مر وے چل میلے نوں چلئے... لیکن اپنے سے کہیں بڑھ کر متناسب... پرکشش اور خوبصورت... اور اس دنیا میں رہ جانے کے حقدار پرندے کا نشانہ لگاتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتا... بلکہ اُس کی مرگ پر شاداں ہوتا ہے اور فخر کرتا ہے.. اگر اس مرغابی کو پہلے سے علم ہو جاتا کہ مجھے مرنا ہے.. آج اتنے بج کر اتنے منٹ پر... جب میرے نیچے پھیلے دریا کو دھوپ نے سفید آگ سے ڈھک رکھا ہو گا تو چند چھرّے میرے دائیں پر کے نیچے میرے بدن میں داخل ہو کر میری آنکھیں پتھرا دیں گے' پنجوں کو بے جان کر دیں گے اور میں دریا کی سفید آگ میں گر کر ٹھنڈی ہو جاؤں گی تو کیا یہ مرغابی بھی رُلاتی.. اپنی متوقع موت کو مشتہر کرتی...

جزیرہ جس پر رات آئی بہت بڑا تھا..

"ہاں سائیں.. خود بھی بہت عجیب ہے.. کہتے ہیں کہ پرانا پڑ گیا ہے.. میں بالکل نہیں سائیں.. تو میری طرح گاؤں کے سکول میں ٹیچر ہے.. کہنے لگا' مرغی تو نہیں ہے پر اُدھر سندھ سائیں میں جو مسافر دوست آئے ہیں اُنہیں ملنے میں بھی چلتا ہوں.. پر میں نہیں لایا سائیں.. شمر کا کوئی اعتبار نہیں.."

"کیوں؟"

"شمر جو ہے.. اُس میں شر بہت ہے سائیں.. مزاق میں لوگوں کا نقصان کر کے خوش ہوتا ہے.. اُدھر گاؤں میں ایک شخص نے کوٹھے ڈالنے کے لئے چھ سات شہتیر خرید کر لایا اور گھر کے سامنے ڈال دیئے.. شمر نے وہ شہتیر دیکھے تو ترکھان کے پاس چلا گیا.. بیس روپے پیشگی ادا کئے اور کہنے لگا' بیٹے فلاں جگہ میرے شہتیر پڑے ہیں اُنہیں آری سے چھوٹی چھوٹی تختیوں میں کاٹ دو بچوں کو دینی ہیں پر یہ کام صبح نو بجے سے دو بجے تک ہو جانا چاہئے.. ترکھان نے یہ کام کر دیا۔ ڈھائی بجے وہ شخص کام سے واپس آیا تو اُس نے سر پیٹ لیا.. ہزاروں روپے کی مالیت کے شہتیر بیکار قسم کی تختیوں میں بدل چکے تھے.. اور پھر بقیہ مزدوری لینے کے لئے ترکھان بھی پہنچ گیا..."

"شمر کی بات کرتے ہو فہیم..." سرور اندھیرے میں سے باہر آ کر الاؤ کی راکھ ہوتی لکڑیاں پلٹنے لگا.. اور ہنسنے لگا..

"ہاں..."

"سائیں کو وہ بتاؤ ناں کہ شمر حجام کے پاس جاتا ہے... پہلے بال کٹواتا ہے.. پھر اُن کو دھلاتا ہے پھر کہتا ہے کہ اب اُسترا پھیر کر ٹنڈ کر دو... اور جب اُٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے تو صرف ٹنڈ کرائی ہے اور آٹھ آنے دے کر چلا جاتا ہے.."

فہیم بھی ہنسنے لگا.. اور اتنا ہنسا کہ دوہرا ہو کر گرنے کو تھا کہ پھر سنبھل گیا...

"سائیں پچھلی رات کا خدشہ ابھی تک ہے.. وہاں دوہرے ہو کر گرتے تھے تو سندھ میں جا گرتے تھے.. یہاں خیر ہے.. سائیں شمر کی کیا بات ہے.. سکول کے ہیڈ ماسٹر کے ساتھ دشمنی بنالی.. ایک مرتبہ انسپکٹر صاحب سکول کی انسپکشن کو آئے تو شمر ذرا دیر سے آیا اور آیا ہے تو سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت کلاس روم میں داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے.. دیر سے آنے کی معافی چاہتا ہوں سرکار.. لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیگم نے آج بھی بلا لیا تھا کہ گھر کی

چھت ٹپکتی ہے اُس پر لیپ کرنے کے لئے گارا تیار کرو.. وہیں سے آ رہا ہوں اس لئے دیر ہو گئی ہے.. چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی چھٹی ہو گئی کہ اساتذہ سے گھر کا کام کرواتے ہیں.."

ہر علاقے ہر ثقافت اور ہر مذہب کی حس مزاح الگ الگ ہوتی ہے.. خاور بھی مرغابی آزردگی سے کسی حد تک باہر آ گیا.. مسکراتا رہا لیکن سرور اور فہیم نے اگر بُوٹی سے بھرا کجا خالی نہ بھی کیا ہوتا تو وہ اسی انداز میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہوتے..

ماماں جعفر اس کُجّے میں شریک نہ ہوا تھا.. اُس نے اپنا بندوبست الگ کیا تھا.. کشتی کو کناروں کے ساتھ باندھنے کے عمل سے فارغ ہو کر وہ فوراً کسی آبائی نسخے کے مطابق بھنگ گھوٹنے میں مصروف ہو گیا تھا.. اس لئے اُس پر رنگ چوکھا آیا تھا.. وہ ایک فلسفی کی طرح دریا کے کنارے آہستہ آہستہ چلتا جاتا جیسے کسی کائناتی گتھی کو سلجھانے میں مگن ہو اور پھر بہت دور جا کر ریت پر براجمان ہو کر پانیوں کی سیاہ چادر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا.. پھر ہڑبڑا کر اُٹھتا اور نہایت خوفزدہ حالت میں بگٹٹ بھاگتا اُن کے قریب آ جاتا.. اُنہیں دیکھ کر ہنستا اور پھر سے فلسفی ہو کر دریا کے کنارے چلنے لگتا.. اُس نے اپنی ساوی میں کسی کو شریک نہیں کیا تھا..

"گھر کب جائیں گے سائیں.." فہیم ہنستا ہوا چپ ہو گیا.. اُسے دیکھا.. اور وہ دیر سے چپ تھا..

"کونسے گھر؟"

"آپ کا گھر تو ہے ناں سائیں.. جہاں سے آپ اِدھر ہمارے دیس میں آئے ہیں.."

"نہیں..."

"جانے دیں سائیں.. شمر کی طرح مخول تو نہ کریں.. بندے بشر کا کوئی نہ کوئی گھر تو ہوتا ہے جدھر وہ لوٹتا ہے.."

"نہیں ہے فہیم.. کوئی بھی دیوار.. چار دیواری.. کوئی ایک چھت اس وقت وجود میں نہیں ہے جو میرا گھر ہو سکے.. اس لئے مجھے پتہ نہیں کہ میں نے کب اور کہاں واپس جانا ہے.."

فہیم نے پہلے تو اس بیان پر قہقہہ لگانے کے بارے میں سوچا کہ بُوٹی کی سرمستی نے اُس کے اندر جو دُھوم مچائی تھی اُس کا یہی تقاضہ تھا لیکن پھر اُس نے اپنے آپ پر قابو پا کر

بے یقینی کے عالم میں سنجیدہ سی شکل بنائے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ سائیں کیا کہتے ہو گھر تو ہر ایک کا ہوتا ہے.. اُس مرغابی کا بھی ہو گا جو ہم نے بھون کر کھائی ہے..

"تم کیوں پوچھتے ہو فہیم؟"

"سائیں سرور آپ سے بات کرتے ہوئے جھجکتا ہے تو وہ پوچھتا تھا... کہتا تھا کہ کئی دن ہو گئے ہیں سندھ کے پانیوں میں.. ادھر شکار وکار.. دارو شارو.. وغیرہ کا تو کوئی پروگرام نہیں تو.. صاحب سے پوچھ دو کہ واپس کب ہونا ہے.."

"مجھے نہیں معلوم... ان لوگوں سے بر مالی نے یہی طے کیا تھا کہ جب تک میں کہتا ہوں انہوں نے چلتے جانا ہے.. ان کو ادائیگی ہوتی جائے گی.. تو انہیں کیا غرض ہے کہ کوئی پروگرام ہے یا نہیں.. یہ کشتی کھیتے جائیں.."

"جو حکم سائیں.." فہیم نے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی اظہار نہ کیا "اجازت دو سائیں.. نیند بلاتی ہے" وہ اُٹھا.. اور اُس کے اُٹھنے سے.. پاؤں میں بوٹی کی جو مستی تھی اُس کی ٹھوکر سے مرغابی کا ایک اور پَر فضا میں بلند ہوا...

فہیم چلا گیا لیکن وہ پَر ہوا میں معلق رہا...

جعفر اور سرور بھی اپنی اپنی تاریکی میں اُتر گئے.. الاؤ مکمل طور پر راکھ ہو چکا تھا.. کہیں کوئی ایک چنگاری بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود اُس کی روشنی کا گمان موجود تھا.. اور اس گمان میں وہ ایک پَر دکھائی دیتا تھا.. جس کے بغیر وہ پرندہ روزِ حشر سمیٹا نہیں جا سکتا تھا.. اس ایک پَر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا..

کیا یہ پَر تھا یا اُس کے ہونے کا گمان تھا..

"انڈس کوئین" کا سفر جاری تھا..

وہ بے آواز گزرتی تھی..

اُس کے سٹیم انجن کی آواز نہ آتی تھی..

عرشے پر کوئی گہما گہمی نہ تھی.. معمول کی رونق نہ تھی.. نہ راج کے برتر آقا تھے اور نہ اُن کے آگے جھکے ہوئے غلام تھے... یہاں تک کہ کموڈ بھی خالی تھا.. البتہ قمقمے اُسی طور روشن تھے اور جھولتے تھے.. ویرانی تھی.. اور عرشے کے درمیان میں ایک بدن پڑا تھا جس پر جا بجا دھبے اور کھرینڈ تھے... نیپام بموں کی ہلاکت خیز آگ سے فرار ہوتی خوفزدہ.. روتی

ہوئی.. ناتواں ٹانگوں سے بھاگتی ہوئی ایک برہنہ بچی کا بدن تھا جو عرشے پر پڑا تھا... غلافی آنکھیں اُس پر جھکیں آنسو بہاتی تھیں..

جیسے ایک پَر ابھی تک فضا میں معلق تھا.. یا اُس کا گمان تھا جو ٹھہرا ہوا تھا.. بجھ چکے الاؤ کی مانند...

ایسے انڈس کوئین تھی جو سندھ کے پانیوں پر بے آواز گزرتی تھی..

اور برہنہ بچی کا بدن عرشے پر پڑا تھا.. شاید یہ بھی ایک گمان تھا..

"میرے ساتھ آجائیں سائیں..."

کراچی ایئرپورٹ کے بے ترتیب بھیڑوں ایسے انسانی اژدہام میں سے اپنے آپ کو کھینچتا بچاتا جب وہ باہر آیا اور ایڈورٹائزنگ فرم کے اُس ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا جو ہر ہفتے اُسے ایئرپورٹ پر لینے آتا تھا تو اُس کے سامنے یکدم ایک جن کی طرح گھنی مونچھوں اور شیشوں سے بھری چوکور سندھی ٹوپی اوڑھے ایک شخص نمودار ہوا اور ذرا جھک کر کہنے لگا

"میرے ساتھ آجائیں سائیں.."

اُس نے اُسے ایک نظر دیکھا.. وہ اُس کے چہرے سے ناواقف تھا.. چنانچہ جواب میں اُس نے کچھ نہ کہا.. چپ رہا اور ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا..

وہ شخص بھی چپ کھڑا رہا.. اور ایک خاص وقفے کے بعد جو ادب کے لئے درکار تھا پھر ذرا جھک کر بولا.. "سائیں آپ میرے ساتھ آجائیں.."

"تم کون ہو؟"

"میں قادر ہوں سائیں' آپ کو لینے آیا ہوں.. میرے ساتھ آئیں.."

"کہاں؟" وہ شکل سے بے حد مخدوش لگتا تھا اور کراچی ایسا شہر نہیں تھا کہ آپ کسی اجنبی کے ساتھ ایک دو فقروں سے زیادہ بات کرنے کا خطرہ مول لیں..

"گاڑی پارکنگ میں ہے سائیں.. آپ کا بیگ اُٹھاتا ہوں.."

"نہیں.."

"مہربانی کرو سائیں.."

"تمہیں.. کس نے بھیجا ہے؟" یہ ممکن تھا کہ فرم کا وہ ڈرائیور چھٹی پر چلا گیا ہو

اور یہ اُس کی جگہ آیا ہو..

"میرے ساتھ آئیں.. سرکار وہیں ہیں..."

سرکار... عابدہ سومرو تھی.. نسان پٹرول کی پچھلی نشست پر سیاہ گوگلز لگائے ونڈ سکرین کے پار دیکھتے ہوئے.. لیکن اُس کا چہرہ روشن تھا' خوشی سے دمکتا ہوا.. اُس نے خاور کی جانب دیکھا نہیں لیکن اُس کا پورا وجود اُس کی موجودگی سے آگاہ تھا..

قادر نے نہایت ادب سے دروازہ کھولا اور وہ سمٹ کر ذرا پرے ہو گئی اور خاور اُس کے برابر میں بیٹھ گیا.. وہ بدستور سامنے دیکھے چلی جا رہی تھی اور اُس کی مسکراہٹ تھمنے میں نہ آتی تھی..

سوائے ونڈ سکرین کے تمام شیشے سیاہ تھے..

نسان پٹرول ایئرپورٹ پارکنگ سے باہر آگئی..

وہ اُس کی خاموشی سے تنگ آگیا "تم مجھے اغوا کر رہی ہو؟"

"ہاں.. "اُس نے صرف اتنا کہا..

"کیا مطلب ہے' ہاں.. "اُسے اُلجھن بھی ہو رہی تھی جو عابدہ سومرو کی قربت میں اُسے ہمیشہ ہوتی تھی اور اُسے یوں اچانک قریب پا کر مسرت کا ایک احساس بھی ہو رہا تھا.. اسی لئے وہ اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا..

"اس کے سوا چارا نہ تھا.. اب مرید کتنی بار مرشد کی چوکھٹ پر جائے.."

"مرید کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ مرشد روزی روزگار کے سلسلے میں اس شہر میں آیا ہے.. کسی رومینٹک ایڈونچر کے لئے نہیں.."

"آپ کا روزی روزگار تو ہم ہیں سائیں.. "اُس نے ابھی تک اُسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا اور سامنے نظریں جمائے بُت بن بیٹھی تھی.. "سائیں آپ ہر ہفتے اِدھر ہمارے گاؤں کراچی میں آؤ اور چپکے سے واپس چلے جاؤ.. ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں.."

"بہر حال آج پچھلے پہر چار بجے ایک اشتہاری مہم کے سلسلے میں میری ایک نہایت اہم میٹنگ ہے.."

"میٹنگ کینسل بھی ہو سکتی ہے سائیں لیکن میٹنگ نہیں.. "وہ مسکراہٹ سے ہنسی میں چلی گئی.. آج اُس کی آواز میں وہ گہری جنس بھری رغبت مفقود تھی اور وہ نہایت نارمل

انداز میں گفتگو کر رہی تھی.. نہ ہی اُس میں کوئی دُکھ یا درماندگی تھی.. بلکہ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی پُر سکون اور زندگی سے اُبلتی ہوئی خوش تھی..

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"میرے منہ پہ رونق نہیں آگئی.. "اور وہ واقعی روشن ہو رہی تھی "بیمار کا حال اچھا ہے سائیں.. تمہیں دیکھنے سے"

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"جہاں میں تمہیں لے چلوں..."

"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ مجھے بہر طور وہ میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے.. میں اُسے کسی حالت میں بھی مِس نہیں کر سکتا.."

"آپ کو پہنچا دیں گے سائیں.. ابھی تو بہت وقت ہے.. آپ ہماری راجدھانی میں ہیں.. یہاں ہمارا راج ہے.. ہم زبردستی بھی کر سکتے ہیں.."

"یعنی مجھے واقعی اغوا کیا جا رہا ہے.."

"ہاں.. "اُس نے سر ہلایا اور سامنے ونڈ سکرین پر سیاہ گوگلز میں پوشیدہ آنکھیں جمائے مسکراتی رہی..

طارق روڈ پر گھنی ٹریفک ایک تسلسل اور ایک باقاعدگی سے حرکت کرتی جاتی تھی..

"میں تمہارے لئے ترس گئی تھی.. "اُس نے پہلی بار اپنی نظریں ونڈ سکرین سے جدا کیں' سیاہ گوگلز اُتارے اور اُس پر بچھ گئی..

"فار ہیونز سیک.. "اُس نے اپنے آپ کو چھڑایا "یہ تم کیا کر رہی ہو... ڈرائیور..."

"قادر کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا... یہ میرا ہمراز ہے.. جیسے حرم سراؤں کے خواجہ سرا زبان نہیں رکھتے تھے.. سب دیکھتے تھے لیکن کچھ نہیں کہتے تھے.. "وہ پھر اُمڈنے لگی..

"نہیں... "اُس نے اپنے آپ کو پھر الگ کیا "مجھے.... یہ اچھا نہیں لگتا.."

"قادر جو کچھ دیکھتا ہے اُس کے مقابلے میں یہ تو بچوں کی چھیڑ چھاڑ ہے.. بابا سائیں کو اس نے کن حالتوں میں نہیں دیکھا.. یو کینٹ امیجن... باہر سے اندر کچھ دکھائی

نہیں دیتا اور قادر یہاں نہیں ہے.. تم سمجھ لو کہ ہم ایک بند کمرے میں ہیں' تنہا ہیں..."

"میں نہیں سمجھ سکتا.."

"لیکن میں تو سمجھ سکتی ہوں..."

فلیٹ فلی فرنشڈ تھا..

اس میں اس کے مکین کی سانسیں ابھی تک موجود تھیں اور یہ باقاعدہ ایک رہائش گاہ تھا.. یہ وہ آماجگاہ نہیں تھی جو بوقت ضرورت کھلتی ہے اور وہ ضرورت پوری ہونے کے بعد پھر بند سکوت میں اُتر جاتی ہے اور صرف ایک آراستہ بستر اُس کی آرائش کا اہم ترین جز ہوتا ہے..

یہاں جو کوئی بھی رہتا تھا ذوق رکھتا تھا..

کوئی بھی روشنی براہ راست نہیں تھی.. مدھم اور ملائم انداز میں تھی..

آرائش اگرچہ جدید رنگ میں تھی لیکن اس میں مشرق کا.. بلکہ سندھ کا ایک چھڑکاؤ بھی تھا.. جیسے شیف کسی خاص ڈش کی ترکیب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب... اسے ڈیش آف سویا ساس... ایسے اس فلیٹ کے مغربی ڈیکور میں.. اے ڈیش آف سندھ..

اور اس ڈیش میں سب سے بھاری اور نمایاں پلنگ تھا... چوڑا' موٹے اور پستہ قد فیل پایوں پر براجمان پلنگ فرش سے دو بالشت بھی اونچا نہ ہوگا.. اُس پر بچھی رَلی کے ہر پیوند میں کہیں گول کہیں چوکور' شیشے بڑی نفاست سے ٹانکے گئے تھے... پلنگ کے سرہانے میں سے ایک چوبی مور کی شکل ابھری ہوئی تھی جو کسی دیہاتی کاریگر نے تراشی تھی... اس میں نفاست تو نہیں تھی ایک خاص قسم کا کھردرا پن تھا اور یہی اس کی خوبی تھی.. مور کی اس شکل میں صرف مور نہ تھا بلکہ تراشنے والے کی قوت واہمہ بھی شامل تھی.. جس نے اُسے انوکھی وضع دے دی تھی.. یہ پرندہ جو مور سے مشابہ تھا پَر سمیٹے ہوئے تھا اور اس کی لمبی گردن کے نیچے جو بدن تھا اس پر کسی ماہر آرائش نے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے پرانے فریم جڑے ہوئے تھے جن میں مختلف صورتوں اور شکلوں کے آئینے تھے.. ان میں ہر آئینہ دھندلایا ہوا اور بجھا ہوا تھا اور اپنی قدامت کے برسوں کی گواہی دیتا تھا.. جسامت میں الگ الگ.. کل سات آئینے تھے.. ہر آئینے کے گرد جو چوکھٹا تھا اس کی نقاشی الگ تھی' قدامت میں فرق تھا... کسی پر بیل بوٹے کھدے تھے اور کسی پر صرف لاکھ کے گوڑے رنگ تھے... اگرچہ پرانے ہونے

کے باعث نیم سیاہ ہو رہے تھے... وہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ سندھ کے صحرائی خطوں کے دور افتادہ دیہات کے کچے کوٹھوں' گوپوں اور جھونپڑیوں میں سے آئے ہیں.. ان میں سینکڑوں چہرے جذب تھے جو انہیں دیکھتے تھے اور اپنے رُوپ پر ناز کرتے تھے.. اور جب یہ اُن کے لئے کسی کام کے نہ رہے.. ماند پڑگئے' دھندلا کر اندھے ہونے کو آئے تو انہیں بڑے شہر سے آیا ہوا کوئی بیوپاری نئے چمکیلے پلاسٹک کے فریموں میں جڑے ہوئے آئینوں کے بدلے میں لے گیا..

پلنگ کے دائیں جانب جہاں داخلے کا دروازہ تھا اُس کے برابر میں ایک قدیم وضع کا سندھی جھولا پڑا تھا.. اور اس پر بھی لاکھ کے کام کی نہایت پُر آرائش اور رنگین نقاشی تھی..

پلنگ کی پائنتی کے سامنے کی پوری دیوار شیشے کی تھی..

پردے سمیٹ دیئے گئے تھے..

سورج بند شیشوں کی بڑی کھڑکی کی سطح سے ابھی اوپر تھا پھر بھی اُس کی تیز روشنی ایک خاص زاویے سے مور کے پَروں پر آویزاں اُن سات آئینوں پر پڑتی تھی تو دھندلاہٹ کے باوجود وہ چمک سے دمکنے لگتے تھے.

کھڑکی کے نیچے قطار اندر قطار پستہ قد عمارتیں تھیں جو صرف جھانکنے سے نظر آتی تھیں ورنہ اُن کے پار جو سمندر وسیع ہوتا تھا وہ پلنگ پر بیٹھنے سے کھڑکی میں سے اُمڈتا اندر آتا محسوس ہوتا تھا..

پاگل خانے کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ اُسے ایک کوٹھڑی میں بند کر لے اور جب جی چاہے اس کا قفل کھول کر اُسے دیکھ لے..

یہ دبلی پتلی ویتنامی بچی بھی کسی ایسی ہی خواہش کی اسیر تھی.. وہ بھی اُسے اس فلیٹ میں بند کر کے جا چکی تھی..

نسان پٹرول جب اس رہائشی کامپلیکس کی ایک عمارت کے قریب آ کر رُک گئی تھی تو عابدہ نے یکدم اپنے آپ کو اور اپنی مسکراہٹ اور لبادے کو سمیٹ کر نہایت نپے تلے انداز میں کہا تھا... تم قادر کے ہمراہ اوپر چلو... میں بعد میں آؤں گی.. ہمیں اکٹھے نہیں دیکھا جانا چاہئے..

گیارھویں منزل پر لفٹ سے باہر آ کر.. ایک طویل اور بے آباد سی راہداری کے

آخر میں قادر نے اپنے اجرک کے نیچے کرتے کی گہری جیب میں سے ایک چابی نکال کر ایک فلیٹ کے دروازے کو کھولا تھا اور ایک گونگے خواجہ سرا کی طرح جھک کر ایک اشارے سے اُسے اندر جانے کو کہا تھا۔ اس نے اس کا بیگ اندر رکھا اور جب وہ پلنگ کے سرہانے میں سے اُبھرے مور کے پروں پر آویزاں پرانے آئینوں کو دیکھ رہا تھا اس کے کانوں میں دروازہ بند ہونے کی آواز آئی..

وہ اپنے ذہن میں حساب لگاتا رہا کہ قادر اتنی دیر میں نیچے پہنچے گا.. پھر عابدہ کو اوپر آتے ہوئے اتنا وقت لگے گا.. اور وہ اس دوران فلیٹ کا جائزہ لیتا رہا.. لیکن جب اتنی دیر سے کہیں زیادہ دیر ہو گئی.. پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا.. اُسے دھکیلا.. بار بار ہینڈل گھمایا.. قادر اُسے مقفل کر کے جا چکا تھا... پہلے تو شدید جھنجھلاہٹ اور کسی حد تک طیش میں آ کر اس نے دروازے پر زور زور سے دستک دی... باہر نکلنے کے لئے کسی اور دروازے کی بے سود کوشش کی اور پھر تھک ہار کر پلنگ پر بیٹھ گیا.. وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے جان بوجھ کر مقفل کر دیا گیا ہے.. کوئی نہ کوئی وجہ ہو گی... کوئی مسئلہ ہو گا... اور بالآخر اس کی کوئی سادہ اور قابل فہم توجیہہ ہو گی... یہ کیسے ممکن تھا کہ... تقریباً دو گھنٹے گزر گئے.. اُس کا غصہ اور طیش بے بسی اور جھلاہٹ میں بدلنے لگے... یہ اس کا اپنا کیا دھرا تھا.. کیا ضرورت تھی اس قسم کی مخدوش خواتین سے راہ و رسم بڑھانے کی... اپنی مردانہ انا کی تشفی کے لئے صرف ایک ٹیلی فون کال پر ملاقات کے لئے مان جانے کی... زوال کے ان برسوں میں اس قسم کے تجربے کرنے کی کیا ضرورت تھی.. پلنگ کے سرہانے پر آویزاں سات آئینوں میں وہ اپنے آپ کو دیکھتا تو اس کا چہرہ مزید دھندلا جاتا... بہت ہی مضحکہ خیز دکھائی دیتا اور عجیب سے ڈر اس مقفل بے چارگی میں اس کے ذہن میں اُبھرتے... ہو سکتا ہے وہ اپنی متوقع موت کی دہشت میں آ کر ایک سیریل کلر میں بدل گئی ہو... دوسروں کو بھی زندہ نہ دیکھنا چاہتی ہو... یہ اس کا طریقۂ واردات ہو... اپنی گہری جنسی آواز کے گرداب میں گھیر کر اُنہیں اس فلیٹ میں لے آتی ہو... خاور کو یہ سب کچھ ممکن لگ رہا تھا اور اس نے پلنگ سے اُٹھ کر باتھ روم کا دروازہ کھول کر یہ تسلی کی کہ کہیں اس میں تیزاب کا کوئی ڈرم تو نہیں جس میں وہ لاشوں کو گلاتی ہے... وارڈروب کے اندر بھی جھانکا.. وہاں نسوانی لباس اور زیر جامہ ملبوسات کے ڈھیر تھے.. اُن کے عقب میں کوئی بے جان بدن نہ تھا..

جھلاہٹ اور بے بسی نے اُسے ناتواں کر دیا اور وہ ایک غصیلے بلکہ مقدس صبر کے ساتھ قناعت کر کے جھولے پر بیٹھ گیا.. جھولنا دھیرے دھیرے جھولنے لگا..

چار بجنے کو تھے.. فرم کا جو بھی ڈرائیور اُسے ایئرپورٹ پر لینے آیا ہو گا اُس نے واپس جا کر رپورٹ کی ہو گی کہ وہ اس فلائٹ پر نہیں آیا تھا.. اور میٹنگ اس کے بغیر شروع ہو گئی ہو گی.. سورج ذرا نیچے آیا اور کھڑکی کے کنارے پر اٹک کر پورے فلیٹ میں جھانکتا ہوا اُسے چکاچوند کرنے لگا..

انڈس کوئین کے عرشے پر کوئی گہما گہمی نہ تھی..

رونق نہ تھی..

وہ سندھ کے پانیوں پر رات کی اتھاہ تاریکی میں ایسے سوگواری سے تیرتی تھی جیسے وینس کے کسی خصوصی گنڈولے میں کوئی تابوت سیاہ ساٹن میں لپٹا ہو اور وہ بے رونق ماتمی آہستگی سے پانیوں پر سرکتا قبرستان کو جاتا ہو..

عرشے کے درمیان میں ایک مردہ بدن پڑا تھا جس پر دھبے تھے کھرینڈ تھے..

سورج کھڑکی کے بالائی فریم سے اُترتا فلیٹ میں چندھیا دینے والی روشنی بھرتا.. ایک طویل مدت تک اس کا یہ نامعلوم آہستگی کا اُترنا جاری رہا اور بالآخر وہ نیچے ہو کر نچلے فریم کھڑکی کی چوکھٹ تک آ گیا... اور جب اس کی گولائی کا کچھ حصہ اوجھل ہوا اور اس کی لشک قدرے مدھم ہونے لگی اور ساتوں آئینوں میں بھی مختلف زاویوں سے مدھم ہونے لگی تو فلیٹ کا دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئی..

ایک زرد بجھتے ہوئے زرد رنگ کی ساڑھی میں لپٹی جو اس کے چہرے پر کھنڈتی پیلاہٹ سے میچ کرتی تھی وہ اندر آ گئی.. اپنی بیماری اور زردی میں شاندار لگتی ہوئی... نہ وہ ہنسی نہ اُسے دیکھ کر ایئرپورٹ کی طرح روشن ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی دلیل پیش کی اُسے یوں قید کر کے چلے جانے کی.. اور نہ کوئی معذرت کی.. اُس کا چہرہ کورا اور بے جان سا تھا..

وہ روایتی ترکیب کے مطابق خوش شکل نہ تھی.. لیکن اب نفاست سے بندھی ہوئی زرد رنگت کی ساڑھی میں اُس کا بدن ایک ناتواں مگر نوخیز بوٹے کی طرح نکلتا تھا... اور

یہ بُوٹا کھڑکی کی چوکھٹ پر اُترتے ہوئے سورج کی ڈھلتی کرنوں میں سرسوں کے ایک کھیت کی زردی میں ڈھلتا تھا... وہ اس پیراہن میں بے حد رائل لگ رہی تھی جیسے جلتے ہوئے ٹرائے کے ماتم میں کھڑی ایک شہزادی ہو..

وہ کچھ دیر بنا کچھ کہے کوری اور بے تاثر اُس کے سامنے کھڑی رہی اور پھر اپنا لامبا بازو اُٹھا کر ساڑھی کے پلو کو کاندھے سے گرایا اور اُس کی گرہیں کھولنے لگی "میں بہت تھک گئی ہوں.. آرام کرنا چاہتی ہوں"

زرد ساڑھی کو بڑے اہتمام سے لپیٹ کر جیسے اُس کے پاس صرف یہی لباس ہو اُس نے جھولے کی نشست پر رکھ دیا اور پلنگ پر بچھی رَلی کی چادر کا ایک کونہ اُٹھا کر اُس کے اندر سرک گئی.. اُس کے زیر جامہ ملبوسات بھی زرد رنگ کے تھے اور جسم کی زردی سے الگ نہ ہوتے تھے.. اور جب وہ اپنے آپ کو چادر کے اندر سرکا رہی تھی تو اُس کے بدن پر جو دھبے اور کھرینڈ تھے' وہ زردی سے الگ ہو کر نمایاں ہو رہے تھے اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی..

خاور نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ آگئی تو میں کن لفظوں میں اُسے بے عزت کروں گا چیخوں گا... اور پھر اپنا بیگ اُٹھا کر اس رابطے سے اور اس فلیٹ سے ہمیشہ کے لئے نکل جاؤں گا لیکن وہ گُنگ ہو گیا.. خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا... اُسے ناپسند کرنے کی کوشش کرتا رہا.. اگر تو وہ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی "آئی ایم سوری" یا کوئی اور معذرت کرتی اُس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی تو وہ یقیناً اُسے پرے دھکیل کر شاید اُس پر ہاتھ اُٹھا کر پھٹ پڑتا... لیکن اُس کے چہرے کی آزردگی اور تھکن نے وہ تمام لفظ گنوا دیے... جیسے آپ نیند میں چلنے والے ایک شخص سے ناراض نہیں ہو سکتے' اُسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے اگر ایسا کریں گے تو خود ہی مجرم محسوس کریں گے.. خاور نے صرف اُن کے درمیان آئی ہوئی خاموشی کو توڑنے کے لئے بغیر کسی شکایت یا رنجش کے کہا "تمہیں یہ تو معلوم تھا کہ مجھے آج چار بجے کسی شوق کی خاطر نہیں' اپنی روزی کے حصول کے لئے ایڈورٹائزنگ فرم کی میٹنگ میں پہنچنا تھا.. میں اُن کے خرچ پر یہاں آیا ہوں.. اُن کے لئے آیا ہوں"

"پلیز میرا ہینڈ بیگ مجھے دے دو"

مراکو لیدر کا فیشن کردہ ہینڈ بیگ جھولے کی نشست پر تہہ شدہ ساڑھی کے برابر

میں پڑا تھا..

خاور نے خاموشی سے تعمیل کر دی..

وہ کہنیوں کے بل اُٹھی.. اُس کے بازو بہت ناتواں تھے.. اُنگلیاں لامبی اور کمزور تھیں جن سے اُس نے ہینڈ بیگ کی زِپ کھولی اور اُس میں سے کرنسی نوٹس کا ایک نیا اور کورا پلندہ نکالا "تمہیں وہاں سے کتنی روزی ملے گی؟... اتنی تو اگلے پانچ برس میں بھی نہیں ملے گی... یہ تم رکھ لو... میرے لئے یہ بیکار ہیں.. لیکن پلیز میرے پاس رہ جاؤ.. آئی بیگ یُو.."

کچھ دیر لرزتی اُنگلیوں سے اُس نے نوٹوں کے پلندے کو تھامے رکھا.. اور پھر اُسے بے دلی سے ایک جانب پھینک کر رَلی کی چادر کے اندر ہو گئی اور اُس میں منہ چھپا کر رونے لگی..

وہ کھڑکی کی جانب پشت کئے کھڑا تھا اور اُس کے سامنے پستہ قد پلنگ پر بچھی رَلی کے اندر اُس کا بدن سسکیوں سے لرزتا تھا.. کبھی بالکل ساکت ہو جاتا تھا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کپکپانے لگتا تھا.. رونے کی آواز نہیں آتی تھی..

سورج کھڑکی کی چوکھٹ پر ابھی تک اٹکا ہوا تھا اور اُس کی چمک پہلے سے ماند ہوتے ساتوں آئینوں میں مزید بجھتی تھی.. خاور اُس کے سرہانے بیٹھ گیا اور رَلی کی چادر کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگا.. "پلیز تم روؤ نہیں.."

بہت دیر تک اُسے ایک بچے کی طرح... جیسے اُسے سلانے کی کوشش میں ہو تھپکتا رہا.. اُس کی ہر سسکی رَلی کی چادر میں سے سرایت کرتی اُس کی اُنگلیوں میں اُترتی اور پھر اُس کے پورے بدن میں پھیل جاتی..

اُس کی سسکیاں کم ہونے لگیں.. اور پھر رَلی کے اندر سے اُس کی ایک عجیب گھُٹی ہوئی لاچار آواز آئی "میرے بیگ کو کھول کر دیکھو کہ اُس کے اندر کیا ہے.."

"تم خود کیوں نہیں اُٹھتیں.. میں کہیں نہیں جا رہا.."

"نہیں.. میں تمہارا سامنا نہیں کر سکتی.." چادر میں سے اُس کی بے چارگی میں ڈوبتی آواز آئی "تم میرے بیگ کو کھول کر دیکھو"

خاور نے سائڈ ٹیبل پر دھرے بیگ کو اُٹھا کر اُس کی زِپ کھولی... کچھ رقم تھی.. کریڈٹ کارڈز... سٹورز کے بل.. میک اپ کا کچھ سامان.. کچھ سادہ کاغذ اور ایک بال پوائنٹ.. اور کچھ رپورٹیں تھیں نسخے تھے... پاگل خانے کے بیگ کی تلاشی لینے کے دوران

جس قسم کے کاغذات برآمد ہوئے تھے ان کی نوعیت بھی اُن سے ملتی جلتی تھی.. ان پر لنڈن اور کراچی کے معروف ہسپتالوں کے نام تھے..

"کیا تم دیکھ رہے ہو؟" اُس نے چادر کے اندر سے پوچھا..

"ہاں..."

"یہ میری فائنل رپورٹس ہیں خاور... پچھلے ہفتے ایک مرتبہ پھر.. شاید ہزارویں مرتبہ پھر میرے تفصیلی ٹیسٹ ہوئے.. میں تین روز کے لئے انگلینڈ گئی تھی ڈاکٹر اینڈریو کے بلانے پر... اُنہوں نے میرے بدن کے ہر حصے سے کچھ نہ کچھ کاٹا.. میرا آدھا خون نکال لیا.. اور پھر یہ رپورٹس دیں.. کیا تم اُنہیں دیکھ رہے ہو؟"

رپورٹس بہت طویل اور تفصیلی تھیں اور جو کچھ اُن پر درج تھا وہ زبان اُس کی فہم سے بالاتر تھی.. طبی محاورے 'نامانوس لفظ اور ہندسے تھے..

"میں انہیں نہیں سمجھ سکتا.."

عابدہ سومرو نے رَلی کو نیچے کیا اور اُس کا آنسوؤں سے تر زرد چہرہ خاور کے سامنے آگیا جس کے عقب میں پلنگ کے سرہانے پر تراشیدہ مور کے پروں میں آویزاں ساتوں آئینوں میں ڈھلتے سورج کی کرنیں بجھ رہی تھیں "مجھے صرف دس دن دیئے گئے ہیں.. صرف دس دن.. زیادہ سے زیادہ"

وہ سکتے میں آگیا.. سمجھ تو گیا لیکن اس کے باوجود اُس نے کہا "میں سمجھ نہیں سکا"

"میں مر جاؤں گی دس دن کے اندر اندر... ایز سمپل ایز دیٹ... اور تم اپنی چار بجے کی میٹنگ کے بارے میں فکر مند ہو.."

"نہیں.. یہ.. یہ کیسے ہو سکتا ہے.."

"اگر کوئی شخص دس دن کے اندر اندر نہ مر رہا ہو تو وہ کہے گا کہ میں مر رہا ہوں.. موت میں مزاح کی گنجائش تو نہیں ہوتی خاور ڈارلنگ..." اُس نے آنسو پونچھے اور بے اختیار ہنسنے لگی... ہنستی گئی.. اور وہ اُسے دیکھتا رہا.. اُس کی ہنسی میں ہسٹریائی عنصر قطعی شامل نہ تھا' وہ بے بسی اور اختتام کے آگے ہتھیار ڈال دینے والے ایک لاچار شخص کی ہنسی تھی..

"میں تمہارے پاس ٹھہروں گا عابدہ.. جب تک کہ تم کہو.. لیکن مجھے یقین ہے کہ

ایسا نہیں ہو گا.. کیونکہ دنیا میں کوئی شے بھی حتمی اور یقینی نہیں ہوتی.."

"میرے پاس آ جاؤ.." اُس نے رَلی کا کونہ اُٹھایا اور سمٹ کر پرے ہو گئی "آئی ایم سوری کہ میں تمہیں لاک کر کے چلی گئی تھی.. میں تم سے ٹھہرنے کو نہیں کہہ سکتی تھی کہ تم نہیں ٹھہرتے اور اپنی میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لئے چلے جاتے.. لیکن میں نے گھر واپس جا کر پھر سے باہر نکلنے کا کوئی بہانہ بنانا تھا.. یہ نہیں کہ کوئی بھی پرواہ کرتا ہے کہ میں کہاں جاتی ہوں اور کیوں جاتی ہوں لیکن محض ریکارڈ کی خاطر مجھے گھر واپس جانا تھا.. خدا بخش اگلے الیکشن کے لئے جوڑ توڑ کر رہا ہے... بابا سائیں اپنی پارٹی بدلنے کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں اور وہ میرے ہونے یا نہ ہونے سے آگاہ نہیں ہوتے.. صرف میری بیٹی ہے.. اور وہ بھی کیوٹ تھنگ یہ نہیں جانتی کہ اُس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے... وہ اپنے کارٹون دیکھتی ہے 'اپنی گیمز کھیلتی ہے... صرف تم ہو خاور جس سے میں بات کر سکتی ہوں اور کوئی نہیں.."

"تم نے خدا بخش کو بتایا ہے.. ان فائنل رپورٹس کے بارے میں.."

"ہاں بتایا ہے.. لیکن وہ ایک پیدائشی سیاستدان کی مانند بہت میٹھا اور بہت تسلی دینے والا شخص ہے.. میری ڈھارس بندھاتا ہے کہ نہیں عابدہ یہ رپورٹس غلط ہیں.. ان ڈاکٹروں کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ تو اپنی فیسوں کے لالچ میں مریضوں کو خوفزدہ کرتے ہیں.. ڈاکٹر اینڈریو چونکہ تم پر مرتا ہے اس لئے وہ تمہیں اپنے قریب رکھنا چاہتا ہے.. تم بالکل فکر نہ کرو تمہیں کچھ نہیں ہو گا.. اور خاور.. اُس لمحے میں اُس کی آنکھوں میں دیکھ سکتی ہوں کہ اگر اُس کے کسی پسندیدہ اور لاڈلے کتے کے بارے میں ویٹنری ڈاکٹر یہ رپورٹ دے کہ وہ اگلے دس دن میں مر جائے گا تو وہ... اتنا رنجیدہ بھی نہیں ہوتا.. یہ میں دیکھ سکتی ہوں... اور اُنہی آنکھوں میں میں اُس لڑکی کو بھی دیکھتی ہوں جو میرے بعد فوراً میری جگہ کو پُر کر دے گی..." عابدہ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپتی رَلی کی چادر سے الگ کر دیا اور وہ انڈس کوئین کے ویران عرشے پر پڑی برہنہ ویت نامی بچی تھی "میری تمنا تھی کہ میری سویٹی بیٹی کے بعد تم سے مجھے ایک بیٹا ملے اور میں اُس کا نام یاور رکھوں.. لیکن دس روز کے اندر اندر تو یہ ممکن نہیں ہو گا.." وہ پھر سے ہنسنے لگی.. اور اس ہنسی میں کوئی بے چارگی یا مرگ کا خوف نہ تھا بلکہ ایک بیباک اور آزاد اظہار کی ہنسی تھی... "میں تمہیں ایک نظم سناؤں.." وہ ہنستے ہنستے تھم گئی..

"نظم...؟"

"ہاں... یا جو کچھ بھی میں کہنا چاہتی ہوں.. تم سے.. اپنے آپ سے.. سناؤں؟"

"ہاں..."

اُس نے ہینڈ بیگ کو پلنگ پر اُلٹ کر.. میک اپ کے سامان.. کریڈٹ کارڈز اور رپورٹس میں سے ایک کاغذ تلاش کیا اور آنکھیں پونچھ کر اُسے پڑھنے لگی... جیسے درخواست پیش کر رہی ہو.. ایک رپورٹ دے رہی ہو..

میں نے سنا ہے..
برگزیدہ ہستیوں سے میں نے سنا ہے کہ..
خدا کے نیک بندوں کے بدن کو مٹی نہیں کھاتی..
مٹی کو مناہی ہے کہ وہ اُن کو مٹی کر دے..
پر میں تو نیک بندوں میں شامل نہیں ہوں..
میں تو گناہوں اور خواہشوں کے گرداب میں گھومتی ہوں..
تو مٹی میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی..
مجھے کھا جائے گی..
ملیامیٹ کر دے گی..
اپنے ساتھ مٹی کر لے گی..
تو اُسے کیا ملے گا؟.. کچھ بھی نہیں.. نا آسودگی اور پیاس کے سوا کچھ بھی نہیں!
مٹی کے بوجھ تلے..
کیڑوں کو اپنے مردہ بدن پر رینگتے ہوئے..
میں صرف یہ کہوں گی.. ٹھہرو...
قربت مرگ میں مجھے محبت ملی تھی..
میری تمامتر آلائشوں اور ناپاکیوں کے باوجود، مجھے ملی تھی..
اور اُس نے مجھے پوتر کر دیا ہے..
تم.. اے مٹی.. مجھے ریزہ ریزہ کر کے اپنے آپ میں شامل کر لو تو بھی..
میں فنا نہیں ہو سکتی..

کیونکہ اس محبت نے مجھے برگزیدہ کر دیا ہے..
میں ڈوبتے سورج کے زرد تھال کو دیکھتی اور اُسے بیان کرتی تھی..
اور وہ میرے چہرے پر جھکا تھا مجھے سنتا تھا..
اور میں کھلی آنکھوں سے اُس کے بدن کے پار.. پرے..
کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکے سورج کو بیان کرتی تھی..
یہ میرے آخری لمحے تھے..
آخری سانس تھے..
تو اے مٹی... تو مجھے ملیامیٹ نہیں کر سکتی..
مجھے اپنے آپ میں مٹی نہیں کر سکتی..
تو مجھے کھا نہیں سکتی.. فنا نہیں کر سکتی..
اس لئے کہ..
میں بھی نیک بندوں میں سے ہوں..
برگزیدہ ہوں..

پلنگ کے ساتوں دھندلاتے ہوئے آئینوں میں کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکے سورج کی ٹھنڈی ہوتی گول پرات تھے..

وہ اُس کے چہرے پر جھکا تھا اور اُس کی مرگ پیلاہٹ میں پیلا ہوتا تھا اور اپنی پشت پر پلنگ کی پائنتی کے پیچھے کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکا جو زرد غروب کا سورج تھا اُسے نہ دیکھ سکتا تھا لیکن وہ اُسے بیان کر رہی تھی۔ "دیکھو خاور.. میں تمہیں دکھاتی ہوں اور تم مجھ پر جھکے مجھے دیکھتے رہو اور میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ اس لمحے زرد تھال کے سامنے سے سمندری بگلوں کی ایک ڈار گزر رہی ہے.. اور ہر بگلے کا ایک ایک پَر جو اُڑان میں ہے الگ الگ دکھائی دے رہا ہے.. وہ اگرچہ سفید ہیں لیکن اس لمحے زرد ہیں جیسے سرسوں کے کھیت میں سے نہا کر نکلے ہوں... سورج اب ایک ٹھنڈے ہوتے پگھلاؤ میں نیچے ہو رہا ہے.. میری آنکھوں میں وہ سورج ہے.. زرد سمندری پرندوں کی ڈاریں ہیں.. اور دیکھو وہ ڈاریں گزر گئی ہیں اور سنہری تھال پھر سے ویران ہو گیا ہے... لیکن ابھی ابھی ایک اور پیچھے رہ جانے والا پرندہ اُس کی زردی میں داخل ہوا ہے اور نکل گیا ہے.. تھال پھر سے ویران ہو گیا ہے لیکن میں ویران نہیں ہوئی بھری ہوئی ہوں.."

چوبی مور کے پروں میں آویزاں ساتوں آئینوں میں وہ اپنے آپ کو دیکھتا تھا..

اُس کے کھلے منہ کے اوپر جو کھلی آنکھیں تھیں اُن میں اُس زرد تھال کو دیکھتا تھا جس کے اندر ابھی ابھی ایک پرندہ اپنی سفیدی کھو کر زرد ہوا تھا اور پھر نکل گیا تھا..

سات آئینے تھے جن میں اُس کا زوال پذیر بدن دکھائی دیتا تھا..

اُن سب میں سے ابھی ابھی ایک پرندہ اپنی سفیدی کھو کر زرد ہوا تھا اور پھر نکل گیا تھا..

قربت مرگ میں محبت گھرے بوجھل سانس لیتی تھی..

ان سانسوں سے سائیڈ ٹیبل پر بکھری فائنل رپورٹس نم ہوتی تھیں..

پلنگ کے سرہانے چوبی مور کی چونچ کھل گئی..ی آوں..ی آوں..

ے وصل ہوئیاں میں نال سجن' شرم حیا نوں گوا کے
وچ چمن میں پلنگ وچھایا یار سُتی گل لا کے

ایس عشقے دی جھنگی وچ مور بولیندا...

اُس پلنگ کے سرہانے بھی ایک مور بولا تھا...

ساتوں آئینوں نے الگ الگ کلام کیا تھا..

ہر آئینے میں جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی..اور ہر تصویر جدا تھی اور اُس میں ہولے ہولے جان پڑتی تھی.. غروب کا سورج بدنی زاویوں سے کچھ زاویے نمایاں کرتا تھا..

سات آئینوں میں سات متحرک بچ تھے..

کشتی ہولے ہولے ڈولتی ڈھلتی دوپہر کے سورج کی آخری تمازت میں کنارے کی گیلی ریت کو کندھے مارتی تھی..اگر یہاں بھی ایک کھڑکی ہوتی تو وہ اس سے اس کی چوکھٹ پر اٹکا ہوتا...وہ ر کے ہوئے تھے..

جہاں کشتی اپنے کھونٹے سے بندھی پانی میں بے چین ہوتی کناروں سے سر ٹکراتی تھی وہاں سے کچھ دوری پر سرور گھٹنوں تک آئے پانیوں میں لنگوٹ باندھے جھکا... جھکا پانی کے اندر بہت دھیرے دھیرے دونوں ہاتھ حرکت میں لاتا تھا.. جیسے نابینا جانتا ہو کہ راستے میں ٹھوکر کھانے کے بہت سے اسباب بکھرے ہوئے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلائے ان میں..اپنی انگلیوں میں پوری توجہ بھر کر آہستہ آہستہ ہوا کو ٹٹولتا ہوا چلتا ہے...یکدم سرور نے دونوں ہاتھ پانی میں سے یوں اچھال باہر کئے جیسے کسی شے نے اسے ڈس لیا ہو.. سندھ کے گدلے چھینٹے اس کے بدن پر آگرے اور اس کے سیاہی کو مزید گہرا کرتے ٹانگوں پر لکیریں بناتے پھر سے دریا میں جذب ہو گئے "ادھر سے دھی یا کھگا غیب ہے ماماں..." اس نے اپنا آپ پانی میں

سے کھینچ کر باہر کیا اور جعفر کے پاس آ گیا جو اپنے نکونے جال کو ریت پر ٹکائے اس کی ڈوریوں میں گانٹھیں دے رہا تھا" پچھلے ایک پہر سے تو ٹھنڈ کے مارے پانی میں کھڑا ٹھٹھرتا ہوں کہ کوئی کھگا ہاتھ سے لگ کر گذرے تو سہی تو میں اسے صاحب کے لئے باہر اچھال دوں پر ادھر تو قحط پڑ گیا ہے ماماں.. رب کا نام لے کر پانی میں اترا تھا کہ مالکا کوئی دو چار دانے کھگوں کے رات کی ہانڈی کے لئے ہاتھ لگا دے.. تو بھی کچھ ہاتھ میں نہیں آیا۔"

ایک اور گرہ لگا کر ماماں جعفر نے اسے تھوک لگا کر پکا اور پیڈا کیا اور بولا "سرور.. پچھلے کتنے روز سے رب کا نام لے کر پانی میں اتر تا رہا ہے ناں تو کچھ ملا؟...وہ سن نہیں رہا.. تو آج اس کا نام نہ لیتا تو شائد کچھ مل جاتا.."

موٹا شکاری عطاء اللہ کسی خاص منصوبے کے تحت ان کے برابر چلتا آ رہا تھا.. وہ کشتی میں چلتے تھے اور وہ کناروں پر جو دیہات 'کھیت' ٹیلے اور جنگل ذخیرے سرکنڈوں اور کاہی کے تھے وہ ان میں سفر کرتا تھا.. وہ کشتی میں کم ہی سوار ہوتا.. پر انہیں نظر میں رکھتے ہوئے کناروں پر چلتا جاتا.. ایک رات ان کے ہمراہ بسر کرنے کے بعد وہ پھر ان کے کیمپ میں سونے کے لئے نہیں آیا تھا.. ہر دوسرے تیسرے روز کہیں نہ کہیں اپنی توند پر کھسکتا تہبند ایک ہاتھ سے سنبھالتا اور دوسرے میں بندوق تھامے وہ نظر آ جاتا.. اس ڈھلتی دوپہر میں جب وہ ستانے کے لئے رکے تھے اور سرور کھگے پکڑنے کے لئے پانی میں اترا تھا اور ماماں اپنا نکونا جال مرمت کرتا تھا عطاء اللہ پھر نمودار ہو گیا تھا۔

"سائیں سرخابوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہوں.. ان ٹیلوں کی اوٹ میں اترے ہیں.. سائیں شغل کرنا ہے تو میرے ساتھ آؤ.. ہاں سائیں آ جاؤ ادھر بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو.. پر ساتھ آنا ہے تو صبر کے ساتھ ایسے آؤ کہ پاؤں کے نیچے کی ریت بھی نہ کھسکے.. سرخاب ذرا سی آہٹ پر... ریت کے ایک ذرّے کے کھسکنے سے پر کھول دیتا ہے اور اڑ جاتا ہے.. شغل کرو سائیں.."

"تمہاری مہربانی..." ڈوری سے بندھی جل مرغی ابھی تک اس کے سامنے پھڑ پھڑاتی پانی پر تیرتی اپنے تئیں غائب ہونے کے لئے ڈبکیاں لگاتی... آپ آپ کنارے کی جانب کھنچتی چلی جاتی اور عطاء اللہ شغل کرتا... خاور کو اب بھی اس کے ہاتھوں میں وہی ڈوری دکھائی دیتی تھی۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا.. لیکن اپنی ناپسندیدگی کو نفرت سے عیاں بھی

نہیں کرتا تھا.. "نہیں عطاء اللہ آپ شغل کرو۔"

وُہ اپنا تہبند سنبھالتا.. جھکا جھکا ریت کے ان ابھاروں کی جانب بڑھنے لگا جن کے عقب میں بقول اس کے سرخابوں کا ایک جھنڈ اترا تھا..

پہاڑوں اور پانیوں کا سفر دنوں کا حساب کتاب بھلا دیتا ہے.. راتیں کتنی گذر چکی تھیں یہ بھی کچھ یاد نہ تھا.. شائد تین یا تیں کچھ واضح نہ تھا.. سوائے اس کے کہ... کشتی چلتی جاتی تھی کنارے پیچھے رہتے جاتے تھے.. بہاؤ بہتے ہوئے مسلسل سنائی دیتے تھے.. کبھی دھوپ ہوتی تھی اور کبھی چھاؤں اور رات ہوتی تو الاؤ جلتا تھا اس کے سوا کچھ اور واضح نہ تھا..

ریت پر بیٹھا.. اس کی تپش کو اپنے بدن کے اندر سرایت کرتے محسوس کرتا.. خاور.. فہیم کی تیار کردہ دھواں لگی چائے کے گھونٹ بھرتا تھا.. اس کے سامنے ریت کنواری اور سپاٹ تھی تھوڑی دیر پہلے تک.. اور اب اس پر عطاء اللہ کے بھاری قدموں کے نشان تھے جو ٹیلوں پر بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے..

کشتی کے اندر اس کے سلیپنگ بیگ پر بے پروائی سے لیٹی ٹانگیں پھیلائے پکھی اپنا جھگا اٹھائے بچے کے منہ کے قریب اپنی چھاتی کرتی تھی اور بظاہر لاپروا تھی لیکن اس کی سیاہ آنکھوں میں ناآسودگی کی جو شکایت تھی وہ خاور تک.. اس کی چائے کی پیالی تک پہنچ کر اس کے لب جلاتی تھی..

"کھگا ملے گا سرور..." ماماں جعفر جال کی مرمت سے فارغ ہو کر اٹھا اور اپنے کولہوں سے ریت جھاڑتے ہوئے کہنے لگا "بس رب کا نام نہ لینا...وہ آج نہیں سن رہا۔"

جعفر اپنی دھوتی ٹانگوں کے درمیان اڑس کر پانی میں اتر گیا اور جھک کر دونوں ہاتھوں سے سرور کی مانند پانی کو ٹٹولنے لگا۔ وہ نیچے نہیں دیکھتا تھا بلکہ نظر سامنے رکھتا تھا اور ہاتھ چلائے جاتا تھا۔ وہ دیکھتا دریا پار کے سرکنڈوں کو تھا مگر اس کے ہاتھ پانی کے اندر ہی اندر چلتے جاتے تھے.. کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر مچھلی کے شوق کی بجائے فکرمندی کی سیاہی پھیلنے لگی.. وہ جھکا ہوا تھا تو سیدھا ہو گیا اور پھر اپنی ٹانگوں کو غور سے دیکھا.. ان تک آئے پانی کی سطح کو دیکھتا رہا جو گھٹنوں سے ذرا نیچے تھے اور صرف سرور کو مخاطب کیا۔ "نہ ہونے والی بات لگتی ہے پر ہے۔"

"کیا ماماں..." سرور خوش تھا کہ ماماں کے ہاتھ بھی کچھ نہیں لگ رہا۔

"سندھ کے پانی کم ہو رہے ہیں سرور..."

"اس رُت میں تو پانی کم ہوتا ہے ناں ماماں... ساؤن تھوڑا ہے کہ شوکتا ہے اور اونچا ہوتا ہے۔"

"تم مجھے سبق پڑھاتے ہو پانیوں کا..." ماماں جیسے طیش میں آگیا ہو۔ "میں نہیں جانتا کہ اس رُت میں پانی تھوڑا ہو جاتا ہے اور کتنا تھوڑا ہوتا ہے اور کس کس جنگل بیلے میں کتنا کم ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتا..."

"معاف کرو ماماں... میں نے تو یونہی بات کر دی تھی..." سرور نے ہاتھ جوڑ کر شرمندگی سے کہا۔

"ادھر جہاں میں کھڑا ہوں اس رُت میں... اس جگہ پر میں ہمیشہ کھڑا ہوتا ہوں مچھلی کے شوق میں... جب میں نیانا تھا تو اپنے بڑے کے ساتھ ادھر آتا تھا تو ادھر پانی اتنا اونچا رہتا تھا کہ میرے بڑے کے گھٹنوں تک آتا تھا... پھر میں بڑا ہوا تو میرے گھٹنوں تک آتا تھا ہمیشہ... پچھلے برس اس رُت میں انہی دنوں میں... یہ میرے گھٹنوں کو چھوتا تھا پر اب کی بار عجیب بات ہے کہ بہت نیچے ہے..."

"ادھر پہاڑوں میں کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو گی... مینہ پانی کم برسا ہو گا۔"

"نہیں سرور... مجھے لگتا ہے کہ سندھ سوکھ رہا ہے..."

"ماماں بوٹی نے کام دکھایا ہے۔" سرور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا "سندھ سائیں کیسے سُوکھ سکتا ہے"

"تم مجھ سے دین ایمان کی سونہہ لے لے.. بناشک بُوٹی کا کجاد کھ لے.. جو میں نے سویرے ایک گھونٹ بھی ساوی کا پیا ہو۔"

"نہیں پیا تو اب ڈیک لگا لے... سندھ میں پانیوں کی لہر بہر ہو جائے گی.." سرور دانت لشکانے لگا.. ہنسنے لگا.. پر جعفر کے سیاہ چہرے پر تشویش کی دھاریں کم نہ ہوتی تھیں.. دھوپ میں بہت حدت تھی اور وہ ریت کو ایسے جھلساتی تھی جیسے یہ چیتر کا مہینہ نہ ہو۔

ایک ٹیلے کے عقب میں سے موٹا عطاء اللہ ابھرتا گیا.. اس کا تہبند اس حد تک اس کی توند سے ڈھلکا ہوا تھا کہ اس کے کچھ بال جو دکھائی نہیں دینے چاہیے تھے وہ بھی دکھائی دے رہے تھے اور وہ ایک مست چال سے ریت میں سے پاؤں نکالتا ایک ہاتھ سے بندوق

سنبھالتا چلا آ رہا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند تھا اور اس کی گرفت میں دو پنجے تھے جن کے آخر میں قوسِ قزح کے سب رنگوں سے مزین ایک پرندہ جھولتا تھا...

"سائیں ریت میں دھنس کر دم رو کے بیٹھا رہا پوری دوپہر... تو یہ ملا ہے۔" اس نے بازو مزید بلند کر کے پرندے کی نمائش کی "سرخاب ہے۔"

وہ مردہ تھا لیکن زندہ لگتا تھا... اس کے تیر توں بھرے رنگ اسے مرنے نہیں دیتے تھے...

سرور اور ماماں فوراً اس کے گرد ہو گئے۔ اس کے موٹے بدوضع کندھوں کو تھپک تھپک کر داد دینے لگے۔ جیسے وہ ایک سُورما ہو جو میدان جنگ میں اپنے دشمن کو مار کر اٹھا لایا ہو... انہوں نے اس کی مٹھی میں بھنچے پنجوں سے لٹکتے سرخاب کی جانب ایک نظر بھی نہ کی...

سُورما اپنی بہادری کے قصے بیان کرنے لگا... "میں سویرے ان کا پیچھا کر رہا تھا... کبھی اس ٹاپو پر اترتے تھے اور کبھی دریا پار چلے جاتے تھے.. پر میں نے پیچھا نہیں چھوڑا... پورا جُھنڈ تھا... ریت میں ریت ہو کر بُت بنا بیٹھا رہا۔ جب یہ چراگاہ میں چرتے تھے... اور جب میں نے شست لگائی ہے سرور... لبلبی دبائی ہے تو اس کے دبانے سے ان کو خبر ہو گئی اور یہ بجلی کی طرح اڑان میں آ گئے پر یہ والا کوئی بھولا پنچھی تھا پَر کھول رہا تھا کہ چھروں کی زد میں آ گیا۔"

"واہ سائیں واہ" وہ داد دیتے تھے..

"سرور ابھی اس کی کھال کھینچتے ہیں اور ہانڈی میں ڈال کر بھونتے ہیں اور صاحب کو کھلاتے ہیں۔" وہ اپنی ٹرافی بلند کیے اس کے پاس آ گیا تا کہ اس سے بھی داد وصول کرے۔ "آپ کے لیے تحفہ ہے سائیں۔"

"نہیں..."

سرور کی رال ٹپکنے لگی۔ "کیوں نہیں سائیں سُرخاب کوئی روز روز ملتا ہے... آپ بے شک گوشت کھانا... ہم ہانڈی پونچھ لیں گے... یہ بڑا کمینہ پکھیرو ہے سائیں... نصیب والے کے ہاتھ لگتا ہے..."

"ذرا اسے ہاتھ لگا کر دیکھو تو سہی سائیں.." عطاءاللہ سُرخاب اس کی آنکھوں کی سطح پر لے آیا۔ "ابھی گوشت گرم ہے اور دل دھڑکتا ہے۔"

"تمہاری مہربانی ہے بھائی عطاء اللہ..." خاور چائے کی پیالی ریت پر رکھ کر مشکل سے اٹھا کہ اس کے گھٹنے اذیت دیتے تھے۔ "آپ فہیم کے دوست ہو پر آپ ہمارا اپچھانہ کرو.. تمہارا شکار مجھے گوارا نہیں۔ اسے تم ہمارے الاؤ پر نہیں بھون سکتے.. تم سمجھتے ہو ناں.. اسے لے جاؤ.. اور ہمارا اپچھانہ کرو.. تمہاری مہربانی ہے۔"

عطاء اللہ کے لشکتے دانت سیاہ ہونٹوں میں غروب ہوگئے اور اس کے چہرے پر یکدم ایک ایسی ناگواری آئی جو صرف کٹھور لوگوں کے چہروں پر ہی آسکتی ہے۔ ایک نفرت سے بھری تھوکتی ہوئی ناگواری "سائیں ہم تو باہر کے مہمان کی عزت کرنے والے لوگ ہیں.. آپ عزت نہیں کروانا چاہتے تو خیر ہے.. ہم تو سائیں برمانی کے صدقے آپ کا خیال رکھتے ہیں نہیں تو ہم بڑی حیثیت والوں کو بھی سلام تک نہیں کرتے"..اس کا ہاتھ نیچے آگیا اور سرخاب کی مردہ چونچ اس کے ڈھلکے ہوئے تہبند سے ٹکرانے لگی.. اس کے پروں کے رنگ عطاء اللہ کے بدرنگ تہبند پر بھی اثر کرنے لگے۔ "سندھ کے ٹاپو اور پرندوں کی چراگاہیں تمہاری ملکیت میں تو نہیں ہیں سائیں کہ تمہاری اجازت کے بغیر ہم ادھر نہ آئیں.. ہم ادھر کے باسی ہیں جب جی چاہے گا آنکلیں گے اور جل مرغی اور سُرخاب ماریں گے.. ویسے یہ جو کشتی کرائے پر لے کر ادھر آنے والے لوگ ہوتے ہیں ہم ان سے واقف ہیں.. وارو پیتے ہیں اور... پکھی کو..." اس نے زہر اگلا اور بندوق کو اور مردہ سُرخاب کو ریت پر رکھ کر اپنے ڈھلکتے اور تقریباً گر جانے والے تہبند کو کھول کر پھر سے اپنی توند پر جمایا اور پھر بندوق اٹھا کر... سرخاب کو جھلاتا ہوا ٹیلوں کی جانب چلا گیا...

سرور اور ماماں سمجھ نہ سکے..

یہ سائیں کب ان کی سمجھ میں آتا تھا..

کتنے روز ہوگئے تھے سندھ کے ٹاپوؤں اور جزیروں میں رات کرتا... پکھی پر نظر نہ کرتا... یہ سائیں کب سمجھ میں آتا تھا۔

سرور چپکے سے کشتی کے اندر چلا گیا اور جعفر پھر سے جال میں گرہیں باندھنے میں مگن ہوگیا... خاموش رہ کر انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔

دوپہر تو ڈھلتی تھی مگر سورج کی تمازت ریت کے ہر ذرّے میں ابھی تک ٹھہری ہوئی ہے البتہ پانیوں پر سے آتی ہوائیں ٹھنڈک کے سائے محسوس ہونے لگے تھے۔

اوپر آسمان دُھلا ہوا اور بالکل خالی تھا...

اس میں اڑان کرنے والا ایک سُرخاب کم ہو چکا تھا جو اب ریت کے ٹیلوں میں روپوش ہو چکے عطاء اللہ کے ہاتھ میں لٹکتا تھا... اگرچہ مردہ تھا لیکن زندہ لگتا تھا کہ اس کے رنگ اسے مرنے نہیں دیتے تھے...

اس خالی آسمان تلے پھیلے ہوئے سندھ کے پانیوں میں کشتی ہلکورے لیتی کنارے کی ریت سے سر ٹکراتی تھی۔ آسمان صرف اس ایک سرخاب کی موت سے خالی ہو گیا تھا۔ وہ اسے ایک گہرے رنج سے تکتا جا رہا تھا..

وہاں کوئی پرندہ نہ تھا.. اس کی نیلاہٹ کو اپنے پروں کی قینچی سے کاٹتا کوئی پکھیرو اڑتا نہ تھا۔

پر ایک پرندہ تھا..

اس کے بازو لکڑی کے تھے۔ وہ بے آواز نیلگوں آسمان پر تیرتا ایک ہموار رفتار سے خاور کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر لکڑی کے بھدے سے پنکھے تھے جو بہت آہستگی سے گھومتے جاتے تھے..

اوپر لکڑی کا ایک جہاز محوِ پرواز تھا۔

اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ پُواجی اس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اپنی سفید پگڑی گھٹنوں کے گرد باندھے سر جھکائے بیٹھے ہیں اور ان کی سفید لٹیں اسی آہستگی کے ساتھ جس آہستگی کے ساتھ جہاز جا رہا تھا ہوا میں اٹھتی تھیں... ایک اور طوفانِ نوح کی آمد سے پیشتر وہ اپنے اللہ لوک کے ہمراہ پرواز کرتے تھے۔

لکڑی کا جہاز سندھ کے اس ریتلے ٹاپو کے عین اوپر سے گزرتا جاتا تھا جہاں لکڑی کی کشتی کسی بھی طوفان سے بے خبر پانیوں میں ہلکورے لیتی کنارے کی ریت سے سر ٹکراتی تھی.. خاور کے سر پر سے گزرتا تھا اور پُواجی اس میں سوار تھے۔

سانسیوں کی ٹھٹھی پر ٹھہرے تاریک آسمان میں یکدم کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

رسول پور کے کھتھور سناٹے پر ان کی گونج مدھم ہو کر جب کچے گھروندوں کی پھُس اور گارے سے تعمیر کردہ اُن موٹی دیواروں تک آئی جو گلیوں میں تھیں تو وہ اُن میں جذب ہو کر معدوم ہوتی گئیں۔ لیکن اس کے کانوں میں وہ سب کتے الگ الگ بھونکتے رہے... اس لیے کہ وہ رسول پور سے باہر بُوٹی سے ڈھکے جوہڑ کے کنارے کیکر کے جس سوکھے ہوئے ٹُنڈ پر براجمان تھا وہ سانسیوں کی ٹھٹھی کے قریب تھا..وہ الگ الگ بھونک رہے تھے اور چپ نہیں ہو رہے تھے..ان میں وہ بُولی بھی شامل تھا جس کی وجہ سے اسے شلوار ترک کر کے دھوتی باندھنی پڑی تھی..وہ ایسا گنوار کتا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی شلوار نہیں دیکھی تھی اس لیے جب وہ رسول پور کی پہلی سویر میں.. کسی بھی گاؤں کی اپنی پہلی سویر میں ماسٹر رحمت علی کے کچے گھر میں سے نکل کر اپنا بستہ سنبھالتا بُوٹی سے بھرے جوہڑ کے کنارے اپنی کلف لگی شلوار کیچڑ سے بچاتا سانسیوں کی ٹھٹھی کے قریب پہنچا تھا تو کلف کی کھڑ کھڑ نے کتوں کے کان کھڑے کر دیئے اور وہ ان کھڑے کانوں کے ساتھ اس کے پیچھے پڑ گئے تھے..ان کا سرغنہ یہی چتکبرا بُولی تھا جو سب سے آگے آگے غُراتا غضب ناک ہوتا اس کی شلوار کے پائنچوں کی جانب انتہائی رغبت سے بڑھ رہا تھا..اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی اور جب وہ پریشان حال کیچڑ میں لت پت ڈیرے پر پہنچا تھا تو چاچا ماسٹر نے کہا تھا"خاور پتر کل سے یہ پدگھنی پہن کر نہ آنا یہ شہریوں کا پہناوا ہے..اپنی چاچی سے کہنا وہ تمہیں میری کوئی پرانی دھوتی دے دے گی..اسے پہن لینا..یہاں دیہات

میں کوئی شلوار پہن لے تو بڑی نموشی ہوتی ہے..کتے بھی اسے پسند نہیں کرتے.."

اور تب سے وہ ایک واہیات کپڑے کو کمر کے گرد لپیٹ کر اسے ازار بند سے باندھ کر قائم رکھتا تھا ورنہ اس کے بغیر وہ فوراً گر جاتی تھی اور پھر زیادہ نموشی.. یعنی بے عزتی ہوتی تھی..

یہ وہی چتکبرا بُولی تھا جو سب سے بلند آواز میں بھونک رہا تھا۔ کتے کا بچہ!

لیکن یہاں کیکر کے اس ٹُنڈ کے اوپر بیٹھا وہ اس کی زد سے باہر تھا..

چتکبرے بُولی کے بھونکنے میں کوئی جان لیوا غراہٹ نہیں تھی..اس کے ہمنوا بھی صرف اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ بھونکنے کا فرض ادا کر رہے تھے..اور یہ فرض وہ ہر جمعے کی رات کو باقاعدگی سے ادا کرتے تھے..

آہستہ آہستہ ان کے بھونکنے میں وقفے آنے لگے..

اس کا مطلب تھا کہ پُواجی سانسیوں کی ٹھٹھی سے باہر آ گئے تھے۔

پر ابھی وہ دکھائی نہیں دے رہے تھے..

تاریکی اتنی گھنی تھی کہ وہ اگرچہ وہاں تھے لیکن دکھائی نہیں دیتے تھے..اس نے اپنا کان سانسیوں کی ٹھٹھی کی جانب کیا اور بدن کو سننے کے لیے تیار کر لیا..

کتے چپ ہو گئے اور سناٹا پھر سے اتر آیا..اس کیکر کے ٹُنڈ پر وہ زیادہ گھنا اور بھید بھرا تھا جس پر براجمان وہ پُواجی کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ کان لگائے سنتا رہا..

پوُاجی کی لرزتی آواز آنی تھی..اور وہ آنے لگی..اندھیرے میں سرایت کرتی اس سے لڑتی جھگڑتی کہ میں نے تمہارے پار جانا ہے وہ آنے لگی..اس کی لرزش خاور کے کانوں تک پہنچنے لگی..

بال چراغ عشق دا...

پوُاجی ہمیشہ یہی چراغ روشن کرتے تھے۔

بال چراغ عشق دا میرا روشن کردے سینا ں...

ان کے سینے پر بال نہیں تھے لیکن ماس کیا ملائم اور پسلیوں پر ریشم کی مانند کسا ہوا تھا...

دل دے دیوے دی روشنائی جاوے وچ زمیناں..

وہ جانتا تھا کہ جب یکدم پوا جی اپنی باریک اور لرزش میں سرسراتی آواز اونچی کرنے کی کوشش میں گھگھیا جاتے تھے اور اول حمد ثنا الٰہی جو مالک ہر ہر دا... گانے کی سعی کرتے تھے تو یہ وہی لمحہ ہوتا تھا جب وہ ٹیکر کے اس ٹنڈ کی قربت میں آجاتے تھے جس پر وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا..

وہ ایک شہری بچہ تھا..

اپنے پہلے گاؤں کی پہلی رات میں وہ بالکل اندھا ہو گیا تھا اور ہاتھ پھیلا کر اٹک اٹک کر لاکھ وسوسوں اور دل کو مٹھی میں لے کر قدم دھرتا تھا کہ ابھی ٹھوکر کھا کر گروں گا.. جو ہڑ کے اندر... کسی درخت کے تنے سے جا ٹکراؤں گا.. کسی کچی دیوار میں جا لگنے سے میری ناک چپٹی ہو جائے گی لیکن کچھ اندھیاری شبوں میں بھٹکنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے... گاؤں کی شب دیجور میں.. کالی شاہ رات میں بھی کہیں روشنی کے کچھ ذرّے ہوتے ہیں جو درختوں دیواروں اور انسانوں کو نیم نمایاں کر دیتے ہیں..

اول حمد ثنا الٰہی...

بجھے کوئلوں پر ابھری راکھ ایسی سلیٹی رنگت کے گدھے پر سوار حضرت عیسیٰ چلے آ رہے تھے..

ان کے سفید لشکیلے بال ان کے کندھوں تک آتے تھے۔

وہ صرف ایک سفید تہبند میں ملبوس تھے اور اس سے اوپر ان کا کھلا بدن اندھیرے میں بھی لَو دیتا تھا۔

مشن سکول کے کلاس روم کی دیوار پر آویزاں اس نے حضرت عیسیٰ کی ایک تصویر دیکھی تھی.. اگرچہ وہ بہت ڈھلکے ہوئے ایک لمبے چوغے میں ملبوس ایک گدھے پر سوار تھے اور ان کے سر کے گرد ایک نورانی ہالہ روشن تھا.. لیکن پوا جی بھی ان سے کم نہ تھے..

"پوا جی..."

پوا جی اسی لمحے... ایس عجاب بانے اندر آدم ورکھ لایا... تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گدھے کو تھپک کر "بس وچھیریا..." کہا.. اور وہ انہی قدموں پر رک گیا.. پوا جی نے اوپر دیکھا.. وہ انہیں ٹنڈ پر بیٹھا نظر تو نہ آیا لیکن انہوں نے بہر طور بڑے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ "پتر خاور..."

"آہو پوا جی.." وہ کود کر نیچے آ گیا..

"آ جا..." انہوں نے گدھے پر جگہ بناتے ہوئے ذرا پیچھے کھسک کر کہا۔

خاور اسی جست کے تسلسل میں پھر کودا اور پوا جی کے آگے ان کی گود میں جا بیٹھا۔

"چل وچھیریا۔"

گدھا پھر سے چلنے لگا..

"پوا جی آپ اپنے پیر سے مل آئے۔"

"پتر وہ پیر نہیں اللہ لوک ہے.."

"یہ اللہ لوک کیا ہوتا ہے پوا جی۔"

"جو اللہ کا لوک ہوتا ہے.. اس کا بندہ ہوتا ہے۔"

"ہم بھی تو اس کے بندے ہیں پوا جی..."

"آہو... پر وہ اللہ سے باتیں کرتا ہے.."

"کیا باتیں کرتا ہے پوا جی؟"

"پتر یہ معرفت کی باتیں ہوتی ہیں.. ہم کمینوں کی سمجھ میں نہیں آتیں.."

"کونسی زبان میں باتیں کرتا ہے پوا جی؟"

"پتر اللہ کی کوئی زبان نہیں ہوتی.. بیشک پنجابی میں بات کر لو تو وہ سمجھ جاتا ہے.. جیسے میاں محمد بخش صاحب کی باتیں سمجھ جاتا تھا.."

"تو پھر پوا جی آپ خود ہی اللہ سے باتیں کر لیا کرو وہ سمجھ جائے گا.. اتنی دور جاتے ہو اللہ لوک کے پاس یہ سننے کے لیے کہ آج اللہ میاں نے کیا کہا ہے.."

"چپ کر کیا بینڈے کی طرح بولتا جاتا ہے.. اور میں نے تو تمہیں منا ہی کی تھی کہ رات کے وقت پنڈ سے باہر آ کر میری اُڈیک میں نہ بیٹھا کر... تو کیوں آیا ہے؟"

"میرا جی چاہتا تھا پوا جی.." پوا جی کے سوہنے اور سنہری ریشم ورگے کھیسے کی خوشبو سے وہ خوش ہو گیا اور پھر بینڈے کے طرح ٹر ٹر بولنے لگا "پوا جی جب آپ سانسیوں کی بھٹنی میں سے گزرے تھے تو وہ چتکبرا بُولی بھونکا تھا ناں؟"

"آہو... پر وہ مجھے کچھ کہتا نہیں ہے پر اس کے بھونکنے سے سانسی اپنے چھپروں میں سے نکل کر میرے وچھیرے کو بڑی حسرت سے دیکھتے ہیں کمینے.."

"پر کیوں پواُجی؟"

"وہ اس کی کھال کو دیکھتے ہیں پتر... کہ جب یہ مر جائے گا تو پہلے اس کا گوشت کھائیں گے پھر کھال اتار کر چھپر کے کچے فرش پر بچھائیں گے۔"

"یہ سانسی کھوتا بھی کھا جاتے ہیں پواُجی؟"

"آہو... مردار کھاتے ہیں... کچھوے 'ڈڈو اور کرلے بھی کھا جاتے ہیں کمینے.. یہ تو پھر وچھیرا ہے..."

"پر پواُجی یہ تو گدھا ہے تو آپ اسے وچھیرا کیوں کہتے ہیں... کیوں پواُجی؟"

پواُجی نے ہاتھ آگے کر کے گدھے کی گردن پر ایک لاڈلی تھپکی دی "یہ عام کھوتا تو نہیں ہے پتر... اللہ لوک کے آستانے پر حاضری دینے والا جانور ہے... یہ ناں ہے تو کھوتا پر وچھیروں کی طرح پھرتیلا اور ستھرا ہے..."

"ستھرا تو آپ بناتے ہیں پواُجی... اسے نہلاتے ہیں کنگھیاں کرتے ہیں..."

"آہو.. پر اس کے کھوتا ہونے میں بھی ایک بڑا فائدہ ہے... اگر یہ سچ مچ وچھیرا ہوتا ناں.. گائے کا بچہ تو رسول پور کے لوگ اسے کب کے ذبح کر کے کھا چکے ہوتے... اسے چوری کر کے... تو اب چونکہ یہ کھوتا ہے اس لیے اسے کھا نہیں سکتے... یہ فائدہ ہے.."

پواُجی نے سر جھٹک کر اپنے شانوں پر آئے سفید بالوں کو سنوارا اور "ہو وچھیرے" کہہ کر گدھے کو ذرا تیز چال میں ڈال دیا..

پواُجی گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے...

خاور کے لیے یہ ایک حیرت ناک انکشاف تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے۔ عید بقر عید پر بھی نہیں کھاتے... بے شک سالن میں صرف ایک بوٹی ہو' ہانڈی میں سے صرف شوربہ یا سبزی ان کی تھالی میں ڈال دیا جائے تو وہ منہ پھیر لیتے تھے کہ انہیں ماس کی بُو آجاتی تھی.. خاور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ کیسے رہتے ہیں... مرغی بھی نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس کی زندگی میں پہلے شخص ایسے تھے جو گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔

"پواُجی آپ گوشت کیوں نہیں کھاتے؟" اس نے ایک مرتبہ پھر وہی سوال دوہرایا جس کے جواب میں پواُجی صرف اتنا کہتے تھے "بس روح نہیں مانتی.."

"پر کیوں نہیں مانتی پواُجی؟"

"تو چپ نہیں کرتا بینڈے.."

"نہیں چپ کرتا' آپ بتائیں روح کیوں نہیں مانتی.."

"میرا دل کرتا ہے پتر کہ اس جہان میں آوازیں ہوں... بندے بشر تو باتیں کرتے ہیں ناں مجبوری کے لیے... دوسروں سے کچھ حاصل حصول کے لیے.. ول فریب کرنے کے لیے.. پردہ پوشی اور کچھ چھپانے کے لیے.. غیبت اور برائی کرنے کے لیے.. کوئی ایک آدھ بات میاں محمد بخش' جیسی بھی ہوتی ہے پیار محبت اور الفت کی.. باقی تو سب فریب اور دکھاوا ہوتا ہے.."

"اس لیے آپ گوشت نہیں کھاتے پواُجی؟"

"اوئے بینڈے بات تو پوری سن لے.. چپ کر... تو باتیں بندے بشر کرتے ہیں اور آوازیں ڈھور ڈنگر.. جنور اور پرندپکھیرو نکالتے ہیں... تو میرا دل کرتا ہے کہ اس جہان میں یہ آوازیں قائم رہیں.. بھیڑ بکریاں.. مال مویشی اور پرندے بولتے رہیں.. اگر ہم ان سب کو کھا جائیں گے تو خموشی ہو جائے گی ہر طرف.. سویرے سویرے چڑیاں نہ بولیں تو صبح رہ جائے گی.."

"پر پواُجی باقی سب لوگ کھاتے ہیں آپ نہیں کھاتے تو اس سے کیا فرق پڑے گا.."

"بینڈے.. میں نے آج تک اگر گوشت نہیں کھایا تو کوئی ایک وچھیرا یا بکرا تو رہ گیا ہوگا ناں.. کوئی ایک پرندہ تو آسمان پر اڈاریاں مارتا ہوگا ناں.."

یہ منطق اس کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ ٹرآنے سے باز آگیا اور چپ ہو گیا۔

بڑے جوہڑ کے کنارے گدھے کے پاؤں کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ پواُجی نے اُسے دو تین بار پیار سے تھپکا اور "چل وچھیرے چل" کہا تو وہ سر ہلاتا خشکی پر آگیا اور اطمینان سے چلنے لگا۔

خاور کے عین سامنے دو نوکیلے کان کھڑے تھے جو رات کی سیاہی میں دھیرے دھیرے ہلتے جاتے تھے۔ گدھا اپنے راستے سے خوب واقف تھا۔

بڑا جوہڑ پیچھے رہ گیا.. اس کی بُوٹی میں پوشیدہ ٹرآتے مینڈک اور جھینگروں کا شور بھی پیچھے رہ گیا..

"جو گلخ ہے ناں چیلن کا.. اس کے بارے میں سُنا ہے وہ چھپنی ناکوں والے سب کچھ کھا جاتے ہیں اسی لیے وہاں نہ مینڈک ٹراتے ہیں اور نہ جھینگر بولتے ہیں.. ہر طرف بس خموشی ہوتی ہے.. آہو۔"

یکدم تاریکی میں ایک اور تاریکی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ گھنی اور اندھی در آئی..

گدھا گاؤں کی پہلی گلی کے اندر داخل ہوا تو کچی اور موٹی دیواروں نے اسے گھیر کر باہر کی تاریکی کو روک کر مزید اندھیرا کر دیا.. پھر خاور کے سامنے جو دو نوکیلے کان مسلسل حرکت میں تھے ساکت ہو گئے اور گدھا رک گیا..

پو اُجی نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے بڑی احتیاط اور آسانی سے اٹھایا اور نیچے اتار دیا.. نیچے ہوتے ہوئے اس کا ایک پاؤں نالی میں چلا گیا جسے اس نے مشکل سے کھینچ کر باہر نکالا لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ پاؤں کیچڑ سے بھر گیا ہے..

پو اُجی کے سفید بال ان کے مضبوط اور ملائم کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور تاریکی میں وہ خود تو کم نظر آتے تھے لیکن ان کے بال صاف دکھائی دیتے تھے..

"پتر.." پو اُجی نے آہنی میخوں اور کوکوں سے مزین چوبی دروازے کو دھکیلنے سے پیشتر ایک ہاتھ سے دچھیرے کو تھپکا اور دوسرا ہاتھ پیار دینے کے انداز میں اس کے سر پر پھیرا..

"میرے اللہ لوک کو بشارت ہوئی ہے.. آج جمعہ کی نماز پڑھانے کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اگلے جمعے.. اس دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا.. انہیں بشارت ہوئی ہے.. تم کسی اور سے ذکر نہ کرنا.."

"پو اُجی.."

"چپ بیٹڑے۔"

"لیکن پو اُجی.."

"چپ.." انہوں نے سختی سے کہا..

پو اُجی نے دروازہ دھکیلا.. اندر بھی اندھیرے کی راجدھانی تھی اور صحن میں کوئی نہ تھا.. سب لوگ کوٹھے پر اپنی چارپائیوں میں سفید کھیس اوڑھے نیند میں فنا تھے.. انہوں نے صحن کے کونے میں مویشیوں کی کشتی نما کھرلی کے پاس گدھے کو باندھا، تھپکا اور مڑ کر کہنے لگے "چپ.. کسی کو بتانا نہیں..."

چھت پر اس کا بستر بچھا تھا اور اب تک اس کا سوتی کھیس اور کھدر کی چادر گرمیوں

کی رات میں بھی خاصی ٹھنڈک جذب کر چکے تھے لیکن وہ پو اُجی کے ہمراہ اوپر جانے کی بجائے اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا..

دروازہ کھول کر گھپ اندھیرے میں دیکھتا اندر چلا گیا۔

کوٹھڑی میں رنگین پایوں والی نواری چارپائیاں ایک ہاؤس آف کارڈز کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ایسے قائم تھیں جیسے ابھی گر جائیں گی اور سب سے نچلی چارپائی کی تنگی نوار پر اس کا سوٹ کیس دھرا تھا.. سفید نوار پر اس کا سیاہ سوٹ نمایاں نظر آتا تھا..

اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر سوٹ کیس کو نزدیک کیا اور اسے کھول کر اس کونے میں ہاتھ پھیرا جہاں اے بی سی بسکٹوں کا وہ ڈبہ موجود تھا جو وہ شہر سے اپنے ساتھ لایا تھا.. اس نے ٹٹول کر صرف ایک چینی لگا بسکٹ نکالا اور اپنے منہ میں رکھ لیا.. اور چبائے بغیر اسے وہیں رہنے دیا.. اس بسکٹ کا بیکری میں پکا ہوا میدہ اور اس پر چپکے چینی کے دانوں کا ذائقہ اسے اس نامراد گاؤں سے واپس اپنے شہر لے جاتا تھا جہاں یہ بسکٹ ہوتے تھے.. سوڈا واٹر کی بوتلیں اور آئس کریمیں ہوتی تھیں.. اس سے پیشتر کہ یہ ذائقہ گھل کر حلق سے نیچے چلا جاتا زائل ہو جاتا اس نے کوٹ کی تہہ میں بچھے پرانے اخبار پر ہاتھ پھیرا.. وہ در جنوں بار دن کی گرم روشنی میں اس اخبار کو آنکھوں کے قریب لا کر اپنے شہر میں پہنچ جاتا کیونکہ یہ وہ صفحہ تھا جس پر لاہور کے سینما گھروں میں دکھائی جانے والی فلموں کے مختصر اشتہار تھے..

اوڈین' پلازا' ریگل' کیپٹل' صنوبر' ریجنٹ.. ایسے طلسمی گھر جن میں "چتن" "جال" "دو آنسو" "ہنچ بیک آف نوٹرڈیم" اور "نیاگرا" ایسے جادو چلتے تھے۔

وہ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس صفحے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ان کی ایک ایک سطر اور تصویر سے آگاہ ہوتا تھا اور اسے یہ اطمینان ہوتا تھا کہ وہاں میرا ایک شہر ہے جہاں شائد اس لمحے یہ فلمیں سکرین پر چل رہی ہیں اور تماشائی سوڈا واٹر کی بوتلیں پی رہے ہیں۔

اس نامراد گاؤں سے فرار اس کا سب سے بڑا خواب تھا۔

اسے زبردستی.. تقریباً ہاتھ پاؤں باندھ کر رسول پور بھیج دیا گیا تھا۔

صرف اینگلو ورنیکلر کے فائنل امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے۔

ماسٹر رحمت علی اس کے ابا جان کے بہت قریبی دوست تھے۔ باریش اور بلند قامت.. کرخت طبیعت کے اور نرمی سے یکسر نا آشنا" شاہ صاحب.. شہر میں بچہ چوڑ ہو جاتا

ہے .. گرمیوں کی چھٹیوں میں اسے میرے ساتھ رسول پور بھیج دیجئے وہاں یہ ریڈیو اور فلموں وغیرہ کی لغویات نہیں ہوں گی .. میں اسے پڑھاؤں گا .. انشاء اللہ ورنیکلر فائنل میں اچھے نمبر لے گا .. اصل امتحان تو یہی ہے میٹرک تو معمولی بات ہے ..''

شاہ صاحب نے اپنے اکلوتے بچے کو ورنیکلر فائنل پر بلا جھجک قربان کر دیا اور اسے ماسٹر رحمت علی کے سپرد کر کے گاؤں بھجوا دیا ..

یہ گاؤں پتہ نہیں کہاں تھا ..

شاید اس کا کوئی وجود نہ تھا اور یہ صرف ایک شہری بچے کو اذیت دینے کے لیے عارضی طور پر تخلیق کیا گیا تھا ..

گاؤں کہیں نہ کہیں تو ہوتے ہیں .. لیکن یہ کہیں بھی نہ تھا ..

ریلوے تو بہت دور کی بات ہے .. یہ کسی پکی سڑک کے آس پاس بھی نہ تھا جس پر کوئی مکانکی سواری اس کی قربت میں آ سکتی .. وہاں سے بھی کوسوں دور تھا ..

نزدیک ترین تہذیب یافتہ بستی جہاں پورے دن کی پیدل مسافت کے بعد پہنچا جاتا تھا کوئی قصبہ مگھووال نام کا تھا .. اور وہ بھی رسول پور کا ایک نسبتاً بڑا بھائی تھا۔ اس قصبے کی تہذیب یافتگی کی سند ایک پکی سڑک اور صرف ایک ڈاکخانہ تھا جس کے عملے میں بھی صرف ایک شخص تھا جو جب کبھی اپنی بھینسوں کو چارہ ڈالنے اور دودھ دوہنے سے فارغ ہوتا تو ڈاک کے لفافے اور کبھی کبھار ٹکٹ فروخت کرنے کے لیے ایک کچے کمرے میں آ بیٹھتا جس کے نصف حصے میں بھینس کا ایک تودہ براجمان تھا ..

رسول پور سے اول تو کسی کو خط لکھنے کی حاجت ہی پیش نہیں آتی تھی اور اگر یہ وقوعہ ناگزیر ہو جاتا تھا تو اس خط کو لکھنے والا صرف ماسٹر رحمت ہی تھا جو اس خط کو لکھنے کے بعد اسے اپنے تہبند کی کسی گرہ سے اڑس لیتا اور وہ مدتوں وہیں رہتا کہ اسے پوسٹ کرنے کے لیے ایک لفافہ درکار ہوتا اور وہ ڈاک کا لفافہ صرف مگھووال کے ڈاکخانہ سے ہی فراہم ہو سکتا تھا اور اکثر اوقات نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ پوسٹ ماسٹر کی کوئی بھینس دودھ دینے سے انکاری ہو جاتی تھی اور جب تک وہ دودھ نہ دے پوسٹ ماسٹر صاحب کیسے ڈاکخانے میں آ سکتے تھے .. اور اگر یہ لفافہ کسی آنے جانے والے کے ہاتھوں وہاں سے منگوا بھی لیا جاتا تو خط اس میں ڈال کر پھر سے اسے مگھووال بھجوا کر پوسٹ کرنے کا مرحلہ شروع ہو جاتا تھا۔

چنانچہ رسول پور میں خط و کتابت کا کچھ زیادہ رواج نہ تھا ..

پورا گاؤں کچا تھا ..

صرف ماسٹر رحمت علی کا پسار پکا تھا .. لیکن وہ کوٹھڑی بھی کچی تھی جس میں نواری چارپائی پر اس کا سیاہ سوٹ کیس بے وجہ لگتا تھا۔

شہر کی نسبت رسول پور کے آسمان پر ستاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ چمکتے بھی بہت بے بہا تھے .. ابھی رات کے بھیگنے سے جو مدھ بھری غنودگی وارد ہوتی ہے خاور اس میں گم اور بے ہوش ہوتا تو چاچا ماسٹر کی کرخت آواز اسے بیدار کر دیتی۔ ''اوئے خاور .. دوپہر ہو گئی ہے اور تو سویا پڑا ہے .. اٹھ۔''

وہ آنکھیں ملتا اٹھتا تو دوپہر میں ستارے روشن ہوتے ..

نیچے صحن کی تاریکی میں سے اول نمبر چاچی کی مدھانی کی آواز بلند ہو کر ستاروں تک یہ خبر لے جاتی کہ چاٹی میں گھومتی مدھانی میں مکھن گھنا ہو رہا ہے اور دودھ کے رڑھکنے سے زور لگ رہا ہے .. مدھانی کی روانی کو ادھ رڑھکے کی گھنی آزمائش روکنے لگتی۔

چاچا ماسٹر کی یہ دیہاتی بیوی جو اول نمبر تھی ادھیڑ عمر اور بوسیدہ تھی۔ وہ ہمیشہ سیاہ کرتے اور تہبند میں ملبوس ہوتی اور اس کے پورے سراپے میں سے لسی کی بو آتی .. وہ سارا سال اس گھر کی اور پو اجی کی دیکھ بھال کرتی .. برسات کی آمد سے پیشتر بڑے جوہڑ سے مٹی لا کر اس میں بھس ملا کر چھت پر لیپ کرتی اور سردیوں کے دوران پو اجی کے خشک ہوتے جسے پر مکھن سے مالش کرتی .. گرمیوں کی چھٹیوں میں جب اس کا خاوند شہر لاہور میں ماسٹری کر کے لوٹتا تو پھر اس کی خدمت پر جت جاتی .. اس سے کبھی چاچی نمبر دو کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھتی جو سوہنی گوری چٹی اور کم سن تھی اور جسے وہ شہر میں چھوڑ آتا تھا کیونکہ گاؤں کی آب و ہوا اسے راس نہ آتی تھی اور اسے نزلہ زکام ہو جاتا تھا۔

اول نمبر چاچی کے لیے یہ بہت تھا کہ وہ ہر برس دو ماہ کے لیے اس کے ہاں .. اس کے صحن میں .. اپنے والد پو اجی کے پاس لوٹ آتا ہے ..

ماسٹر رحمت علی ان دو ماہ کے دوران اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے ..

اول نمبر چاچی کی کوئی اولاد نہ تھی ..

اور چاچی نمبر دو نے بچوں کے ڈھیر لگا دیے تھے ..

ماسٹر صاحب نے اپنے رہن سہن کا بندوبست کچھ یوں کر رکھا تھا کہ آج تک دونوں چاچیوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی.. اور نہ ہی اول نمبر چاچی نے اپنے خاوند کو دوسری بیوی نے فراہم کردہ بچوں کے ڈھیر میں سے کسی ایک بچے کو دیکھا تھا .. ماسٹر صاحب کی شہری حیات الگ تھی اور گاؤں کی زندگی بالکل تھلگ...

تو جب وہ اس تاروں بھری دوپہر کی تاریکی میں آنکھیں ملتا ڈولتا ہوا .. اپنی دھوتی سنبھالتا اٹھتا' کچی سیڑھیوں سے نیچے ویہڑے میں آتا تو دودھ رڑھکنے کی آواز بلند ہو جاتی .. چاٹی کے بند منہ میں مدھانی گھوم گھوم کر اٹکتی اور دھم دھم کی ایک ایسی ردھم ویہڑے کو بھرتی جاتی جیسے سٹیتھو سکوپ میں دل کی دھڑکنے کی آواز دھم دھم سنائی دیتی ہے..

اول نمبر چاچی اپنے خصم کی "اوئے دوپہر ہو گئی ہے اٹھ.." کی پاٹ دار آواز سننے کے چند لمحوں بعد مدھانی کی مٹھیوں پر گرفت ڈھیلی کر کے رک جاتی اور پیچھے مڑ کر دیکھتی تو خاور آخری سیڑھی سے ویہڑے میں قدم رکھ رہا ہوتا۔ "آجا ماں صدقے.."

خاور ڈولتا ہوا نیم اندھیرے میں چاچی کے قریب پہنچتا تو وہ مدھانی چاٹی میں سے نکال کر ایک کھلے منہ والے تانبے کے کٹورے پر چاٹی کی گردن پکڑ کر اسے جھکاتی اور ادھ رڑھکا مکھن سے گھنا ہوتا دودھ کٹورے کو بھر دیتا اور وہ تاریکی میں ایک سفید چاند کی طرح چمکنے لگتا.. خاور کٹورے کے بھرتے ہی کہتا "چاچی چینی"

"آ ہو پچ..." وہ ہنستی۔ "شہریئے چینی بغیر ادھ رڑھکیا بھی نہیں پیتے.. میں لاتی ہوں۔"

چینی' خاور والی پکی کوٹھڑی میں لگی گھڑوں کی پال کے سب سے اوپر والے گھڑے میں سٹور تھی.. چاچی اس میں سے مٹھی بھر کر لے آتی اور ادھ رڑھکے دودھ میں ڈال کر اسے انگلی سے خوب ہلا کر کٹورا اسے تھما دیتی..

یہ گھنا نیم مکھن دودھ اٹک اٹک کر اس کے حلق سے اترتا.. اور اس کی آنکھیں اس کے سرور سے پھر سے بند ہونے لگتیں.. وہ اپنے بدن کے مختلف حصوں کو کھجلاتا دو تین جمائیاں لیتا اور کوکوں سے مزین بھاری دروازہ دھکیل کر گلی میں آ جاتا.. کچی دیواروں کو ٹٹولتا نالیوں سے بچتا وہ ہولے ہولے آگے بڑھتا اور جب وہ گاؤں سے باہر نکل کر رسول پور نہر تک پہنچتا تو ہلکی سی روشنی پھیلنے کو ہوتی اور اس میں کچے کوٹھے' کھیت' جوہڑ اور ٹھریلیوں کے

ساتھ بندھے ڈنگر مویشی ظاہر ہونے لگتے۔

خاور کے لیے اس نامراد گاؤں میں یہ نہر' تہذیب کی واحد علامت تھی..

یہ نہر.. سوٹ کیس میں بچھا پرانا اخبار اور اے بی سی بسکٹوں کا ڈبہ..

وہ پٹڑی پر کچھ دور تک جاتا اور پھر نیچے اتر کر پانی کی قربت میں جہاں گھاس اور بوٹیوں کی بہتات تھی وہاں لیٹ جاتا۔

گھاس میں تریل کی نمی اس کے سارے بُنتے کو ٹھنڈا کر دیتی اور وہ اُن تنکوں کو جو اس کے نتھنوں کے آگے سرسراتے ان میں گدگدی کرتے تھے.. توڑ کر انہیں پانی میں پھینک دیتا اور فوراً ہی گہری نیند میں چلا جاتا۔

اگرچہ چاچا ماسٹر کا یہ خیال تھا کہ وہ صبح سویرے بیدار ہو کر نہر کنارے ایک لمبی سیر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی صحت بہتر ہو گی اور وہ خوب چاق و چوبند ہو کر ورنیکلر کے امتحان کی تیاری کرے گا اور پوزیشن حاصل کرے گا.. لیکن یہ محض خیال تھا۔

وہ مکمل طور پر گہری نیند میں تو نہیں جاتا تھا بس غنودگی کی ایک مست اور ٹھنڈک والی کیفیت میں سرشار لیٹا رہتا.. نہر کے مدھم بہاؤ کی سرسراہٹ اس کے کانوں میں اترتی رہتی.. اترتی رہتی.. پھر ڈنگر مویشیوں کی گھنٹیاں دور سے سنائی دیتیں۔ قریب آتی رہتیں اور "اوئے مریں" "اوئے تینوں چور لے جان" پکارتا اور کوستا کوئی کسان مویشیوں کو ڈنگوری سے ہانکتا پٹڑی پر سے گزر جاتا.. یہ آوازیں بہت دور کی لگتیں.. اس کے بدن کے اندر گھنٹیاں بجاتیں تیرتی نکل جاتیں.. وہ پٹڑی سے نیچے پانی کے قریب تریل اور ہریاول کی گود میں گچھا مچھا ہو کر اونگھتا رہتا.. نہر کے بہنے کی آواز کچھ مدھم ہونے لگتی اور چڑھتے سورج کی کچھ کرنیں پانی میں آ کھلتیں اور نہر کا وہ حصہ جو ان کرنوں کی زد میں آتا چمک جاتا.. اور اس کے گرد جو پانی ابھی نیم سیاہی میں ہوتے بہتے جاتے۔ چمکتے پانی کے اس حصے کی لشک سے اس کے بند پپوٹے روشنی سے بھر جاتے.. اور یہی وقت ہوتا تھا کسل مندی سے اٹھنے کا اور گھاس کے گیلے تنکوں کو بالوں میں سے نکالنے اور گھر واپس جانے کا..

وہ گھر لوٹتا تو چاچا ماسٹر اور پو اُجی ڈیرے کو جا چکے ہوتے..

وہ اپنا بستہ سنبھالتا' دھوتی کو گرنے سے بچاتا گاؤں سے نکل کر بڑے جوہڑ کے کنارے چلتا' کیکر کے ٹنڈ کے قریب سے ہو کر سانسیوں کی بھٹھی سے ذرا پرے ہو کر ڈیرے

پر پہنچ جاتا..

چتکبرا بُولی اسے دور سے دیکھ کر ایک بار تو ضرور دُم پٹخ کر اٹھتا اور جبڑے کھول کر غرّانے کا ارادہ کرتا اور پھر اسے دھوتی کی شرافت میں ملبوس پا کر یہ ارادہ ترک کر دیتا۔ وہ تو صرف اس کی شلوار کے پائینچے کا دیوانہ تھا..

ڈیرے پر شیشم کے پانچ درخت تھے..ان کے نیچے بان کی تین چارپائیاں تھیں' دو کھڑے تھے اور ایک چارے کی کھرلی تھی جو پوآجی کے گدھے کے لیے مخصوص تھی..ارد گرد کھیتوں کا پھیلاؤ تھا..

کچھ چارے کے کھیت تھے..پھر گنے کے بُوٹوں کی بلند دیواریں تھیں اور ڈیرے کے برابر میں جو کھیت تھا اس میں سہاگا پھرا ہوا تھا..

وہ گوٹھ مار کر اپنی دھوتی سے اپنے درمیان کو ڈھکتا بان کی بے آرام کھردری چارپائی پر ابھی بیٹھ ہی رہا ہوتا کہ چاچا ماسٹر اسے حساب کے سوال حل کرنے کے لیے ایک کاپی تھما دیتے جس پر انہوں نے سینکڑوں کی تعداد میں سوال بنا رکھے ہوتے تھے۔

دس بجے کے قریب اول نمبر چاچی کماد کے کھیتوں کے کنارے پانی کے کھال کے کنارے ایک مختصر سی بنی پر چاپئی سر پر اٹھائے اس پر ایک دستر خوان رکھے اطمینان سے چلتی ہوئی ڈیرے کی جانب آتی نظر آنے لگتی۔

یہ بریکفاسٹ ٹائم ہوتا تھا..

پوآجی کے لیے کچی لسّی..چاچا ماسٹر کے لیے دو پراٹھے اور اچار..اور اس کے لیے تندور کی باسی روٹی۔ تازہ مکھن اور چائے..اور چینی کی ایک پُڑیا جو وہ مکھن پر چھڑک کر روٹی کے ساتھ کھاتا اور ساتھ میں خالص دودھ کی چائے کے گھونٹ بھرتا..یہ رات کی باسی روٹی اور اس پر مکھن اور چینی..کسی بھی ڈبل روٹی سے زیادہ خستہ اور مزیدار ہوتی تھی..

پھر سارا دن حساب کے سوال..مکھیاں..دھوپ تیز ہوتی تو کھیتوں سے آنے والی گوبر اور فضلے کی بُو..اردو گرائمر..انگریزی کے جواب مضمون..چاچا ماسٹر پانچویں جماعت کے کورس کی کتابیں تصنیف کرتے رہتے جو اردو بازار کا ایک ناشر ٹھیکے پر ان سے لکھواتا تھا۔

سورج غروب ہونے لگتا تو وہ پوآجی کے ہمراہ گاؤں واپس چلا جاتا..

جب پہلے روز وہ اس کالے پانی کی قید کاٹنے کے لیے شہر سے ایک طویل مسافت

کے بعد مکھووال کے قصبے میں بس سے اترا تھا اور پھر فوری طور پر اس ویران سے قصبے سے باہر نکل کر اپنے آگے آگے چلتے چاچا ماسٹر کی لمبی لمبی پلا ہنگوں کے پیچھے پیچھے تقریباً بھاگتے بے حال ہوتے اور گرتے ان کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہلکان ہوتا تھا...اور ابا جان تو جب کبھی اس کے آگے چلتے تھے تو ہر دو قدم پر رک کر پیچھے دیکھتے تھے کہ وہ آ بھی رہا ہے یا نہیں لیکن یہ جو چاچا ماسٹر تھے انہوں نے تو اس ویران دوپہر کی برباد جہنمی گرمی میں اسے بارہ میل کی مسافت کے دوران..کھیتوں..رڑھے میدانوں..ٹیلوں' قبرستانوں..ہل چلائی اونچی نیچی زمینوں اور پانی کی خشک کھالوں میں چلتے ہوئے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر یہ اطمینان نہیں کیا تھا کہ وہ آ بھی رہا ہے یا نہیں..یا وہیں بس کے باہر ہی کھڑا رہ گیا ہے..نہ پانی کا پوچھا نہ آرام کرنے کو کہا..بس لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے گئے اور وہ ان کے پیچھے سراسیمہ اور خوفزدہ اس لیے کہ اگر یہ آگے نکل گئے اور میں یہیں رہ گیا تو اس بھری دوپہر میں اس ویرانے میں میرے ساتھ کیا ہوگا..وہ کبھی تیز چلتا..کبھی ڈڑکی لگاتا' پیاس کی شدت سے اور پسینے کی رم جھم میں..ان کے پیچھے پیچھے۔

چاچا ماسٹر نے رسول پور پہنچ کر اپنے گھر کا دروازہ پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا تو صحن کی ویرانی کے ایک کونے میں سلگتے اپلوں پر رکھی ایک چاٹی کے قریب سیاہ پوش چاچی بیٹھی چرخہ کات رہی تھی اور ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی انہوں نے پُونی ہاتھ سے رکھ دی اور سیاہ چادر کا گھونگھٹ چہرے پر اتار لیا۔ چاچا ماسٹر نے تب بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ ورنیکلر فائنل والا بچہ زندہ بچ بھی گیا ہے یا نہیں..چاچی کو ایک واجبی سا سلام کر کے کہنے لگے "یہ اپنے شاہ صاحب کا بیٹا ہے خاور..گرمیوں کی چھٹیوں میں ادھر ہی رہے گا"..اور چاچی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنے دس ماہ سے گمشدہ خاوند پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر اس کے سر پر ایک پینڈو پیار دیا "جی آیاں نوں پتر..

"پتر.."کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی..اس لیے کہ وہ بے اولاد تھی۔

رسول پور کا دور افتادہ کچا گاؤں اور اس کی چیلوں سے چیختی بھری دوپہریں اُسے ہول سے بھر دیتی تھی..اسے یقین نہ آیا کہ زندگی اتنی ٹھہری ہوئی' ساکت اور بے مقصد بھی ہو سکتی ہے..بس صبح ہوتی ہے اور پھر شام ہوتی ہے..اور پھر شام ہوتی ہے..اور گرم دوپہر ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتی..کھیتوں میں گوبر کی بُو ہے..رُوڑی پر فضلے کی خشکی

میں سے بد بُو اُٹھتی ہے.. جوہڑ کے کیچڑ بھرے گدلے مینڈک بھرے پانیوں میں سے سورج کی تپش سے متلی آور بخارات اٹھتے ہیں.. گاؤں کے مکین خاموش ہیں اور اسے عجیب نظروں سے دیکھتے گزر جاتے ہیں.. اور چتکبرا بُولی ہے جو اس کی شلوار کے پائینچے کا شائق ہے.. ایک ڈیرہ ہے.. پانچ شیشم کے درخت.. تین بان کی چارپائیاں.. دو گھڑے.. ایک کھرلی اور ایک گدھا.. اس ہول سے اس ویرانی کے ڈر سے اسے بخار آنے لگا.. لیکن اس نے کسی سے تذکرہ نہ کیا.. اسے سب سے زیادہ غصہ اپنے ابا جان پر تھا.. جنہوں نے اسے جان بوجھ کر اس ہول میں دھکیل دیا تھا.. وہ ان سے کشتی لڑنا چاہتا تھا انہیں زمین پر گرا کر ان کی چھاتی پر مکے مارنا چاہتا تھا.. اسے ان سے ایسی سنگدلی کی ہرگز توقع نہ تھی.. شاید وہ ان کا اصلی بیٹا نہ تھا۔ نقلی بیٹا تھا جسے وہ کسی کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر لائے تھے.. بس یہی وجہ ہو سکتی تھی.. وہ تو ایک شہری بچہ تھا.. اسے شہر چاہیے تھا.. سوڈا واٹر، فلمیں، آئس کریم، بسکٹ، بجلی اور شلوار چاہیے تھی.. کرکٹ کھیلنے کے لیے دوست چاہیے تھے.. اور یہاں کچھ بھی نہ تھا.. سوائے چلچلاتی دوپہروں، کچی دیواروں، گرمی میں ابلتے جوہڑوں اور ایک بے بسی کے.. کہ شہر یہاں سے صدیوں کے فاصلے پر تھا.. پہلے دس بارہ میل پیدل مارچ کرو.. پھر منگھووال آئے گا.. وہاں دن میں ایک لاری آئے گی.. پھر کہیں گاڑی آئے گی اور پھر کہیں.. وہ ابا جان کا نقلی بیٹا تھا یقیناً..

اس نے ابا جان کو فوراً ہی ایک درد بھرا رقت آمیز خط لکھا جس کے آخر میں اس نے زندگی میں پہلی بار ''آپ کا اکلوتا بیٹا خاور'' لکھا اور وہ خط پورے دس دن اس کی حساب کی کاپی میں پڑا رہا۔ کیونکہ ڈاک کا لفافہ نہ تھا.. اور جب بالآخر منگھووال سے آنے والا ایک کمہار وہاں اپنے گھڑے بیچنے کے بعد چاچا ماسٹر کی فرمائش کے مطابق ایک ڈاک کا لفافہ لے کر آ گیا تو اس نے بے چارگی میں اور بے بسی میں اور شدید طیش کی حالت میں اس خط کو ریزہ ریزہ کر دیا.. ابا جان بھی نقلی تھے انہیں یہ خط بھیجنے سے فائدہ!

اس کی موجودہ زندگی میں صرف پانچ کردار تھے.. چاچا ماسٹر۔ چاچی جی۔ بو اُجی، گدھا اور چتکبرا بُولی کتا.. ان کے علاوہ اُس نادار گاؤں میں اور کوئی نہ تھا.. کچے گھروں کے اندر کوئی نہ تھا.. بس ویرانی تھی اور دوپہریں تھیں اور ہول تھا..

پھر ایک روز اس نے صبح سویرے نہر پر جا کر سیر کرنے کی اجازت چاہی.. اور درِ زنداں میں ایک آبی روزن کھل گیا.. وہ کم از کم سویرے کے چند لمحوں میں زندہ اور آزاد

محسوس کرنے لگا۔

چاچا ماسٹر اس پر کڑی نظر رکھتے تھے.. اس کی صحت، اس کی پڑھائی اور اس کی خوراک کا خیال رکھتے تھے لیکن اس کا خیال نہیں رکھتے تھے وہ ان کے لیے ورنیکلر فائنل کے امتحان کا ایک نالائق پرچہ تھا جسے انہوں نے لائق بنانا تھا..

بو اُجی زیادہ فرینڈلی نہیں تھے۔

ان کی عمر کم از کم سو برس کے لگ بھگ تھی.. یا شہری بچے کی جتنی عمر تھی اس عمر میں وہ سو برس کے لگ بھگ ہی لگتے تھے.. وہ ہمیشہ ایک سفید تہبند میں ملبوس ہوتے۔ اس سے اوپر کا بدن ڈھانپنا جمعے کی نماز کے علاوہ گناہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ پتر یہ جُسّہ تو سوہنے رب نے ہنڈانے کے لیے دیا ہے.. برتنے کے لیے دیا ہے، اس پر کچھ پہن لو تو جسّے کا ساہ بند ہو جاتا ہے.. اور ان کا بدن ایک نخریلی گھوڑی کی طرح چکنا ملائم اور بنا چربی کے تھا.. ان کے کندھے بھی ایسے تھے کہ ان پر ہاتھ رکھنے سے ہاتھ پھسلتا تھا.. البتہ وہ اپنے پٹوں کا.. کندھوں تک آتے سفید چمکیلے بالوں کا خاص خیال رکھتے.. انہیں نہایت اہتمام سے لکڑی کی ایک کنگھی سے سنوارتے رہتے.. ڈیرے پر جب وہ بان کی چارپائی پر گوٹھ مارے حساب کے سوال حل کر رہا ہوتا بو اُجی ایک کھُرپی سے کھیتوں میں گوڈی کرتے رہتے.. پھر تیلے اتنے کہ پانی کا چوڑا کھال آسانی سے پھلانگ جاتے۔ اپنی چارپائی اٹھا کر ہل چلے کھیت میں چلتے تو ان کی کمر میں بل نہ آتا.. اور کان اتنے تیز کہ اگر ان کے کماد کے کھیت میں سے جو خاصے فاصلے پر تھا کوئی ایک گنا توڑتا تو وہیں ڈیرے پر بیٹھے ہوئے اپنے گدھے کو تھپکتے ہوئے اس گنے کے ٹوٹنے کی مدھم سرسراہٹ سن لیتے بلکہ گنا چور کی صنف کا تعین بھی کر لیتے..

چاچا ماسٹر سے ان کی زیادہ دوستی نہ تھی.. اگرچہ ان کی کل اولاد میں سے.. گیارہ بال بچوں میں سے صرف وہی تھے جو اب تک حیات تھے لیکن وہ ان سے پرے پرے رہتے تھے سلام دعا کے سوا ان سے کوئی کلام نہ کرتے.. وہ ان کی نسبت اپنے گدھے کے زیادہ قریب تھے..

بو اُجی اپنی ذات میں گم.. ایک الگ زندگی گزارتے۔

انہوں نے خاور کو بھی کبھی کسی التفات سے نہ نوازا.. کبھی اس کے سر پر ہاتھ نہ پھیرا.. بس ڈیرے پر پہنچنے پر اس کے سلام کا جواب دیتے اور اپنے گدھے کو تھپک کر کھُرپی ہاتھ میں لے کر کھیتوں کے اندر چلے جاتے۔

پو اُجی سے اس کی دوستی کا آغاز رسول پور سے آمد کی ستر ہویں سویرے ہوا..

خاور حسب معمول اس سویر بھی یا اس سویر کی آمد کی قربت میں نہر کے پانیوں کی نزدیکی میں گھاس اور تریل کی نم آلود ٹھنڈک میں گچھا مچھا ہو کر اونگھ رہا تھا جب اس نے ڈنگروں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں اور "اوئے مریں.. اوئے تینوں چور لے جان" اور پانی کے بہاؤ سے الگ ایک اور آواز سنی..

اول حمد خدا دی کریئے جو مالک ہر ہر دا..

اس نے آنکھیں کھول دیں کہ یہ آواز بہت نزدیک سے آرہی تھی۔

اس نے کہنیوں پر ٹیک لگا کر اپنے آپ کو گھاس میں سے ذرا اونچا کیا۔

پو اُجی تھے..

ان کا گدھا تھا..

اور وہ سیاہ چمڑے کے بَوکے کو نہر میں ڈبو کر پانی سے بھر کر اسے اپنے گدھے پر انڈیل کر اسے نہلا رہے تھے اور اول حمد خدا دی.. گا رہے تھے..

خاور اٹھ کر گھاس میں بیٹھ گیا.. اور پو اُجی اور ان کا گدھا صاف نظر آنے لگے۔

لیکن پو اُجی مگن رہے.. بَوکے کو نہر میں ڈبو کر بھرتے اور نہایت اہتمام سے کبھی گدھے کے سر پر اور کبھی پشت پر انڈیلتے.. گدھا بھی اس غسل سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور بالکل بُت بنا اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ انہوں نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں حالانکہ وہ ان کے بالکل سامنے گھاس پر براجمان انہیں تک رہا تھا.. وہ اپنے وچھیرے کے ساتھ کچھ راز و نیاز بھی کر رہے تھے لیکن ذرا سرگوشیوں میں اور اس کے لمبوترے ایستادہ کانوں میں جو اس تک نہیں پہنچ رہے تھے.. گدھے کو دیسی صابن کی چاکی سے مل مل کر نہلانے کے بعد انہوں نے تہبند کی ڈب میں سے اپنی لکڑی کی کنگھی نکالی اور اس کے بال سنوارنے لگے.. ایال سے فارغ ہو کر وہ اس کی دم پر کنگھی پھیر رہے تھے۔ جب خاور نے کہا "ہیلو پو اُجی..."

"اوئے..." وہ چونک گئے... وہ تھوڑے سے اُڑے ہوئے تھے یعنی ذرا خمیدہ تھے اس لئے جب انہوں نے "اوئے" کہا تو وہ دیکھ تو زمین کی طرف رہے تھے اور انہوں نے سر اٹھانے کی بجائے صرف آنکھوں کے پپوٹوں کو اونچا کر کے اس کی جانب دیکھا "اوئے شہریئے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"میں جی؟... میں تو یہاں سیر کر رہا ہوں... ورنیکلر فائنل کا امتحان دینا ہے ناں میں نے.."

"یہ سیر ہے..." وہ ذرا سیدھے ہو گئے۔

"ہاں جی... پر آپ ماسٹر صاحب کو یہ نہ بتایئے گا کہ میں یہاں آکر سو جاتا ہوں۔"

"ماسٹر صاحب سے کوئی بول بولے ہوئے مجھے تو مدتیں ہو گئی ہیں شہریئے... میں نے کیا بتانا ہے۔"

"پر وہ آپ کے بیٹے ہیں.. آپ کیوں نہیں بولتے.. میرے ابا جان تو چُپ ہی نہیں ہوتے۔"

"ادھر آؤ.."

خاور اپنے گھاس کے مسکن سے اٹھا اور ان کے گدھے کے دوسری جانب جا کھڑا ہوا۔ ابھی نیم تاریکی تھی۔ ابھی نہر کے پانی کا ایک پیوند سورج کی کرنوں کی لشک سے بہاؤ سے جدا نہیں ہوا تھا..

"بیٹا ہونے سے کیا ہوتا ہے.. کچھ بھی نہیں۔ میرے اور بھی بیٹے تھے جو چلے گئے اور مجھے ان کی قبریں بھی یاد نہیں... اسے شوق تھا پڑھائی کا... یہ شہر چلا گیا اور وہاں ماسٹر ہو گیا.. اب گرمیوں کی چھٹیوں میں ادھر آجاتا ہے تو مجھے تو اس کی شکل بھی بھول چکی ہوتی ہے.. بیٹا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"آپ کبھی شہر نہیں گئے؟" وہ پوچھنا تو یہ چاہتا تھا کہ آپ نے کبھی سوڈا واٹر نہیں پیا.. آئس کریم نہیں کھائی... "نیاگرا" فلم نہیں دیکھی.. مارلن منرو کو نہیں دیکھا۔

"نہیں.. میں تو کبھی مگھووال بھی نہیں گیا.."

"کیوں؟"

"کیوں جاؤں؟"

اس کا جواب اسے سوجھا نہیں.. اور وہ گدھے کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا.. اس کے بال ابھی تک گیلے تھے..

اس روز اُسے معلوم ہوا کہ رسول پور سے آٹھ کوس کے فاصلے پر کسی کلر زدہ رقبے میں کوئی ویرانہ ہے جہاں ایک کچے ڈھارے میں پو اُجی کا پیر اللہ لوک رہتا ہے۔ اسی لیے

وہ ہر جمعے کے روز اپنے گدھے کو نہلاتے سنوارتے تھے۔ پھر آنکھوں میں سُرمے کی سلائیاں پھیر کر عطر پھلیل کی خوشبو لگا کر دھلا ہوا تہبند باندھ کر اس پر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ وہ جمعہ کی نماز اپنے پیر کی امامت میں پڑھتے تھے اور پھر خطبے میں اس کی بشارتیں سنتے تھے اور رات کو واپس آتے تھے.. اور آج جمعہ تھا..

بس اس سویر کے بعد پو اَجی فرینڈلی ہو گئے..

وہ اب ہر جمعے کو شام ڈھلے بڑے جوہڑ کے کنارے کیکر کے ٹُنڈ کے اوپر چڑھ جاتا.. اتنا اوپر کہ اگر وہ چتکبرا ٹُوبی اِدھر آ نکلے تو اس کی تھوتھنی اس تک نہ پہنچ پائے.. اور یوں بھی آس پاس بیٹھنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی.. اور پھر پو اَجی کی واپسی کا انتظار کرنے لگتا۔

چاچا ماسٹر نے اس دوستی کو پسند نہ کیا..

"بچے..." ایک روز حساب کا کوئی سوال غلط حل کرنے پر انہوں نے اس کے کان کو نامناسب حد تک کھینچا "سوال غلط ہے.. میں نے شاہ صاحب سے وعدہ کر رکھا ہے کہ تو ورنیکلر فائنل میں اچھے نمبر حاصل کرے گا.. اور تو دھیان نہیں کرتا.. پو اَجی کے ساتھ وقت ضائع کرتا رہتا ہے.. اس بابے کا دماغ کام نہیں کرتا.. بڑھاپے سے الٹ گیا ہے.."

"پر چاچا جی وہ تو آپ کے ابا جی ہیں.." اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا..

"ابا جی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا بچے.. وہ ایک خود غرض بابا ہے.. اس کے ساتھ وقت نہ ضائع کیا کر.." یہ منطق اس کی سمجھ سے بالکل باہر تھی کیونکہ اس کے لیے تو ابا جی ہونے سے ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اسے اس نامراد گاؤں میں بھیج دیا تھا..

اگلے روز.. اس رات سے اگلے روز جب پو اَجی نے اسے بتایا تھا کہ ان کے اللہ لوک کو بشارت ہوئی ہے کہ ایک اور طوفان نوح آنے کو ہے اور اگلے جمعے پوری دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا.. پو اَجی اس سے دُور دُور رہے..

عام طور پر سارا دن کھیتوں میں گوڈی کرنے اور کھال مرمت کرنے کے بعد وہ ڈیرے پر واپس آ کر الانی چارپائی پر لیٹ جاتے اور اگر چاچا ماسٹر کہیں گئے ہوتے تو اس سے باتیں کرتے رہتے لیکن اس روز وہ واپس تو آئے لیکن اپنی چارپائی سر پر اُٹھا کر کچھ کہے بغیر کماد کے کھیتوں کی طرف چلے گئے..

شام کو گھر آئے تو ان کی سیاہ پوش اولین بہو نے ان کے آگے تندور کی موٹی

روٹیاں اور دودھ کا کٹورا رکھا لیکن وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر خاموشی سے کوٹھے پر جا کر سو گئے..

پو اَجی پورا ہفتہ اُس سے دُور دُور رہے..

وہ سلام کرتا تو وہ جواب بھی نہ دیتے..

شاید چاچا ماسٹر درست کہتے تھے کہ ان کے دماغ میں کچھ خلل ہے.. ان کی بے اعتنائی سے اسے بہت دکھ ہوا.. اور وہ بھی ان سے کترانے لگا رُوٹھ سا گیا..

جمعہ کی سویر تھی...

خاور گھاس اور تریل کی ٹھنڈک میں نہر کے پانیوں کے پہلو میں نیم تاریک سویر میں اونگھتا تھا جب اسے "اول حمد خدا دی کریئے.." کے بول سنائی دیئے۔

وہ کُہنیوں سے ٹیک لگا کر ذرا اوپر ہوا پو اَجی اپنے گدھے کو نہلا رہے تھے۔

وہ ان سے ناراض تھا.. کہنیوں کو ڈھا کر پھر لیٹ گیا.. ان کی نظروں سے روپوش ہو گیا۔

"اوئے شہریے.. ناراض ہے؟"

"نہیں جی.." وہ فوراً خوش ہو گیا کہ پو اَجی راضی ہو گئے ہیں..

"میرے ساتھ چلے گا؟"

"کہاں پو اَجی.." وہ اپنے گوشے میں سے باہر آ گیا..

"اللہ لوک کے ڈیرے پر.."

"چاچا ماسٹر سے پوچھوں گا.. وہ اجازت دیں گے تو.."

"چُپ.." انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر غصے سے کہا "کسی سے کچھ نہیں کہنا.. تمہارا ماسٹر تو سمجھتا ہے کہ میرے دماک میں فتور ہے.. چُپ چپیتے چلنا ہے تو چل...."

"نہیں پو اَجی.."

"اوئے چل شہریے چل.." پو اَجی نے بے حد لجاجت سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا.. ان کے ریشمی جُبے پر اس کا منہ تھا اور وہ اس میں سے ایک عجیب مہک سونگھتا تھا "سن اور غور سے سن.. آج جمعہ کا دن ہے.. یہ آخری دن ہے اس دنیا کا.. یہ بشارت ہوئی ہے میرے اللہ لوک کو.. آج جمعے کی نماز کے بعد ایک اور طوفان نوح آئے گا اور کل جہان اس میں ڈوب جائے گا.. کوئی زندہ نہیں بچے گا.. شہریے تو میرے ساتھ چل میرے اللہ لوک کے ڈیرے پر.. تو بھی بچ جائے گا اللہ کے فضل سے.."

پو اُجی اُسے پہلے بتا تو چکے تھے کہ ایسا ہونے والا ہے لیکن اس نے یقین نہیں کیا تھا.. چاچا ماسٹر اپنے اباجی کو بہتر ہی جانتے ہوں گے اور شاید وہ تھوڑے بہت عمر کی وجہ سے شیدائی ہو گئے ہوں تو اس نے یقین نہیں کیا تھا لیکن اب معاملہ سنجیدہ لگتا تھا.. اس گاؤں کی ویرانی اور نامرادی نے اسے پہلے سے ہی ہول میں مبتلا کر رکھا تھا اب یہ حتمی خبر سن کر اس کے بدن میں ایک عجیب سنسناہٹ سی رینگی جیسے بڑے بڑے سیاہ چیونٹے اسے چمٹ گئے ہوں اور کاٹنے کو ہوں۔

"کیسے بچ جاؤں گا پو اُجی؟"

"صرف وہ لوگ بچ جائیں گے جو اللہ لوک کو مانتے ہیں اور میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

روشنی کی پہلی کرنوں نے اپنے حصے کا مخصوص پیوند نہر کے پانی سے الگ کیا اور وہ لشکنے لگا..

"پر کیسے بچ جائیں گے پو اُجی.."

"حضرت نوح علیہ السلام نے تو کشتی بنائی تھی ناں کیونکہ سیلاب نے آخر کار اتر جانا تھا.. جمعے والے سیلاب نے اترنا نہیں اس لیے میرے اللہ لوک کے ترکھان مریدوں نے لکڑی کا ایک ہوائی جہاز بنایا ہے.. آج جمعہ کی نماز کے بعد ہم سب اس میں بیٹھ جائیں گے ..پھر طوفان آئے گا... سب کچھ غرق ہو جائے گا لیکن وہ جہاز جس میں ہم سوار ہوں گے پہلے پانیوں پر تیرے گا پھر اڑ جائے گا.. اور صرف ہم بچ جائیں گے کُل خدائی میں سے.."

"وہ جہاز کہاں جائے گا پو اُجی.."

"یہ مجھے نہیں پتہ.. پر یہ پتہ ہے کہ اس روئے زمین پر صرف ہم ہوں گے جو زندہ بچ جائیں گے.. باقی سب ڈوب جائیں گے.. تو میرے ساتھ چل شہر یئے.."

"ماسٹر صاحب.."

"تو پھر نہ جا.." وہ جلال میں آ گئے' آنکھیں سرخ ہو گئیں "ڈوب جا طوفانِ نوح میں۔ اپنے ماسٹر سمیت.. نہ جا۔"

وہ منہ پھیر کر گدھے کو کنگھی کرنے لگے.. اس سے روٹھ گئے..

اس روز بھی انہوں نے اپنی آنکھوں میں خوب سلائیاں بھر بھر کر سُرمہ ڈالا.. عطر پھلیل کی پوری شیشی انڈیلی' نیا تہبند باندھا اور گدھے پر سوار ہو کر جانے سے پہلے صرف

اسے ناراض نظروں سے دیکھا اور پھر "چل وچھیرے" کہہ کر بڑے جوہڑ اور سانسیوں کی کھُھٹی سے پار ہو کر کھیتوں میں اوجھل ہو گئے..

ڈیرے پر.. الانی چارپائی پر.. گوٹھ مارے.. خاور حساب کے سوال حل کرنے کی کوشش میں جُتا رہا۔ لیکن ہندسے سمجھ میں نہیں آتے تھے آگے پیچھے ہو جاتے تھے جیسے تنکے ہوں اور ان کے پاس پانی آ گیا ہو اور وہ تیرنے لگے ہوں.. اس کا اندر بے چینی اور تشویش میں ڈوبا ہوا تھا.. اسے اس خیال نے بھی پریشان کیا کہ شہر میں اس کے ابا جان بھی ڈوب جائیں گے.. میں ان کو اطلاع کیسے کروں.. ڈاک کا لفافہ بھی نہیں ہے اور خط دیر سے پہنچے گا تب پہنچے گا جب وہ ڈوب چکے ہوں گے..

وہ ہول جو رسول پور کی ویرانی اس میں بھرتی تھی' دوپہر کے بعد.. جمعے کی نماز کے بعد.. دوچند ہوا.. ناقابلِ برداشت ہونے لگا.. وہ چارے اور گنے کے کھیتوں کو ایک سحر زدہ حالت میں تکتا رہا.. ذرا کوئی آواز آتی تو اسے اس میں پانی کی شور کر سنائی دیتی تھی۔ اسے پکّا یقین ہو چلا تھا کہ بس اب وہ وقت ہے جب گنے کی گھنی فصل میں سے پانی کا ایک ریلا نمودار ہو گا.. وہ اتنا بلند ہو گا کہ شیشم کے یہ پانچ درخت اس میں ڈوب جائیں گے.. جس چارپائی پر وہ بیٹھا ہے وہ پانی کے دوش پر اٹھتی ہوئی درختوں کے آخری پتوں کی بلندی پر پہنچ جائے گی اور پھر اس کے سمیت وہ ڈوب جائے گا.. اور ڈوبنے سے پہلے اسے آخری خیال یہ آئے گا کہ کیا پو اُجی نے جہاز میں اپنے گدھے کو بھی بٹھایا ہے یا اسے پیچھے چھوڑ گئے ہیں..

لیکن کچھ بھی نہ ہوا.. سوائے اس کے کہ چتکبرا بُولی بہت دیر تک بھونکتا رہا..

شام ڈھلی تو وہ جوہڑ کے کنارے کیکر کے ٹُنڈ پر جا بیٹھا.. رات ہو گئی.. رات بہت ہو گئی..

پھر سانسیوں کی کھُھٹی کے کتے بھونکے.. خاور نے انہیں الگ الگ سنا.. لیکن اس میں چتکبرے بولی کے بھونکنے کی آواز شامل نہ تھی..

گھُپ اندھیرے میں ٹرّاتے مینڈکوں اور غُل مچاتے جھینگروں میں.. وہ کان لگائے بیٹھا رہا کہ ابھی "اول حمد الٰہی کریئے.. سنائی دے گی.. کچھ بھی سنائی نہ دیا..

چند لمحوں بعد اسے گدھے کے کان دکھائی دیئے..

پھر پو اُجی..

لیکن وہ سر جھکائے چُپ بیٹھے گدھے کی حرکت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہلتے چلے آ

رہے تھے.. آج وہ حضرت عیسیٰ کے روپ میں نظر نہیں آ رہے تھے..

"پو اَجی.." وہ کود کر نیچے آیا.. لیکن انہوں نے گدھے کا روکا نہیں رُوک کر اسے اپنی گود میں نہیں بٹھایا.. اس کی جانب نگاہ بھی نہیں کی.. اسی طرح آہستہ آہستہ گدھے کی حرکت کے ساتھ ہلتے ہلتے اندھیرے میں چلے گئے..

تین روز بعد پو اَجی مر گئے..

ان کی قبر پر جب مٹی ڈالی جا رہی تھی تو اس میں بڑے بڑے مکوڑے سیاہ مرچوں کی طرح ملے ہوئے تھے.. کدال پر جتنی مٹی ہوتی تھی اتنے ہی مکوڑے اس میں کلبلاتے تھے.. قبر تیار ہو گئی تو وہ مٹی میں جذب ہوتے گئے.. پو اَجی کا بدن تو بہت لشکیلا اور ملائم ہے اسے یہ کیسے کھائیں گے.. دو ماہ بعد جب اس کی ورنیکلر فائنل کی قید ختم ہوئی.. گرمیوں کی چھٹیوں کا اختتام ہونے کو آیا تو چاچا ماسٹر نے ایک مقامی کمہار کے سر پر اس کا سیاہ سوٹ کیس رکھ دیا جس کی تہہ میں بچھا اخبار بھورا ہو چکا تھا اور اس میں بسکٹوں کا ایک خالی ڈبہ تھا اور اسے ہدایت کی کہ چھوٹے شاہ صاحب کو ملکھووال جا کر بس پر بٹھا دے.. اگرچہ یہ بھی ایک ویران اور نادار دوپہر تھی لیکن وہ اپنے شہر.. اپنے گھر جانے کے چاؤ میں کمہار کے پیچھے پیچھے ایک ٹڈے کی طرح پھدکتا چلا جا رہا تھا..

آٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پگڈنڈی کے دائیں طرف وسیع کلر زدہ ویرانے میں ایک بڑی محراب کے آثار دکھائی دیے جس کے برابر میں مٹی اور گارے سے بنی ہوئی دو کوٹھڑیوں کی چند دیواریں تھی.. چھتیں بھادوں کی بارشوں سے ڈھے چکی تھیں اور ان سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر کلر سے سفید ہوتی.. پپڑیوں سے بھری پیاسی زمین پر ایک عجیب بے ہنگم سی شے کھڑی تھی.. شیشم کے تنے کو کھود کر ایک کُھرلی سی بنا کر اس کے آگے دو تختے یوں ٹھونکے گئے تھے کہ وہ ایک صلیب کی صورت نظر آتے تھے..

سوٹ کیس بردار کمہار رک گیا "شاہ جی خیر سے یہی وہ جہاز ہے جس میں سوار ہو کر اللہ لوک کے مریدوں نے اڑ جانا تھا.. جمعہ کی نماز کے بعد اس میں بیٹھ گئے کہ ابھی آیا سیلاب اور شام تک مغرب کی نماز تک بیٹھے رہے پگڑیاں گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر.. پاگل کے بچے.. بھلا لکڑی کا جہاز بھی اڑ سکتا ہے.."

لکڑی کا جہاز اڑ رہا تھا سندھ کے پانیوں پر جو آسمان تھا جسے ابھی ابھی ایک سُرخاب

نے خالی کیا تھا لکڑی کا ایک جہاز اڑ رہا تھا..

اور پو اَجی اُس میں اپنے مکھن ملائم بدن کے ساتھ گھٹنے جوڑے انہیں اپنی سفید پگڑی سے باندھے بیٹھے تھے.. ان کی سفید لٹیں اس آہستگی کے ساتھ جس آہستگی کے ساتھ جہاز جا رہا تھا ہوا میں اٹھتی تھیں اور جب ان پر ڈھلتے سورج کی کرنیں پڑتی تھیں تو نیلے آسمان کے پانیوں میں جیسے ایک چمکیلا پیوند نمودار ہو جاتا تھا..

لکڑی کا جہاز سندھ کے ریتلے ناپو کے اوپر سے گذرتا تھا.. اور پو اَجی جیسے سنگ مرمر کا ایک مجسمہ ہوں.. حنوط ہو گئے ہوں.. ایسے بے حس و حرکت.. سکوت میں بیٹھے تھے اور نیچے نہ دیکھتے تھے.. نیچے اُن کا شہر یا بھی لکڑی کے ایک جہاز میں سوار تھا.. عمر' محبت اور بے گھری کے طوفان نوح سے بچنے کے لئے.. اس کے ماضی میں جتنے بھی چتکبرے بُولی تھے اُن سے پیچھا چھڑا کر وہ اس جہاز میں آ بیٹھا تھا..

لیکن پو اَجی تو نیچے دیکھتے نہ تھے..

چائے کا آخری گھونٹ ٹھنڈا یخ تھا..

سرور آنکھیں ملتا.. اوپر سورج کے ڈھلنے کا اندازہ لگاتا کشتی سے باہر آ گیا..

"سائیں رات کرنے کے لئے ڈیرہ ادھر ڈالیں گے یا تھوڑا آگے چلیں.."

"آگے چلیں.." خاور نے تادیر بیٹھے رہنے سے ریت میں دھنسے وجود کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا "ادھر تو اوپر سے جہاز گذرتے ہیں سرور.. آگے چلیں"

"جہاز سائیں؟"

"ہاں.." اس نے سر اٹھا کر پھر اوپر دیکھا.. لکڑی کا جہاز اب بھی خالی آسمان میں سستی سے اڑتا تھا اور پو اَجی کے لمبے بال نیلاہٹ کے پس منظر میں سفید لہروں کی مانند آہستگی سے حرکت کرتے تھے "اوپر دیکھو.."

سرور نے آنکھوں کے سامنے ہتھیلی جما کر اوپر دیکھا نظروں سے آسمان کھنگالا "اوپر تو سائیں ایک دریائی عقاب اڑتا ہے جس کی چونچ میں ایک بہت بھاری مچھلی ہے.. جہاز نہیں.. جہاز بھلا چونچ میں مچھلی دبوچ کر اڑتا ہے.. دھوپ میں پوری دوپہر بیٹھے رہے ہو تو اس کا کچھ اثر ہو گیا ہے سائیں.. آگے چلتے ہیں.."

شام ہونے لگی..

ایک اور شام ہونے لگی..

اس کے سلیپنگ بیگ میں ایک عجیب ناگوار سی گیلی مہک تھی.. مکھی اس پر لیٹی رہی تھی.. دو پاؤں جو جعفر کے تھے کشتی کے چوڑے کنارے پر دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

کشتی بے آواز تیرتی تھی..

سلیپنگ بیگ پر لیٹا خاور ابھی تک پو اُجی کے لکڑی کے جہاز کو دیکھتا تھا.. وہ تنہا بیٹھے تھے ان کے ہمراہ نہ اللہ لوک تھا اور نہ کوئی مرید.. وہ بالکل اکیلے تھے.. اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے گدھے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے.. اگر اس روز وہ ان کا کہا مان لیتا ان کے ساتھ چلا جاتا تو وہ بھی آج ان کے ساتھ بیٹھا ہوتا.. اسے ایک اپنا جہاز بنانے کے حاجت پیش نہ آتی.. وہ نیچے نہیں دیکھتے تھے.. اگر دیکھتے تو وہ انہیں ہاتھ ہلا کر کہتا.. پو اُجی میں یہاں ہوں.. انہیں خبردار کرتا کہ سیاہ موٹے مکوڑے مٹی میں جذب ہو کر ان کے ریشمی بدن کو کھانے کے لئے آنے والے ہیں.. لیکن وہ نیچے نہیں دیکھتے تھے.. وہ اپنے گدھے کے پیچھے چھوڑ آئے تھے.. خاور مسکرانے لگا..

باہر کشتی کے کنارے پر جعفر کے دو پاؤں دوڑتے نظر آتے تھے.. یقیناً ان کے اوپر ماماں جعفر کا سیاہ دھڑ بھی تھا.. آسانی سے گنی جا سکنے والی مہین پسلیاں بھی تھیں.. چمکتی ٹوٹی بھری آنکھیں اور وہ لنگی بھی تھی جو اس کے درمیانی وجود کو چھپاتی نہ تھی کہ وہ ایک قدیم منہ زور جنور کا بدن تھا جو چھپ نہیں سکتا تھا.. اور اسے چھپانے کی سعی کرتی ایک لنگی بے سود ٹھہرتی تھی..

جعفر کی انگلیاں سندھ کے سینے میں اترتے بانس پر سیاہ کیکڑوں کی طرح پیوست تھیں اس سے چمٹی ہوئی تھیں جونکوں کی مانند.. بانس دریا کی تہہ میں ٹھوکر کھا کر مضبوط ہو کر سیدھا ہوتا تھا اور جعفر کے جنور بجنے کے زور سے کشتی آگے آگے جاتی چلی جاتی تھی۔

ایک اور شام تھی..

بارہ کہو کی پہاڑیوں پر بھی ایک اور اترتی شام تھی..

بڑے پتھر کی کھوہ میں اس کے لئے چکن سینڈوچ اور مشروب تھے اور غلافی آنکھیں اس شام کو اپنے اندر جذب کر کے سیال ہوتی تھیں..

کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹنگا سورج ساتوں آئینوں میں اترتی شام کی خبر کرتا تھا۔

بہت سی شامیں گذر چکی تھیں لیکن یہ ایک اور شام تھی..

وہ نہر کنارے گھاس اور تریل کی ٹھنڈک میں اونگھ گیا تھا اور سویر کی بجائے شام آ گئی تھی..

اس نے کہنیاں ٹکا کر اپنے آپ کو اونچا کیا جیسے "اول حمد خدا دی کریئے.." کہیں سے سنائی دیا ہو اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا.. جعفر کے پاؤں مسلسل کناروں پر حرکت کرتے تھے اور ان سے پرے سندھ ایک سرمئی سپاٹ صحرا کی مانند خاموشی میں تھا.. تھما ہوا اور سانس روکے ہوئے تھا..

اس نے چوبی پلیٹ فارم پر تب ہاتھ رکھا جب جعفر کے پاؤں اس پر سے گذر گئے.. جب واپس آئے تو اس کے ہاتھ کو راستے میں پڑا دیکھا تو وہ رک گیا "باہر آؤ گے سائیں؟"

"ہاں.."

"تو آؤ.." جعفر کا ہاتھ نیچے آیا.. جسے تھام کر اس نے پلیٹ فارم پر ایک پاؤں جمایا اور پھر زور لگا کر باہر عرشے پر آ گیا.. باہر منظر ہی الگ تھے.. ٹھہرے ہوئے سحر سے پھونکے ہوئے.. وہ کشتی کی نوک سے ذرا ادھر جہاں جعفر کا جال پڑا تھا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر مسافت کی ہوا چھلنے لگی..

ہر شے ہر وجود ایک خلائی سکون میں خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔ چپ اور

گنگ.. جیسے وہ کسی ایسے سیارے میں اتر رہے ہوں جہاں ہوا کا ایک سانس بھی نہیں تھا۔ جنگل بیلے.. دور کنارے.. سروٹ اور بلند گھاس.. پانیوں کی کُل دنیا سب ایک سرمئی آہستگی کے سفر میں ایک ہو رہے تھے..

وہ بھول چکے تھے کہ رات کے پڑاؤ کے لیے کسی مناسب ٹاپو یا جزیرے کو ابھی تلاش کرنا ہے اور اس بے آواز خلا میں دم روکے بہتے جا رہے تھے.. کشتی جس منظر کو خالی کر کے آگے بڑھتی تھی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے وہ بھی اس سرمئی سناٹے میں گم ہو رہا تھا۔ لیکن شام جو اترتی تھی اس میں دائیں جانب 'سندھ کے پھیلاؤ اور ریتلے کناروں کی وسعت کے پار.. بہت طویل فاصلوں پر.. شاید سینکڑوں کوس کے فاصلے پر جو منظر تھا وہ اس سرمئی سناٹے سے بالکل جدا تھا.. وہاں بہت دور ایک سپاٹ افق تھا جہاں سورج مدھم ہو کر بجھتا ہوا نیچے جا رہا تھا.. اور ایک وسیع پھیلاؤ والے تنہا بادل کے سیاہ جال کے اندر اترتا نظر آ رہا تھا.. اس کے زوال کی مدھم روشنیاں پھیل کر جال میں سے فرار ہو کر باہر نکلتے ہی دم توڑتی تھیں.. کوئی ایک لمحہ آیا جب غروب کے اس پس منظر میں سے کوہ سلمان کے دور افتادہ سیاہ کوہان نما پہاڑ اور بلندیاں جیسے غیب سے ظاہر ہونے لگے.. فنا سے وجود میں آنے لگے.. دکھائی دینے لگے.. ابھی وہ مقام خالی اور تاریک تھا لیکن غروب کی کرنوں کا کوئی بھولا بھٹکا زاویہ ان پر ایسے وارد ہوا کہ کوہ سلمان سمندر میں سے یکدم ابھرنے والے بے نام جزیروں کی طرح افق پر جگہ جگہ ظاہر ہونے لگا.. صرف ایک وسیع بادل تھا جس نے ڈوبتے سورج کو اپنے جال میں روپوش کر رکھا تھا اور اس بادل کے کونوں کھدروں میں سے فرار ہونے والی ہلکی زرد.. پگھلتے سونے کی رنگت ایسی روشنی اس پہاڑی سلسلے کے سیاہ کوہانوں کو افق پر نمایاں کر رہی تھی..

یہ کوئی ایسا بالی جزیرہ دکھائی دے رہا تھا جو بحرالکاہل میں قرنوں سے...... بھوکے پیاسے نڈھال آوارہ گرد ملاح کو یکدم سمندر پر معلق گہری دھند میں سے جھلک دکھلاتا ہے اور وہ "بالی ہائے.. بالی ہائے" پکار اٹھتا ہے..

یہ کسی لاکھوں برس پیشتر کے گم شدہ عہد کی تصویر تھی..

ابھی انسان نے اس زمین کو آلودہ نہیں کیا تھا اور منظر بے جھجک تھے..

یہ کسی کوہ طور کا سلسلہ تھا جو ایک معجزے کی طرح عارضی طور پر یکدم وجود میں آ گیا تھا.. جھاڑی کے اندر سے نور کی جن شعاعوں نے موسیٰ سے کلام کیا تھا بس وہی اس سیاہ

بادل میں سے پھوٹتی تھیں..

اس سحر افروز منظر کا اظہار حیرت کے سوا بھی ہونا چاہیے.. حیرت کے سوا اظہار کا واحد ذریعہ حواس کو تیاگ دینا ہے.. ایسے کہ انسان اس انہونے طلسم کو دیکھ کر پانی میں چھلانگ لگا دے.. اور ڈوب جائے.. نہ ڈوبے تو ابھر کر ایک ڈولفن کی طرح سیٹیاں بجانے لگے اور یوں اپنی مسرت کا اظہار کرے.. یا بہاؤ میں تیرتی کسی مچھلی کی دُم پکڑ کر کوئی فلمی گیت گانے لگے.. یا پھر اتنا تو کرے کہ جعفر یا سرور کو دبوچ کر انہیں چومنے لگے.. حیرت کے سوا کچھ اور کرے.. اور چونکہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتا تھا اس لیے ذہنی طور پر پسماندہ ایک بچے کی مانند منہ کھولے 'ہونٹ ڈھیلے چھوڑے 'ایسے کہ اس کے ہونٹوں کے کونوں سے لعاب بہہ کر اس کے رخساروں پر اترتا ہو اور وہ بے خبر رہے.. وہ اس منظر کو تکتا رہا.. سکوت کی ٹھنڈک میں سکڑتا رہا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اس منظر کی بے یقینی ایک سرد لہر کی طرح ٹھٹھرتی سرایت کرتی رہی اور وہ منہ کھولے اسے دیکھتا رہا..

سیاہ جال میں اترا ہوا سورج اسی حجاب میں پوشیدہ کوہ سلمان میں اتر گیا اور پھر نہ پری رہی.. رہی تو بے خبری رہی..

ماماں جعفر اس سے بے خبر کشتی کے کنارے پر دوڑتا.. بانس کو پانیوں میں اتارتا اس شام میں اترتا تھا..

کشتی کی روانی میں رکاوٹ کے آثار دھچکوں کی صورت میں ظاہر ہونے لگے۔

کنارے کی قربت سے اس کا نچلا دھڑ تہہ کی ریت میں دھنستا تھا..

دونوں پاؤں جب آگے پیچھے حرکت کرتے.. ایک مرتبہ پھر کشتی کے پچھلے حصے تک گئے تو پھر اطمینان میں چلتے ہوئے واپس آئے اور عرشے پر ساکت ہو گئے۔ جعفر نے بانس کو پانی میں سے نکالا اور خاموش کھڑا ہو گیا.. کشتی خود بخود کنارے سے لگنے لگی.. اس نے بالآخر ایک ہوکا سا بھرا اور رک گئی..

تمام نبضیں پانی کی.. روانی اور بہاؤ کی ختم گئیں..

"ادھر پڑاؤ کریں گے سائیں.." جعفر نے فیصلہ کن انداز میں اسے اطلاع دے دی.. وہ آلتی پالتی مارے بہت دیر تک بیٹھا رہا تھا اس لیے جب اٹھا تو اس کے گھٹنوں میں درد کی ایک سرسراہٹ سی ہوئی.. کمر پر ایک بوجھ سا بھاری ہوا.. اور وہ ایک ہاتھ دائیں گھٹنے پر

جما کر اور دوسرے سے اپنی بوجھل کمر کو سہارا دے کر اٹھا اور جعفر جو کشتی رکتے ہی ایک مینڈک کی طرح اچھل کر کنارے پر جا چکا تھا اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا.. جعفر نے اس کے ہاتھ کو اپنے سکڑے ہوئے مینڈک پنجے میں جکڑا اور وہ گرتا پڑتا کنارے کی ریت پر آ گرا..

"سامان اتاریں گے سائیں.." جعفر نے پوچھا..

کوہ سلمان کا بالی جزیرہ نیم تاریکی میں غرق ہو چکا تھا.. سمندر میں پھر سے روپوش ہو چکا تھا اور اب وہاں ایک سپاٹ اور چند لمحوں میں مکمل تاریکی میں اتر جانے والا ایک سپاٹ اور بے روح افق تھا۔ خاور کے سامنے ایک وسیع ریتلا علاقہ اگرچہ سندھ کی مختلف شاخوں میں گھرا ہوا تھا لیکن ایک بے آباد صحرا کی طرح حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے پار پانیوں کی کوئی لکیر نظر نہ آتی تھی.. دریا کے کوئی آثار نہ تھے.. ریت میں کہیں کہیں جھاڑیاں اور بے نام سے بوٹے تھے اور ان درختوں کی سوکھی ہوئی ٹہنیاں اور تنے ابھرتے تھے جو پانی میں بہتے ہوئے آئے اور کناروں کے ساتھ لگ کر پانی کے اترنے سے دریا سے دور صحرا میں کھو گئے..

وہ کشتی سے منہ موڑ کر شام کے اس بے انت صحرا میں چلنے لگا جس میں ایک عجیب سی کشش اور انجانے بلاوے تھے..

اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ اس کی کشتی کس مقام پر آ کر رکی ہے.. وہ ریت میں سے پاؤں اکھاڑتا اپنی کمر پر ہاتھ رکھے۔ گھٹنوں کے درد کی یکدم واپسی کے لیے تیار.. آہستہ آہستہ چلتا گیا.. اور جب اس نے آخر کار مڑ کر دیکھا تو کشتی کسی ریتلے ابھار کے پیچھے روپوش ہو چکی تھی۔

یہ فرار ہی اس کے روگ کا علاج تھا..

یہی اس کے اندر کی تمنا تھی..

کم از کم اس ریتلی تنہائی میں اس ایک اور شام میں.. بل ڈوزر کی مہیب گڑگڑاہٹ داخل نہیں ہو سکتی تھی.. اس کے ایک عفریت کی مانند منہ کھولے بلیڈ اس کے کتب خانے کو' مسودوں اور نایاب تصاویر کو.. اس کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھے لیمپ کو.. اس کے ٹوتھ برش اور آفٹر شیو لوشن کو.. ہیئر کلر کی ٹیوب اور ریزر کو.. نگل نہیں سکتے تھے.. اس کی حیاتی کو مسمار نہیں کر سکتے تھے.. وہ یہاں محفوظ تھا.. ایک ایسے گھر میں تھا جسے کوئی نہیں گرا سکتا تھا۔

یہاں وہ خلائی آنکھوں کی کوٹھڑی کی قید میں بھی نہ تھا..

اسے عابدہ سومرو کے بدن کے نیلے دھبے اور کھر ینڈ بھی نہیں ستاتے تھے..

بس وہ تھا.. اور قدموں تلے کھسکتی ریت اور چپ تھی.. ایک اور شام تھی اور ریتلے ابھار کے عقب میں کسی کشتی کا وجود نہ تھا..

ٹن ٹن ٹن..

جو خاموشی تھی اس میں سے گھنٹیوں کی آوازیں تیرتی.. اٹکتی.. اس کے کانوں تک آئیں۔ وہ رک گیا۔

جو نبضیں تھم چکی تھیں.. ان کی مردہ خاموشی میں سندھ کے جو پانی نظر نہیں آتے تھے ان پر سفر کرتیں وہ آوازیں آنے لگیں..

گھنٹیوں کا ایک مترنم آرکسٹرا تھا جو ریت کے ہر ذرے میں کھنکنے لگا..

ٹن.. ٹن.. ٹن..

ہر گھنٹی کی ٹن سے ایک مندر ناپو کی ریت پر ابھرتا تھا..

یہ آوازیں اتنی بلند تھیں کہ افق میں روپوش ہو چکے کوہ سلمان کے کنگروں پر دستک دیتی تھیں اور اتنی مدھم اور سریلی بھی تھیں کہ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور اتنی پر تاثیر تھیں کہ سندھ کے پانیوں کی گہرائی میں جتنی مچھلیاں تھیں ان کے گلپھڑوں پر اثر کرتی تھیں اور ہر اس اندھی ڈولفن کو جو پانیوں کے اندر تھی یا ان کے باہر سانس لینے کو آتی تھی اسے اپنے ترنم سے بینائی دیتی تھیں۔

یہی کل کائنات تھی..

جس کائنات میں وہ تھا۔ ریت کے وسیع علاقے میں.. ایک دشت کے پھیلاؤ میں.. جہاں سبز گھاس کے چھدرے تنکے کہیں کہیں نمودار ہو کر سر اٹھاتے تھے.. اس کے قدم ریت میں دھنستے تو کتنے تنکے اس کے جاگرز تلے آ کر ریت میں دب جاتے..

اس کل کائنات میں گھنٹیوں کی سریلی صدائیں گونج رہی تھیں۔

سب کے سب مندر ویران پڑے تھے اور ان کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور صرف وہ ایک پجاری تھا جو انہیں سن رہا تھا۔

سریلی صداؤں کی گونج آنکھوں سے اوجھل پانیوں پر سے گزرتے ہوئے دوچند ہوتی.. ریت کے بے انت پھیلاؤ پر پھیلتی اور اسے مسخر کرتی تھی..

یہ حواس کو مکمل طور پر کھو دینے کی دلیل تھی.. ورنہ غازی گھاٹ سے طویل آبی مسافتوں پر.. سندھ کے کسی بے نام جزیرے کی شام میں.. وہ کونسا موتزارٹ تھا جو پیانو بجا رہا تھا۔ کون بیتھوون تھا جو مون لائٹ سناٹا کی دھن چھیڑ رہا تھا اور کیسا خورشید انور تھا جو ''گھونگھٹ'' کی آسیب زدہ گھنٹیاں کمپوز کرتا تھا.. کوئی نہ جانے کب آئے.. جنم جنم کی پیاس بجھائے.. کوئی آئے..

جعفر اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا.. اور وہ بے خبر رہا تھا.. اس کے سیاہ پاؤں ریت میں دھنستے نہ تھے وہ ایسے چلا آتا تھا جیسے اس کے قدموں تلے ایک فرشِ مخمل ہو۔

نم آلود شام کی ہوا میں اس نے اس کے قریب پہنچ کر ایک گہرا سانس لیا۔

''سائیں ہسندھ کے کناروں پر.. شام ڈھلتی ہے تو مویشی پانی پینے کے لیے اترتے ہیں۔ تو ان کے گلے میں بندھی گھنٹیاں پانیوں پر تیرتی ہیں۔ دور تک جاتی ہیں آپ سُنتے ہو سائیں۔''

''ہاں جعفر.. میں سنتا ہوں۔''

''شام ہوتی ہے ناں سائیں.. تو ادھر جو دھن وال ہیں ان کے کچے ڈیروں میں سے مویشی چلتے ہیں اور دریا کے کناروں تک آتے ہیں تو یہ ان کا بلاوا ہے.. سُنتے ہو سائیں؟''

''ہاں..''

''یہاں سے تو کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ مویشی دور ہیں اور اوجھل ہیں.. پر گھنٹیوں کا بلاوا... پانی پر چلتا آتا ہے تو نزدیک لگتے ہیں پر بہت دور ہیں...''

وہ کان لگائے دھیان لگائے سنتا رہا.. سندھ کے مندر میں لگاتار گھنٹیاں بجتی تھیں.. ان میں کلیسائیوں کی گھڑیال گونج نہ تھی بلکہ ایک آہستہ اور نسوانی ترنم تھا.. پھر ان کے مدھر پن اور آوازوں کی مدت میں وقفہ آنے لگا.. ترنم اب اٹک رہا تھا.. رک رک کر آتا تھا.. وقفے کی مدت طویل ہونے لگی اور بہت دیر بعد کسی ایک گھنٹی کی آواز آجاتی جیسے اسے خاموش رہتے ہوئے یکدم خیال آگیا ہو کہ اس نے دریا پار کسی منتظر کان کو ایک آخری سندیسہ بھیجنا ہے.. گھنٹیوں کی اس گھنٹی بجانے والے سازندوں نے اپنے ساز رکھ دیئے تھے.. سندھ کی نبض پھر سے تھم گئی.. سناٹے کو واپس آنے میں کچھ دیر لگی اور جب وہ اس کے آس پاس پھر سے اتر گیا تو بہاؤ کی مدھم لَے سنائی دینے لگی..

''مویشی پانی پی کر اپنے باڑے کو لوٹ گئے ہیں سائیں.. رات ادھر کریں گے ناں سائیں؟''

اس ٹاپو کے پار جس کے پیچھے وہ روپوش ہو گئی تھی وہ گئے تو کشتی ایک کھلونے کی طرح ریت میں رکی ہوئی نظر آنے لگی.. جیسے کوئی جہاز مدوجذر کے زور سے خشکی پر آگیا ہو اور پانی سمٹ کر واپس چلے گئے ہوں.. ایسے وہ ایک طویل فاصلے سے.. یہاں سے دکھائی دی.. اوڈیسیس کی کشتی کے روپ میں.. سنہری کھال کی تلاش میں سرگرداں سحر طراز سمندروں میں نہیں.. لیکن خاور 'اوڈیسیس' کی مانند بامقصد اور پختہ ارادہ رکھنے والا شخص نہیں تھا.. وہ کسی سنہری کھال کی تلاش میں نہیں تھا.. یہ ایک بے وجہ بے جواز اور بے مقصد سفر تھا..

''پھر سائیں آپ حکم کرو..''

''ٹھیک ہے رات ادھر کریں گے.. تم جا کر سامان نکالو.. میں آجاؤں گا..''

جعفر کے چہرے پر اطمینان آگیا ''جا کر نکالتا ہوں سائیں.. سرور کو بولتا ہوں کہ آپ کا تنبو لگائے.. اور فہیم کو کہتا ہوں کہ کھانے کی دیگچی چڑھائے.. آپ آرام سے آجانا''

وہ پلٹا اور ریت کو روندتا اس پر ایک سنگ مرمر کے فرش کی طرح چلتا کشتی کی جانب چلنے لگا۔

ریتلی کائنات مکمل سناٹے میں چلی گئی جس میں صرف اس کا سانس چلتا تھا.. یہ تنہائی اتنی بڑی تھی کہ وہ اسے سنبھال نہیں سکتا تھا۔

بُل ڈوزر کے بلیڈ نے صرف اس کتابوں اور ٹوتھ برش اور لیمپ کو ہی نہیں اس کی زندگی کو بھی اور اسے بھی مسمار کر دیا تھا..

دور ریت کی ایک طویل مسافت کے پار کھلونا دکھائی دیتی بڑی تنہائی میں چھوٹی سی کشتی میں سے سرور اور جعفر اس کا سامان نکال کر کنارے کی ریت پر ڈھیر کر رہے تھے.. اور وہ اتنی دور تھے کہ مکوڑے سے لگتے تھے جو رینگ رہے تھے.. کشتی کے کھلونے میں سے دو بونے نکلتے تھے اور کنارے پر جھک کر واپس چلے جاتے تھے..

ابھی کچھ روشنی تھی۔

وہ بہت دور.. بُت بنا بغیر کسی احساس کے.. مقصد کے.. وہاں اس سناٹے کی کوکھ میں کھڑا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ وہ دو بونے اب کشتی کے اندر واپس نہیں جاتے.. مکوڑے اس کے آس پاس رینگ رہے ہیں تو وہ ان کی جانب چلنے کو تھا کہ اس کے کانوں میں نامانوس سی آوازیں ایک تواتر کے ساتھ آسمان سے اترنے لگیں.. بہاؤ کی ہلکی سرسراہٹ اور ہوا کی نامعلوم مسافت پر حاوی ہوتی.. جیسے کہیں بہت سارے کوّے بولتے ہوں.. اس نے سر اٹھا کر نظروں

سے بڑی تنہائی والے بڑے آسمان کی خالی وسعت کو کھنگالا یہ تعین کرنے کے لئے کہ یہ آوازیں کدھر سے اتر رہی ہیں.. ان کا منبع کہاں ہے.. جنوب کی جانب.. ابھی کچھ روشنی تھی اگرچہ شام کا غلبہ مکمل ہونے کو تھا.. جنوب کے آسمان پر اس کے خالی پن اور سپاٹ وجود میں ایک سیاہی سی تیرتی تھی.. جو لحہ بہ لحہ بلندی کو کم کرتی نیچے آتی تھی اور جب اس کے نقش واضح ہوتے تو سیاہی کی وہ لکیر ٹوٹنے لگی اور چھوٹے چھوٹے سیاہ دھاگوں میں بٹنے لگی.. پھر ان دھاگوں کو پَر لگے اور وہ الگ الگ اڑتے دکھائی دینے لگے.. پرندوں کی ایک ڈار تھی..

نیچے اترتی.. تیزی سے بلندی کم کرتی.. کووں کی آوازوں میں غل کرتی.. ریتلے ٹاپو کی جانب چونچیں نیچے کئے..

اور صرف وہی ایک ڈار نہ تھی۔

اس کے کچھ فاصلے پر.. اس کے پیچھے پیچھے پرواز کرتا پرَوں کا ایک اور ہجوم تھا.. ایک اور ڈار تھی.. اس کے دائیں اور بائیں جانب سے بھی ہزاروں پرندے اس کی پیروی کرتے چلے آتے تھے اور کووں کی طرح شور مچاتے آتے تھے.. وہ بے انت اور بے حساب تھے.. جو راہنما ڈار تھی وہ نہایت منظم ترتیب سے ایک ہراول دستے کے طور پر انہیں راستہ دکھا رہی تھی اور سب سے بلند آہنگ اسی کی کائیں کائیں تھی..

پہلی ڈار بہت نیچے آ گئی.. اتنی قریب کہ وہ اس میں شامل ایک ایک پرندے کی آنکھ دیکھ سکتا تھا.. اس کے پَر شمار کر سکتا تھا.. وہ اتنی قریب آ چکی تھی.. لیکن یکدم ہر پرندہ ٹھٹکا.. انہوں نے اس کے سر کے عین اوپر آ کر اپنی پرواز کا چکر مکمل کیا اور پھر رخ بدل کر شور مچاتے پلٹ گئے اور جس لمحے وہ یکدم پلٹے تو پہلے وہ شام میں نیم سیاہ دکھائی دیتے تھے اور اب پلٹنے سے رخ بدلنے سے وہ غروب کی چند کرنوں کی زد میں آ گئے اور ان میں سے ہر پرندے کا وجود سنہری ہو گیا.. ایک ایک پَر سونے میں ڈھل گیا..

ان کے عقب میں آنے والی ڈار نے جب انہیں ارادہ بدل کر پلٹتے دیکھا تو وہ بھی اپنے پَروں کو ترچھا کرنے لگی اور ان پر بھی سونا نچھاور ہونے لگا..

وہ دم بخود کھڑا رہا.. گردن اوپر دیکھتے دیکھتے دکھنے لگی.. آج تک اس نے اتنے پرندے اتنی بڑی تعداد میں قدرت کے اس نظام میں جو صرف ان کے لئے تخلیق کیا گیا تھا اڑتے ہوئے نہیں دیکھے تھے..

"سائیں سامان اتر گیا ہے.. فہیم مرغی بھونتا ہے.." جعفر اس کی آسمان پر جمی نظروں کے دامن میں چلتا ہوا اس کے پاس آ چکا تھا اس لئے وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔

"جعفر نے بھی اس کی نظروں کی پیروی کرتے ہوئے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور وہی دیکھا جو وہ دیکھ رہا تھا اور کہنے لگا.. "سائیں منگھ دیکھتے ہو؟"

اس نے سر نیچے کیا تو اس کی گردن دکھی.. اور اسے جعفر سامنے کھڑا نظر آیا "منگھ؟"

"یہی جو پنکھ پکھیرو دیکھتے ہو یہ منگھ ہیں.. یہ ہمارے سندھ سائیں کی پناہ میں آتے ہیں چار دیہاڑے پالے کے دن کاٹنے.. یہاں سے بہت آگے جاتے ہیں اور پھر ان دنوں اپنے دیسوں کو لوٹنے کے لیے واپسی کا سفر کرتے ہیں.. ادھر اس علاقے میں اس ٹاپو پر رات کر کے آگے جاتے ہیں۔ یہ ان کی چراگاہ ہے سائیں۔ یہ گھاس کے تنکے نہیں دیکھتے.. ان کو چگتے ہیں اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور اگلی سویر کوچ کر جاتے ہیں اپنے وطنوں کو.."

"انہیں آپ منگھ بولتے ہو؟"

"جی سائیں.. لیکن جو شہر والے ادھر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ہنس ہیں۔"

"ہنس؟"

"ہاں سائیں.."

"یہ کووں کی طرح شور مچا رہے ہیں.."

"ہاں سائیں شور تو کریں گے ناں غریب پردیسی.. آپ اپنے گھر میں کسی غیر کو دیکھو گے تو شور تو مچاؤ گے ناں.. اچھا تو نہیں لگے گا آپ کو.. ان کو عادت نہیں ہے ناں کہ سارا دن اڑنے کے بعد رات کرنے کو اپنی چراگاہ کے اوپر آئیں تو اس ویران ٹاپو پر کوئی غیر بندہ بشر کھڑا ہو.. آپ غیر ہو ناں سائیں تو یہ غریب شور مچاتے ہیں بے چارے پردیسی کہ یہ کون ہے اور ہمارے ٹاپو پر کیوں آیا ہے.."

"تو یہ اب یہاں نہیں اتریں گے؟"

"نہ سائیں.."

"تو کدھر جائیں گے؟"

"ان کو شور کرنے دو سائیں.. یہ ابھی تھک ہار کر کہیں اور جا کر رات کر لیں گے.. ادھر اور بھی جگہیں ہیں.. میں نے سامان نکال لیا ہے.." جعفر ابھی تک پلٹتے اور پھر

واپس آتے ہنسوں کے شور مچاتے ہجوم سے غافل ہو گیا۔ "فہیم نے چولہا گرم کر دیا ہے اور ماماں جعفر کہتا ہے کہ آج کی رات میں اپنے صاحب کو اپنی عاشق معشوق کے قصے سناؤں گا.. ماماں جعفر عورتوں کے معاملے میں بڑا کاریگر آدمی ہے سائیں.."

ہنسوں کی ڈاریں اس کے عین اوپر گردش میں تھیں۔ بلبلاتی فریاد کرتی اور اس پر لعنت بھیجتی ذرا نیچے اترتی تھیں اور پھر اوپر ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنی چراگاہ کے تقدس کو پامال کرنے والے پر نفرین بھیجتی تھیں.. باری باری نیچے آتی تھیں اور کائیں کائیں کا احتجاج بلند کرتی پلٹ کر پھر سے بلند ہو جاتی تھیں..

ہزاروں ہنس تھے.. غل کرتے.. ابھی تک اُسی بلندی پر جہاں ان کے پَروں پر غروب کی آخری کرنیں پڑتی تھیں اور نیچے ناپو پر نیم تاریکی تھی۔

"تو اب یہ نیچے نہیں اتریں گے؟"

"کون سائیں؟" جعفر ان کے وجود کو اور شور کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

"یہی.. منگھ!"

"نہ سائیں.. یہ گھبرا گئے ہیں.. ابھی کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں چلے جائیں گے۔"

خاور ابھی تک سیدھا کھڑا اُنہیں تک رہا تھا... اس نے سر جھکایا اور پلٹ کر کشتی کی طرف چلنے لگا۔ شرمندہ اور خجل..

"جعفر.."

"جی سائیں.."

"یار تمہیں تھوڑی تکلیف تو ہو گی.. پر آج رات کسی اور ناپو پر جا کرتے ہیں.. دوسرے کے گھر میں رات کرنا اچھا نہیں لگتا.."

"پر سائیں.. سامان نکال لیا ہے.. تنبو لگ گیا ہے اور فہیم چولہا جلاتا ہے۔ منگھ کا کیا ہے.. سندھ میں ڈوبیں گے تو نہیں.. کہیں نہ کہیں جا بسیرا کریں گے".. جعفر تھوڑا سا طیش میں تھا لیکن سنبھل کر.. اگرچہ ناگواری چھپا نہیں سکتا تھا.. سنبھل کر کہہ رہا تھا..

"مہربانی ہو گی تمہاری.. کہیں اور چلتے ہیں۔"

اور جب وہ دونوں کشتی تک پہنچے تو وہاں ایک عارضی بستی کو بسانے کے بندوبست ہو چکے تھے.. اس کا خیمہ ریت میں پنجے گاڑے نصب ہو چکا تھا.. فہیم دیگچی میں جھانکتا تھا..

سرور سامان کے اوپر ایک ترپال پھیلا رہا تھا اور پکھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور تاریکی میں جا رہی تھی..

وہ وسیع ناپو اور چراگاہ جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اب اس کے غیر وجود سے خالی ہو کر اپنی آبائی ویرانی کو لوٹ گئی تھی.. ایک مختصر سا وقفہ آیا.. بھاؤں کی سرگوشیوں نے چراگاہ کے گرد گردش کی اور پھر وہ اترنے لگے..

ہنسوں کی پہلی ڈار اس کے ایستادہ خیمے اور کشتی سے بہت پرے اس مقام پر جہاں وہ ابھی تھا وہاں اپنی چراگاہ کی ویرانی میں اطمینان سے اترنے لگی.. پروں کا ایک تاریک ہجوم تھا جو آسمان سے نیچے ہو کر ریت پر اترتا تھا.. ایک ایک ہنس الگ الگ اترتا تھا کیونکہ ہر ہنس جب ریت کی قربت میں آتا تھا تو اس پر اترتے ہوئے اس کے پروں اور پنجوں کا انداز مختلف ہوتا تھا۔

ان میں سے کوئی ایک ہنس ایسا تھا جس کی آنکھیں غلافی تھیں.. اور آنسوؤں سے لبریز تھیں.. کوئی ایک ہنس ایسا تھا جو قربت مرگ میں اپنا آخری گیت گاتا ہے.. اس کے بدن پر نیلے دھبے اور کھرینڈ تھے اور وہ سات آئینوں میں الگ الگ دکھائی دیتا تھا۔

اور سلطانہ کی نیلی خانہ بدوش آنکھوں والا ہنس بھی شائد انہی میں سے ایک تھا جو ابھی چراگاہ میں اترنے کو تھا۔

بجھے دل سے سرور اور جعفر کنارے پر ڈھیر سامان کو اپنے اوپر بوجھ کر کے واپس کشتی میں لے جا رہے تھے.. فہیم چولہے پر رکھی گرم دیگچی کو ایک دستر خوان میں لپیٹ کر نہایت ناراضگی سے اٹھا رہا تھا..

خیمہ سب سے آخر میں اکھاڑا گیا.. اور تاریکی بڑھ رہی تھی.. وہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ یہ شخص چند پرندوں کی آہ و زاری کے باعث اس ناپو کو کیوں چھوڑتا ہے.. بستی جو مشکل سے آباد ہوئی تھی اسے اجاڑ دینے کو کیوں کہتا ہے.. پرندے تو شور کرتے رہتے ہیں اور کہیں اور کیوں جاتا ہے رات ہونے والی ہے پانیوں میں بھٹکنے کے لیے کیوں جاتا ہے..

بانس اٹھاتے ہوئے جعفر نے اگرچہ سرور سے کہا لیکن دراصل خاور سے مخاطب ہوا "سرور ہوئے.. لالٹین جلا لو.. ابھی تو رات کرنے کے لیے کیا معلوم کدھر جانا ہے.."

"موت مجھے تمہارے پاس لے آئی ہے.. ڈیتھ!"

نیلی خانہ بدوش آنکھیں مرگلہ پہاڑیوں کے اندر اُن میں 'پرائی آنکھوں سے پوشیدہ ندی کے بہاؤ کو ایک ایسی سکرین کی طرح دیکھتی تھیں سحر زدہ دیکھتی تھیں جیسے ان پانیوں پر وہ سب عبارتیں رقم ہیں.. وہ خود سے کچھ نہیں کہتی تھی صرف اُن پر لکھی گئی عبارتوں کو ایک سپاٹ لہجے میں پڑھتی جاتی تھی جیسے ایک بچہ تختی پر لکھی گئی عبارت دوہراتا چلا جاتا ہے اور وہ سورج کی مدھم حدّت سے عاری سرمائی کرنوں سے لشکتی پانی کی سطح پر نظریں جمائے انہیں ایک ذہین بچے کی طرح بلا اٹکے پڑھتی جاتی تھی اور یہ عبارتیں ٹھہرتی نہ تھیں' بہاؤ کے ہمراہ بہہ جاتی تھیں اور ان کی جگہ نئی عبارتیں اس آبی تختی پر ظہور میں آجاتی تھیں..

بہاؤ کی روانی میں کمی آتی تھی تو وہ بھی مدھم ہو جاتی تھی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگتی تھی اور جب پانیوں کا کوئی ریلا تیزی سے آتا تھا تو وہ بھی اس کی رفتار کے حساب سے تیز تیز بولنے لگتی تھی.. اسے وہ سب کچھ کہنا تھا جو پانیوں پر درج تھا اور بہتا جاتا تھا.. وہ کوئی ایک سطر ایک لفظ خطا نہیں کرنا چاہتی تھی.. ان عبارتوں کے بہہ جانے سے پیشتر انہیں خاور تک پہنچا دینا چاہتی تھی کیونکہ کوئی ایک لفظ یا ایک سطر بھی اگر زندگی کے تانے بانے کی بُنت میں سے رہ جائے تو وہ ادھوری رہ جاتی ہے۔ اگر ایک لفظ بھی پانیوں کے ساتھ بہہ جائے تو وہ واپس نہیں آتا اور اس کی کمی سے بُنت میں سوراخ رہ جاتا ہے..

مشرقی لبادے میں جو مکمل امریکی لہجہ تھا اس میں کہیں بناوٹ نہ تھی.. وہ آبائی تھا..

"تمہاری سب تحریروں میں موت حکمران ہے۔ اسی فیکٹر نے مجھے فیسی نیٹ کیا

ہے.. تمہارے اور میرے درمیان یہی رابطہ ہے.. موت کے سوا اور کوئی تعلق نہیں.. مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیوں آجاتی ہے اور کوئی ایک لمحہ کیوں چُنتی ہے آنے کے لیے.. کوئی دوسرا کیوں نہیں.. اور کسی ایک فرد کو کیوں چُنتی ہے.. میں بس یہی جاننے کی آرزومند ہوں.. شاید تم اس گتھی کو سلجھا سکو.. تم جو مجھے موت کے رسیا لگتے ہو۔"

پرائی آنکھوں سے پوشیدہ مرگلہ کی پہاڑیوں کے اندر جو ایک ندی بہہ رہی ہے اس پر ایک پل ہے جس پر ایک سفید کار کھڑی ہے..

سٹیئرنگ سے اوپر عقبی ٹریفک پر نظر رکھنے والا جو آئینہ ہے اس کے گلے میں موتیے کا بوسیدہ.. اپنے کنوارپن کی سفیدی کھو کر دُھندلا جانے والا ایک ہار لٹک رہا ہے جس کی مہک میں ناگواری کا زوال ہے..

پُل پر سے مرگلہ کے کسی گاؤں تک جاتی کوئی ویگن کبھی کبھار گزرتی ہے اور سفید کار کو سامنے پا کر ہارن دے کر گزرتی ہے..

کوئی خاندان.. اسلام آباد یا پیر سہاوے سے لوٹتا.. پہاڑی سے اتر کر پُل کے پار اپنے گاؤں کو جاتا ہوا..

وہ ویگن اور وہ خاندان دونوں.. ان کی موجودگی سے بے خبر.. وہ جو پُل سے ذرا فاصلے پر پانیوں کے قریب ہوئے بیٹھے ہیں.. دور سے یہی لگتا ہے کہ ایک مدت سے ایک دوسرے سے آشنا ہیں۔ تنہائی کی چاہت میں ادھر آنکلے ہیں اور اب جانے کیا راز و نیاز کر رہے ہیں.. لیکن کوئی بھی ان کی طرف دھیان نہیں کرتا تھا.. اسی لیے کوئی بھی اس امر سے آگاہ نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے سراسر اجنبی ہیں اور.. صرف موت ہے جو ان کو یہاں لے آئی ہے۔

"مجھے بتاؤ کہ یہ عشق کیا ہے اور مرگ کیا ہے.. ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے.. تمہاری ایک کہانی "پریم" میں یہی شاہے اور یہی سائے ہیں... تمہاری ہر تحریر میں کہیں نہ کہیں سے موت داخل ہو جاتی ہے اور کم از کم میرے لیے مرکزی کردار بن جاتی ہے.. ایسا کیوں ہے؟ کیا تم نے اس کا تجربہ کیا ہے.. اس کا ذائقہ چکھا ہے.. یا اس کے اتنے نزدیک گئے ہو کہ تم نے اس کے پار جو کچھ ہے اسے دیکھ لیا ہے.. تم ہمیشہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہو.. اس کی تمنا کرتے ہو یا اس سے اتنے خوفزدہ ہو کہ حواس کھو چکے ہو.. تمہاری ہر سطر میں

موت در آتی ہے۔ میں اس کے سیاہ بھنور کے گرداب میں ہوں.. میں اس کا جواز نہیں سمجھ سکتی.. تم سمجھا سکتے ہو کہ یہ کیا ہے...''

پیر سہاوہ کے وے سائڈ عارضی چائے خانوں سے ذرا آگے ایک کچی پتھریلی سڑک نیچے اترتی ہے۔ نیچے مرگلہ کے نشیب میں.. بادی النظر میں یہ سڑک ایسی نہیں لگتی کہ اس پر کوئی عام کار آسانی سے اترے.. عارضی چائے خانے مرگلہ کی ڈھلوان سے ذرا ادھر پکنک کے لیے آنے والے اسلام آبادی کراوڈ سے بھرے پڑے تھے.. سرکاری اور ذاتی.. پاش اور مہنگی کاریں اور کوسٹر سڑک کے کناروں پر ادھر ادھر بے ترتیبی سے پارک کیے گئے تھے.. بے جا شوخی سے کلبلاتی خواتین اور چیختے چلاتے بچے اور ان کے تھکے ہوئے اور بیزار خاوند اور باپ شکستہ کرسیوں پر اپنے آپ کو سنبھالتے پیر سہاوا کی بلندی سے نیچے نظر آنے والے دھندلاتے ہوئے شہر میں اپنے سیکٹر اپنی گلیاں اور اپنے مکان تلاش کرتے تھے.. اپنے مکان کے نواح میں کسی اہم اور بڑی عمارت کو سپاٹ کر کے اس کی جانب انگلی سیدھی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی نہ نظر آنے والی گلی کا تعین کرتے تھے اور پھر اسے کھو دیتے تھے اور یوں دھندلاتے ہوئے شہر کے نقشے میں بھٹکتے پھرتے تھے۔

پیر سہاوا کے ہالی ڈے کراوڈ کی دوسری تفریح یہ تھی کہ وہ دامن کوہ سے آنے والی ہر کار اور جیپ کو نظر میں رکھتے تھے اور اس میں سوار لوگوں کی زندگیوں میں جھانکتے تھے.. خاور نے اس ہجوم کے قریب رکنے کی بجائے ذرا آگے جا کر کار کو دائیں ہاتھ پر اس سڑک پر اتار دیا جو کچی اور پتھریلی تھی اور یکدم آس پاس کے منظر کو اوجھل کر کے نیچے چلی جاتی تھی۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ نیچے مرگلہ کی پہاڑیوں کے اندر نشیب میں کیا ہے اور سڑک اسے کہاں لے جائے گی۔ وہ کار کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کے گیئر بڑی مشقت سے اور جھنجھلاہٹ میں بدلتا تھا کہ اسے اس کی عادت نہ تھی۔ اس کی اپنی کار بہت دنوں سے ورکشاپ میں کھلی پڑی تھی کیونکہ اس کا گیئر بوکس ناکارہ ہو چکا تھا اور یہ کار ایک دوست سے حاصل کی گئی تھی۔ کسی دوسرے شخص کی کار کو ڈرائیو کرنا ایسے ہی جیسے کسی اجنبی کے بستر میں سونا اگرچہ کمبل چادر یا تکیہ تو وہی ہوتے ہیں لیکن آپ بے آرام ہوتے رہتے ہیں.. بہر طور یہ ادھار کی گاڑی اٹکتی ہوئی' پتھروں سے ٹکراتی.. کبھی اس کے بس سے باہر ہوتی اور کبھی قابو میں آتی اپنی

مرضی کی رفتار سے نیچے اترتی گئی اور جب گاڑی دھچکوں سے تقریباً بے قابو ہوتی نشیب میں گرتی چلی جاتی تھی تو اسے احساس ہوا کہ بیک ویو مرر کے ساتھ ایک بوسیدہ مرجھایا ہوا موتیے کے پھولوں کا ہار لٹکا ہوا ہے جو ہر جھٹکے کے ساتھ جھولتا ہے تو اس کی ناک کے قریب آتا ہے اور اس میں سے زوال کی بو آتی ہے.. جیسے اولڈ پیپلز ہوم میں صرف دوائیوں اور ٹیکوں کے سہارے زندہ رہنے والے بوڑھوں کے گوشت میں سے آتی ہے۔

ڈھلوان کا اختتام ہوا تو ایک ندی کہیں سے نمودار ہوئی اور ان کے سامنے ونڈ سکرین کے پار بہنے لگی.. اس پر ایک پُل تھا..

انہیں اس پُل سے ذرا فاصلے پر ندی کے کنارے کے پتھروں پر بیٹھے ایک عرصہ ہو گیا تھا..

اتنا عرصہ کہ وہ پُل جس پر سفید کار کھڑی تھی اور اس میں زوال کی بُو والا ہار لٹکتا تھا.. مرگلہ کی یہ اُس کے لیے بے نام ندی اور اس کے کناروں پر سر اٹھانے والے پتھریلے جھاڑیوں سے اٹے پہاڑ ساکت ہو کر ایک تصویر میں بدل چکے تھے.. زمانے بہت بیت گئے تھے۔ مدتیں گزر چکی تھیں۔ صرف پانیوں کے اوپر لشکتی کرنیں اس ٹھہراؤ کو اپنے زور سے توڑتی تھیں.. پوری تصویر کو نہیں صرف اس کے ایک حصے کو جس میں بہاؤ کا تسلسل تھمتا نہ تھا۔ وہ اپنی نشست کو ذرا بہتر کرنے کے لیے ہتھیلیاں پتھر پر جما کر ذرا کھسکتی تو اجرک سے بنی ہوئی اس کی شلوار کے پائینچے بھی ذرا کھسک جاتے اور جا گزر کے اوپر اس کے سفید ٹخنے دکھائی دینے لگتے..

''مجھے تم سے دلچسپی نہیں ہے.. موت میں ہے.. کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟''

کسی بھی کامیاب تخلیقی اور اچھی بنت کی کہانی میں ہر کردار ایک ہی صورت حال اور ایک ہی رابطے سے سامنے نہیں آتا۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر نیا کردار اپنے خاص پس منظر اور اپنی مخصوص لینڈ سکیپ کے ساتھ مختلف حالات سے کہانی کے اندر داخل ہو.. لیکن زندگی پر آپ کوئی ایسی پابندی لاگو نہیں کر سکتے.. وہ اپنے بہاؤ میں چلی آتی ہے اور کہانی کی پرواہ نہیں کرتی.. اسی لیے سلطانہ بھی اس کی زندگی میں اسی ایک ون وے سٹریٹ میں

سے نمودار ہوئی.. جس میں سے غلافی آنکھیں اور عابدہ سومرو داخل ہوئی تھیں.. ٹیلیفون کی ون وے سٹریٹ میں سے..

حقیقت کو محض چاشنی کی خاطر تو نہیں بدلا جا سکتا..

صرف یکسانیت کو توڑنے کے لیے غیر حقیقی تغیر کی آمیزش تو نہیں کی جا سکتی..

اسی لیے وہی ٹیلی فون تھا..

بارہ کہو کا وہی بل ڈوزر کے بلیڈوں کے خوف سے دبکا ہوا گھر تھا..

"کین آئی سپیک ٹو مسٹر خاور پلیز..." یہ آواز نہ تو جنسی انداز میں گھنی ہوتی تھی اور نہ ہی آنسو بہاتی لرزش میں تھی.. یہ ایک کاروباری انداز کی ٹھنڈی اور براہ راست آواز تھی۔

"سپیکنگ..."

ابتدائی گفتگو ایک سراسر اور شدید امریکی لہجے کی انگریزی میں تھی۔ روانی اور بے پروائی کی کیفیت میں۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں.. اگر یہ ممکن ہو اور آپ برا نہ منائیں تو.."

"کس سلسلے میں؟" اس نے حسب عادت دریافت کیا..

"موت کے سلسلے میں..."

وہ چپ ہو گیا.. بہت دیر تک خاموش رہا اپنے آپ کو باور کروانے کے لیے کہ اس نے یہی کہا تھا کہ.. موت کے سلسلے میں.. یہ کیا جواب ہوا.. ٹیلی فون کا سیاہ چونگا ایک پھنیر سانپ کی طرح پھیلا ہوا تھا اور وہ اسے ایک خوفزدہ کبوتر کی مانند آنکھیں جھپکے بغیر دیکھے چلا جا رہا تھا۔ یہ کیا جواب ہوا..

"آر یو شل ڈیئر مسٹر خاور.."

"یس آئی ایم..."

"میں نے ایک سادہ سا سوال پوچھا ہے کہ کیا آپ سے ملاقات ممکن ہے؟.. اگر نہیں تو آپ انکار کر سکتے ہیں.."

"آپ کون ہیں؟"

"میں اپنا تعارف کروائے دیتی ہوں.. میرا نام ڈاکٹر سلطانہ شاہ ہے.. میرا تعلق

کوئٹہ سے ہے اور میں اسلام آباد میں ایک کینیڈین این جی او میں کام کرتی ہوں.."

"آپ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں؟"

"نہیں.. میں نے انتھروپولوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے امریکہ سے.. آئی ایم سوری لیکن آپ بہت پوچھ گچھ کر رہے ہیں.. پاکستان میں تو خواتین سے اتنے سوال نہیں پوچھے جاتے.. میں آپ سے ڈیٹ نہیں مانگ رہی صرف ایک سرسری ملاقات کرنا چاہتی ہوں اپنی ایک الجھن دور کرنے کے لیے.. دیٹس آل..."

"آپ مجھے موت کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں.. ڈیتھ؟"

"ہاں..."

وہ پھر چپ ہو گیا.. ایسے کرداروں کے ساتھ اس کا سابقہ پڑتا رہتا تھا جو کسی ایک موضوع کے اسیر ہوتے تھے.. خودکشی کی کیا وجوہات ہوتی ہیں.... تخلیق کا منبع کیا ہے.. کیا یہ زندگی محض ایک حادثہ ہے... اور وہ دن رات اس موضوع کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ لائبریریوں میں پہروں بیٹھ کر ریسرچ کرتے تھے.. مختلف لوگوں کو.. اس جیسے لوگوں کو طویل سوالنامے بھیجتے تھے اور پھر اس موضوع سے اکتا کر کسی اور طرف نکل جاتے تھے.. لیکن یہ خاتون پی ایچ ڈی کر چکی تھیں' علم الانسان میں.. اور اس علم میں موت سرفہرست تھی.. بشر کی فنا سے تو اس کا آغاز ہوتا تھا.. شاید موت میں اس کی دلچسپی اسی حوالے سے تھی..

"آئی ایم سوری لیکن اس ہفتے تو شاید یہ ممکن نہ ہو سکے.."

"یہ کبھی ممکن ہو سکتا ہے؟"

"ہاں.. آں..."

"شاید اگلے ہفتے...؟"

"جی.."

"تو آپ اجازت دیں تو میں اگلے ہفتے آپ سے رابطہ کر کے چیک کر سکتی ہوں.. کونسے روز اور کس وقت؟.."

"کسی روز بھی... میں بہت کم گھر سے باہر جاتا ہوں۔"

"تھینک یو..."

وہ جہاں کہیں بھی اردو کا سہارا لیتی تھی تو ذرا رک رک کر لفظ چبا چبا کر بولتی تھی اور جب اظہار میں دشواری ہونے لگتی تھی تو امریکی لہجے کی انگریزی میں رواں ہو جاتی تھی اور اس کا اظہار وسیع ہو جاتا تھا۔

اگلی شام بڑے پتھر کی کھوہ سے روپوش آخری چکن اینڈ چیز سینڈوچ کھاتے ہوئے اس نے نہایت سرسری انداز میں اس ٹیلی فون کال کا ذکر کیا..

"آہا... ایک اور کیس... عابدہ سومرو کے بعد ایک اور گرفتارِ محبت"... اس نے ہنستے ہوئے اپنی غلافی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور وہ واقعی بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ "لیکن یار اولیت تو مجھے حاصل ہے اس لیے مجھے فوقیت دینا.. اب تو ماشاء اللہ رونق ہو گئی ہے.. اور تم یقین نہیں کرتے تھے کہ عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا.."

"تمہارا تو ون ٹریک مائنڈ ہے.." خاور نے جھلا کر کہا تھا۔ "ہر کوئی تمہاری طرح پاگل خانہ نہیں ہے.. اس نے انتھروپولوجی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اور اسے موت کی حقیقت کے بارے میں کوئی الجھن ہے جو وہ مجھ سے مل کر سلجھانا چاہتی ہے.."

"اسے کیا پتہ کہ موت کیا ہے..." اس کا لہجہ.. اس کا رنگ بدلا اور اس نے ایک خاص زہر آلود انداز میں جیسے تھوکتے ہوئے کہا..

خاور کے سامنے وہ بری طرح سڑنے لگی..

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں.. لیکن اسے موت کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم... یہ تم اسے میری طرف سے بتا سکتے ہو.. اور تمہیں بھی کچھ نہیں معلوم.. تحریروں میں تم اس کے ساتھ رومانس لڑا سکتے ہو.. بہت گیانی ہو کر اس کی حکمت کو بیان کر سکتے ہو لیکن تمہیں بھی کچھ پتہ نہیں.."

"میں جانتا ہوں.. تم درست کہتی ہو لیکن میں نے کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا.. تو اس میں مجھ سے ناراض ہونے والی کیا بات ہے.."

"آئی ایم سوری.." وہ پھر سے ہنسنے لگی اور فوراً نارمل ہو گئی "میں تھوڑی سی جیلس ہو گئی تھی.."

"جیلسی کی گنجائش تم نے خود نکال لی ہے ورنہ یہ خاتون صرف ایک خالصتاً علمی

حوالے سے مجھے ملنا چاہتی ہے.."

"نہ.." اس نے اپنی انگلی کھڑی کر دی۔ "نہ.."

"کیوں.. نہ.." وہ جھنجھلا گیا..

"علمی حوالوں کے لیے تو لائبریریاں اور بوڑھے سکالر بھرے پڑے ہیں.. یہ محض ایک بہانہ ہے.. دے بیچ از آفٹر یو..."

"تمہاری اطلاع کے لیے میں اگرچہ سکالر نہیں مگر بوڑھے ہونے کی شرط پوری کرتا ہوں۔"

"تم اتنے بوڑھے نہیں ہو.." وہ اسے تنگ کرنے پر تلی ہوئی تھی.. "آئی ایم جیلس"

"تم عابدہ سومرو سے تو کبھی جیلس نہیں ہوئیں.."

"وہ کیس بالکل مختلف نوعیت کا ہے.. ہاں اس ڈاکٹر صاحب کو عابدہ کے ساتھ رابطہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ ہے جو موت کو جانتی ہے.. یہ تمہاری ڈاکٹر شادی شدہ ہے؟"

"کچھ ہوش کے ناخن لو.. یہ میں اس سے کیسے پوچھ سکتا تھا.. اس کا لہجہ بالکل سپاٹ اور کاروباری طرح کا تھا.."

"تو پھر وہ کاروبار کرے گی خاور ڈیئر.. پی ایچ ڈی ان انتھروپولوجی... کیا میں ابھی سے اس کے سراپے کا نقشہ کھینچ دوں.. تم پتہ نہیں کن خیالوں میں ہو.. لیکن وہ اگر شادی شدہ نہیں ہے تو طلاق یافتہ ضرور ہے.. کنواری ہوتی تو یوں بے دھڑک تم سے رابطہ نہ کرتی.. کم از کم پینتالیس برس کی ہے.. یعنی مجھ سے کچھ بڑی.. موٹی ہے... دبیز شیشوں کی عینک لگاتی ہے اور اسے کوئی گھاس نہیں ڈالتا اور وہ تمہیں چرنے آ گئی ہے..."

"اس چراگاہ میں چرنے کو کچھ باقی ہی نہیں تو وہ کیا چرنے آ گئی ہے؟" وہ اس کے تجزیے سے بے حد محظوظ ہو رہا تھا اور خوشگوار موڈ میں تھا۔

"منہ مارنے آ گئی ہے.."

وہ اس سمے بے حد پرکشش لگ رہی تھی.. اس کی غلافی آنکھیں بوجھل تتلیوں کی طرح خاور کے بدن کی گھاس پر براجمان ہوتی تھیں.. چند لمحوں کے لیے بوجھ ڈالتی تھیں اور پھر اڑ جاتی تھیں.. ایک اور شام تھی اور بارہ کہو کے دیہات میں اس کی آمد پر کہیں کہیں

بلب روشن ہوتے جاتے تھے.. اس کے رد عمل میں حسد کی جو لہر آئی تھی وہ گزر چکی تھی اور اب اس میں رقابت کا کوئی جذبہ نہ تھا اور وہ اس کی رفاقت میں خوش اور لاپرواہ تھی "پہلے یہ بتاؤ کہ اس سندھی وڈیرن نے تمہارے ساتھ کیا کیا... اس نے بھی منہ مارا کہ نہیں..."

وہ ایک سمجھ میں نہ آنے والا وجود تھا جو پل میں کچھ ہوتا تھا اور پھر کچھ اور...

"میں نے تمہیں بتایا تو ہے... تم بھی اگر تجربہ کر لیتیں تو تم بھی جان جاتیں کہ اس چراگاہ میں تو گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں تو وہ کیسے منہ مار سکتی تھی.."

"پلیز پلیز.." وہ بچوں کی طرح اٹھلاتی ہوئی منہ بسورتی ضد کرنے لگی۔ "مویشی تو اپنی عادت سے مجبور ہوتا ہے.. منہ مارنے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ چراگاہ میں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں۔ کوشش تو کرتا ہے.. پلیز پلیز مجھے بتاؤ.."

خاور نے اس لاپرواہ کیفیت میں.. اس یقین کے ساتھ کہ وہ عابدہ سومرو کے لیے صرف ہمدردی کے جذبات رکھتی ہے اور ان میں رقابت کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں.. بارہ کہو کے دیہات پر اترنے والی شام میں... کچھ جزئیات کو چھپا کر پلنگ کے سرہانے ایستادہ مور اور اس میں جڑے سات آئینوں کے بارے میں بتایا..

"وہاٹ؟" اس نے خاور کا بازو جیسے ایک آہنی شکنجے میں جکڑ لیا.. اس کی گرفت اتنی کڑی تھی کہ اسے درد کو سہارنے کے لیے دانت بھینچنے پڑے.. "یہ تم کیا کہہ رہے ہو.."

اس کا یہ رد عمل بہت اچانک تھا اور خاور خوفزدہ ہو گیا "ایسی کوئی بات نہیں ہوئی.."

"ہاں اسی لیے تم اگلے روز اسلام آباد واپس آنے کی بجائے تین دن وہیں ٹھہرے رہے تھے.. میں ایئرپورٹ پر جاتی رہی تھی.." وہ ایک مختلف عورت ہو چکی تھی.. بے قابو اور پاگل پن کے آس پاس "اسی لیے.. اس کوٹھڑی کی چابی تو میرے پاس تھی جس کے اندر میں نے تمہیں سنبھال رکھا تھا اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہارے ساتھ میں نے اس کُتیا کو بھی بند کر دیا ہے.." اس نے ہینڈ بیگ کھول کر دو کیپسول کا نپتے تھرتھراتے ہاتھوں سے پتے کو چیر کر نکالے اور پانی کے بغیر نگل گئی۔ "ڈِڈ یو ہیو سیکس ود ہر؟"

"اس عمر میں تو یہ مشکل ہو جاتا ہے۔" خاور نے اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے بمشکل ہنس کر کہا..

"مجھے بتاؤ.. ڈِڈ یو؟"

"نہیں.."

"پلیز پلیز.. مجھے بتا دو... ڈِڈ یو؟.." اور اس کی آنکھوں میں جھڑیاں لگ گئیں.. اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا.. اور وہ گردن کے راستے بہہ کر اس کے گریبان کے اندر سرایت کرتے ہوئے اس کی قمیض کو گیلا کرنے لگے..

"نہیں..."

"تمہاری آواز میں یقین نہیں ہے.." وہ ہسٹریائی ہو گئی "میں نہیں برداشت کر سکتی.. تم مرزا صاحب جیسے نہیں ہو سکتے لیکن میں جانتی ہوں کہ چراگاہ ابھی ویران نہیں ہوئی.. گھاس کے تنکے ابھی ہیں.. وہ نیلے سویٹر میں ابھی تک الجھے ہوئے ہیں.. میں جانتی ہوں.."

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے اس سے پیشتر کہ بارہ کہو کے ہر گھر میں تمہاری چیختی ہوئی آواز پہنچ جائے اور لوگ یہاں تک آ جائیں یہ جاننے کے لئے کہ یہ پاگل عورت کون ہے.. اور اگر تم کار میں نہیں بیٹھو گی تو میں آسانی سے پیدل نیچے اتر سکتا ہوں اور اپنے گھر تک جا سکتا ہوں۔"

وہ جس یک لخت‌گی سے ہسٹریائی ہوئی تھی.. ایک ہی پل میں سیڑھیاں پھلانگتی عرش تک جا پہنچی تھی اسی بے محابہ رفتار سے اگلے پل میں نیچے آ گئی "آئی ایم سوری.. پاگل خانہ تو ایسا ہی ہوتا ہے.."

"کار میں بیٹھو.."

"بیٹھتی ہوں" وہ ایک بے دام غلام کی طرح دروازہ کھول کر ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ گئی..

وہ آنسو پونچھتی ہوئی سراسر نارمل ہو گئی۔

کار نیچے اتر کر سملی روڈ پر دائیں جانب مڑی تو وہ ایک سکول گرل کی طرح ہنستی ہوئی چلبلاہٹ کے ساتھ کہنے لگی "پی ایچ ڈی ان انتھروپولوجی.. ہاں.. مجھ سے شرط لگا لو وہ پینتالیس برس سے کم نہیں ہے.. موٹی اور بدشکل ہے اور عینک لگاتی ہے... از دیٹ اے بیٹ؟"

پورے سات روز کے بعد.. وہ پھر لائن پر تھی.."

"کیا یہ ممکن ہے؟.."

"جی.."

"کہاں؟"

"جہاں آپ پسند کریں.."

"میں پھر بتا دوں کہ یہ صرف موت ہے جو مجھے الجھا رہی ہے.. تو کہیں بھی.. جہاں ہم اطمینان سے بیٹھ کر تھوڑی دیر باتیں کر سکیں.. یہ آپ پر منحصر ہے کہ کہاں.. میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔"

اسلام آباد کی ڈھلتی ہوئی.. کورڈ مارکیٹ کے باہر فٹ پاتھ کے کنارے خاور نے قیصر سے مستعار شدہ سفید گاڑی بمشکل پارک کی.. وہ صبح سویرے ڈیوٹی پر جانے سے پیشتر اس سے ملنے آ گیا تھا.. وہ آج کی ملاقات اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی ذاتی کار ورکشاپ میں کھلی پڑی تھی اور وہ اس الجھن میں تھا کہ کیا یہاں سے مری روڈ تک ایک سوزوکی ویگن میں جانا اور پھر وہاں سے ٹیکسی حاصل کر کے کورڈ مارکیٹ تک پہنچنا.. صرف اس لئے کہ وہاں کوئی خاتون موت کے سیاہ نظریات دامن میں سمیٹے اس کی منتظر ہے.. اتنے تردد کے لائق ہے؟ چنانچہ اس نے اپنے اس مڈل ایجڈ پلے بوائے دوست کو نہ چاہتے ہوئے بھی موجودہ صورت حال بیان کر دی "یار مجھے بھی ایک ڈیوٹی پر پہنچنا ہے.. کسی معنگ اور موٹی ادھیڑ عمر عورت سے ملاقات کرنی ہے.. تو تم اتنی دیر یہاں آرام سے بیٹھو.. تمہیں چائے بنا کر دیتا ہوں اور میں ایک گھنٹے کے اندر اندر اسے بھگتا کر واپس آتا ہوں.."

"شاہ جی.. یہ میں کیا سن رہا ہوں.. آپ کی زندگی میں ایک عورت.."

قیصر اگر یہ سوچتا تھا کہ وہ فارغ ہو چکا ہے.. بنجر ہو چکا ہے.. اور چراگاہ میں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں ہے تو اسے الزام نہیں دیا جا سکتا تھا.. خاور اگر اسے غلافی آنکھوں اور عابدہ کے بارے میں بتاتا تو وہ قطعی طور پر یقین نہ کرتا.. چہ جائیکہ ایک اور عورت..

"نہیں نہیں.. ایک کاروباری قسم کی مختصری اپائنٹ منٹ ہے یار.."

"بسم اللہ.." قیصر نے اپنی جادو بھری مسکراہٹ جو صنف نازک کے لئے سراسر مرگ تھی اس پر نچھاور کرتے ہوئے کار کی چابی اسے تھما دی "کچھ کر کے آنا شاہ جی.. خالی نہ آ

جانا" وہ مسکراہٹ سے ہنسی میں آ گیا.. اور پھر اس وارڈروب کی جانب چلا گیا جس میں گندے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے وہ جانتا تھا کہ اس کے لئے وقت گذارنے کے لئے کوئی نہ کوئی امرت دھارا موجود ہو گا..

کورڈ مارکیٹ کے باہر سرما کی دھوپ میں ناٹکوں کے فٹ پاتھ پر افغانی ہینڈی کرافٹس سجی ہوئی تھیں.. مزار شریف کے آئینے.. بدخشاں کی پرانی صراحیاں.. کنگن.. جھمکے.. جڑاؤ ہار.. چاندی کی پازیبیں.. قیمتی پتھر.. انگوٹھیاں.. روسی سپاہیوں کی سمور کی ٹوپیاں جن پر ابھی تک ریڈ سٹار جڑے ہوئے تھے.. غالیچے اور سموور.. لیکن یہ سب کے سب اس ثقافت کی نمائندگی کرتے تھے جو کابل سے دور.. دریائے آمو کے کناروں کی تھی.. اور ان نوادرات پر ڈپلومیٹک انکلیو سے آنے والی غیر ملکی خواتین جھکی تھیں اور بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔

کورڈ مارکیٹ کے داخلے کے دروازے کے برابر میں ایک بیزار سا شخص پکوڑے تل رہا تھا اور گاہک بڑے تحمل سے اپنی باری کے منتظر تھے۔

اس ڈھلتی ہوئی مارکیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک سکون اور ٹھہراؤ سا آ جاتا ہے اور باہر پھیلے کنکریٹ کے کیپٹل سٹی کا وجود تحلیل ہو جاتا ہے۔

دائیں جانب.. مارکیٹ کے اندر جانے پر اس پارسی جنٹل مین کا سٹور تھا جہاں سے آپ کل دنیا کی اشیائے خورد و نوش حاصل کر سکتے تھے... تازہ سوس پنیر.. بنکاک کی ٹیونا فش.. امریکہ میں بھری ہوئی مشروبات کے ٹن... ہسپانوی زیتون سرکے میں بھگوئے ہوئے.. ہائنز کی انگلش بینز اور سوپ.. اٹالین سپاگیٹی... اور جرمن ساسیج... پاکستان کے علاوہ وہاں ہر قومیت کی خوراک شیلفوں پر سجی تھی..

یہ پارسی سٹور کورڈ مارکیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر تھا اور بائیں جانب ایک خرانٹ اور کھچڑے گول ٹوپی پہنے دکاندار کے شیشے کے شوکیس اور کاؤنٹر تھے جو اُن کے عقب میں کھڑا ابھی نماز سے فارغ ہو کر آیا تھا یا اگلی نماز پر جانے کی تیاری میں تھا ہمیشہ اسے دیکھ کر کہتا "آیئے خاور صاحب.. چائے تو پیو گے.. بسکٹ تو کھاؤ گے.." اور وہ اس انداز میں یہ دعوت دیتا کہ مہربانی کرو میں تو یونہی پوچھ رہا ہوں.. قبول نہ کر لینا..

اس خرانٹ دکاندار کے کاؤنٹر کے قریب اس نے اسے وقت دیا تھا..

"میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟"

وہ ششدر رہ گیا تھا..

"آپ نے مجھے ٹیلی ویژن پر تو دیکھا ہو گا؟"

"نہیں.. میں بہت عرصے سے امریکہ میں تھی.. یہاں آکر بھی مجھے ٹیلی ویژن دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تو میں آپ کو کیسے پہچانوں گی.."

"میں..." اس نے کوشش کی کہ اپنا حلیہ بیان کر سکے.. "بہر حال... آپ فلاں کاؤنٹر کے پاس آجائیں تو..."

"میں اپنے بارے میں بتا دیتی ہوں.. میں اپنا لباس بہت زیادہ تبدیل نہیں کرتی۔ میرے پاس صرف دو تین جوڑے ہیں.. آئی مین پاکستانی.. ابھی میں اجرک کا ایک کرتہ شلوار پہنے ہوئے ہوں' سفید ناگے کے جوگرز کے ساتھ.. آئی ہوپ کے آپ مجھے پہچان جائیں گے۔"

یہ پہلی بار تھا کہ وہ کورڈ مارکیٹ کے ٹھہراؤ میں داخل ہوا تھا اور اس کے پاس خریداری کی کوئی فہرست نہ تھی.. پارسی کے سٹور کے باہر وہ ذراہٹ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے پارسی کی نظر اس تک آجاتی تو وہ فوراً نہایت خوشدلی سے اسے خوش آمدید کہتا اور وہ یہاں یوں بے مقصد دیکھا نہیں جانا چاہتا تھا... اس نے بہت بے آرام اور مجرم سا محسوس کیا جیسے مارکیٹ میں داخل ہونے والا ہر شخص صرف اسے ہی شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے.. تھوڑی دیر کے بعد اس نے خرانٹ دکاندار کے شوکیسوں کی جانب نگاہ کی تو وہاں بہت لوگ تھے.. بچے اونی ٹوپیاں ٹرائی کرتے ہوئے.. جرابوں کی قیمتوں پر عورتیں جھگڑتی ہوئی اور کم از کم ایک مرد جو ایک انڈرویئر کو آنکھوں کے سامنے لا کر اس کے الاسٹک کو کھینچ کر اس کے اور اپنے سائز کا اندازہ لگا رہا تھا.. بہت سے لوگ تھے.. اور ان کے درمیان میں ایک لڑکی کی پشت دکھائی دے رہی تھی.. باب کٹ نیم سنہری بال اجرک کے کُرتے کی قربت میں آکر مختصر ہوتے جھولتے ہوئے اور ان میں سے کسی ایک لمحے میں سفید گردن کی ایک جھلک... اور پاؤں میں سفید جوگر... وہ ابھی جھجک میں تھا کہ اسی لمحے وہ شوکیس سے نظریں ہٹا کر پلٹی۔ اس کی آنکھیں متلاشی تھیں لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ ایک خلاء میں دیکھتی تھی اسے پہچانتی نہیں تھی.. وقت کی اس مختصر کترن میں اگر وہ وہی تھی۔ خاور نے

صرف اس کی نیلی آنکھوں کو دیکھا' جو بے راہرو' آوارہ اور خانہ بدوش تھیں' کہیں صحراؤں اور ویرانوں میں مقیم تھیں۔ بے لگام اور وحشی تھیں.. اور ایک مرتبہ آنکھیں جھپکنے کے تیز اور مختصر ترین وقفے میں خاور کی غیر جانبداری بے اثر ہو گئی...

عابدہ سومرو اور غلافی آنکھوں نے کبھی اس کے پورے وجود پر یوں دھاوا نہیں بولا تھا..

اور اس لمحے اس نے اپنے آپ سے کہا... ابھی وقت ہے.. تم فرار ہو جاؤ.. بچ نکلو.. کہ زندگی میں پہلی بار تم نیلاہٹ کے اس جال میں الجھ سکتے ہو.. خطرے کا سرخ نشان جل بجھ رہا ہے تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ ابھی وقت ہے..

نیلی متلاشی آنکھیں کورڈ مارکیٹ میں داخل ہونے والے ہر شخص کو پرکھ رہی تھیں..

شاید یہ وہ نہ ہو.. اس میں ابھی تک جھجک تھی جب وہ آگے ہوا.. "ڈاکٹر سلطانہ؟"

اس کی خالی آنکھیں یکدم بھر گئیں.. "یس آئی ایم.."

ایک نازک ملوک سی لڑکی جس کی نیلگوں آنکھیں اس کے سراپے کی جانب جانے ہی نہ دیتی تھیں جیسے سومنات مندر کے بُت کے ماتھے میں جڑا زمرد اس بُت کی ہیئت کو اپنی جگمگاہٹ سے چندھیا کر نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے..

"میرا خیال ہے آپ مجھے جانتی ہیں..."

"ہاں..." اس نے گردن ٹیڑھی کر کے سر جھٹکا تو باب کٹ بال بھی حرکت میں آگئے اور ان کی نیم سنہری چلمن میں سے اس کے ایک کان اور گردن کی جھلک آئی.. کہیں کہیں کوئی ایک آدھ بال سفید بھی تھا.. "میں یہاں بہت بے آرام محسوس کر رہی تھی.. شکر ہے کہ آپ وقت پر آگئے.."

"جی بالکل..." وہ بالکل ایک ٹین ایجر کی طرح نروس ہو گیا اور مخمصے میں پڑ گیا کہ اب کیا کیا جائے..

"کیا ہم یہیں کھڑے رہیں گے؟.." اس کا بدن دبلا اور سیدھا تھا اور اس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس پر زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں سمجھتی..

"آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟".. وہ اس خیال سے آیا تھا کہ کورڈ مارکیٹ کے برابر میں بازار روڈ کے ساتھ جو اوپن ایئر ریستوران ہے وہاں کچھ وقت گزار کر اسے بھگتا دیا جائے

گا.. لیکن وہ بھگتانے والی شکل کی نہیں تھی.. وہ غلافی آنکھوں کے بیان کردہ سراپے سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی تھی..

"جہاں ہم باتیں کر سکیں.. اطمینان کے ساتھ.."

دامن کوہ سے آگے بل کھاتی سڑک جب ہموار ہو کر پیر سہاوا تک پہنچتی تھی تو وہاں وے سائیڈ چائے خانوں میں بہت ہجوم تھا..

کچی سڑک پر اترتے ہوئے وہ اجنبی کار کے گیئرز سے الجھتا رہا لیکن ہمہ وقت اسے برابر کی نشست پر براجمان کسی وجود کا نہیں بلکہ نیلاہٹ میں ڈوبتی آوارہ خانہ بدوش آنکھوں کے ایک گہرے سمندر کے موجزن ہونے کا احساس ہوتا تھا جو اس کو اپنے اندر ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتا تھا..

ایک کرن چمکی تھی.. ایک رمق بیدار ہوئی تھی... پاگل خانے اور عابدہ میں یہ رمق کہیں نہ تھی اور وہ لاتعلق رہا تھا جذبات کی سطح پر... لیکن غیب سے یہ نیل کرائیاں نیلکاں جو تن من کو نیلو نیل کر رہی تھیں آنکھیں نازل ہو گئی تھیں اور ایک پرائی کار میں اس کے برابر میں پر سکون بیٹھی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ عقبی آئینے سے جھولتا موتیے کا بوسیدہ اور زوال پذیر ہار جس شخص کی ناک کو بھی چھو لیتا ہے تو وہ شخص اس کی مانند بوسیدگی اور زوال کا شکار ہے اور اس کے باوجود اس کی حیاتی میں پہلی بار ایک رمق بیدار ہوئی تھی.. اس کی ویران چراگاہ میں گھاس کے تنکے پھوٹے تھے..

"مجھے تم میں دلچسپی نہیں' موت میں ہے.. کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟"

"میں اس کی کوئی ایسی توجیح تو نہیں کر سکتا چند فقروں میں جو اسے بیان کر دے.. آج تک کوئی بیان کر پایا ہے جو میں کر سکوں.. میں اس کے بارے میں کبھی بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتا اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جنہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی وہ یا تو حواس کھو بیٹھے یا تارک الدنیا ہو گئے.. بیشتر مذاہب کی بنیاد ہی موت کا خوف ہے.. لیکن میں یہ جانتا ہوں ہر شے کی کشش چاہے وہ ایک منظر ہو یا شکل ہو فنا میں پنہاں ہے.. منظر میں یہی فنا کشش بھرتی ہے کہ میں نہ ہوں گا اور یہ سب کچھ ہو گا... اور

شکل تو خود فنا ہے اس کے وجود کا عناصر میں تحلیل ہو جانے کا ڈر ہی اسے حسن دیتا ہے.."

"نہیں.. یہ خیال ہے اور میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں.. کہ موت کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے؟"

"ایک لکھنے والا حساب کا سوال حل نہیں کر سکتا.. کوئی ایک درست جواب نہیں دے سکتا جو اسے پورے کے پورے نمبر دے دے.. میرا خیال ہے کہ میں وہ شخص نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے.."

"آپ کی ہر تحریر میں موت ہے اور میں طویل حوالے دے سکتی ہوں۔"

"یہ بالکل الگ بات ہے اگرچہ میں آپ کے ٹیلی فون سے پیشتر اس امر سے آگاہ نہیں تھا... میری تحریر کے پس منظر میں اگر موت کے سائے ہوتے ہیں تو میں انہیں خود جان بوجھ کر تخلیق نہیں کرتا۔ وہ اس تحریر اور اسے لکھنے والے کی بالآخر فنا کا پیغام ہوتا ہے جو خود بخود... بھیجنے والے کی خواہش کا تابع ہوتا ہے.."

"اگر میں ایک مثال دوں تو آپ اسے سن لیں گے؟"

"میں اتنے تردد سے آپ کو کورڈ مارکیٹ سے یہاں... اس ندی کی الگ تھلگ تنہائی میں لایا ہوں.. تو صرف اس لیے کہ بقول آپ کے.. ہم باتیں کر سکیں.. تو آپ باتیں کریں۔"

اگرچہ وہ یہ کہتے ہوئے مسکرایا تھا کہ شاید یوں گفتگو کا موضوع بدل جائے.. وہ کوئی اور بات کرے.. اپنے بارے میں.. اس سے کچھ پوچھے کچھ سنے.. لیکن اس نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں ندی کے بہاؤ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی.. وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا.. ایک کاروباری ملاقات میں تو آنکھوں کی نیلاہٹ یا ان کی خانہ بدوش بے راہروی زیر بحث نہیں آ سکتے.. یہ محض ایک بزنس میٹنگ تھی.. اور ایجنڈے پر صرف ایک ہی آئٹم تھی... موت!

وہ ٹانگیں سمیٹے.. ان کے گرد بازو حمائل کیے.. جیسے یوگی اپنی پگڑی کو ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر مزے سے بیٹھ جاتے تھے.. گھٹنوں پر سر رکھے اس کی موجودگی سے کسی حد تک لاتعلق پانیوں کو دیکھتی ہوئی اور یقیناً انہیں مزید نیلا کرتی ہوئی بولنے لگی "وہ ایک چمکیلا تیز روشنی والا دن تھا.. میں جس چہرے جس درخت کو دیکھتی تھی تو وہ نکھرا ہوا لگتا تھا اور میں اسے

چوم سکتی تھی۔ میں اتنی خوش تھی کہ میں خود اپنے آپ کو دیکھتی تھی تو وہ نکھرا ہوا لگتا تھا اور میں اسے چوم سکتی تھی۔ میں اتنی خوش تھی کہ میں خود اپنے آپ کو پھول دینا چاہتی تھی..

. میں نے ایک فلاور شاپ کے اندر جا کر اپنا پرس کاؤنٹر پر اُلٹا دیا اور فلارسٹ سے کہا کہ جتنی بھی رقم ہے مجھے اس کے پھول دے دو.. اور وہ ایک بہت ہی بڑا اور نا قابل یقین رنگوں والا بُو کے تھا اور اتنا بڑا تھا کہ دور سے میں نظر نہیں آتی تھی وہ بُو کے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور میں خوش تھی.. اور اس لمحے اگر کوئی گدا گر بھی مجھ سے مخاطب ہو کر صرف "ہیلو" کہہ دیتا تو میں وہ بُو کے اسے پیش کر دیتی میں اتنی خوش تھی۔ میں اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی اٹھائیسویں منزل پر لفٹ میں سے بُو کے جھلاتی سیٹیاں بجاتی نکلی اور اپنے فلیٹ کے دروازے میں چابی گھمادی.. امریکہ میں اپنے ذاتی فلیٹ میں داخل ہونا یکدم ایک ہول سے ایک خوف سے دوچار ہونا ہوتا ہے کیونکہ آپ باہر کی گہما گہمی اور زندگی کے شور کی قوت میں سے یکدم الگ ہو جاتے ہیں اور فلیٹ کے اندر ایک خاموش کھا جانے والی ویرانی کا راج ہوتا ہے.. لیکن آج میں اس ویرانی کا بھی سامنا کر سکتی تھی.. میں نے ابھی چابی پوری طرح نہیں گھمائی تھی کہ مجھے فلیٹ کے اندر مسلسل بجتی ٹیلی فون کی گھنٹی کی مدھم سی آواز سنائی دینے لگی.. میں نے تالہ کھلتے ہی دروازے کو کندھے سے دھکیلا اور بھاگ کر رسیور اٹھالیا..

میری ماں تھی..

میں نے اپنی ماں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ مجھے خواہ مخواہ فون نہ کیا کرے.. صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ بیٹی تم کیسی ہو.. کب واپس آ رہی ہو.. کھانا کھا چکی ہو یا نہیں.. میرے دیئے ہوئے قرآن کا کوئی ورق پڑھا ہے کہ نہیں.. اس قسم کی بے مقصد باتوں کے لیے مجھے فون نہ کیا کرے.. اور اس نے ایک عرصے سے ایسا نہیں کیا تھا.. تو اس کی آواز سن کر ایک ابال سا اٹھا.. تشویش کا ایک مرغولا سا گھومنے لگا کہ میری ماں نے اگر فون کیا ہے تو کچھ ہوا ہے..

"ظفر مر گیا ہے.." لاچار بھرائی ہوئی آواز میں اس نے صرف اتنا کہا..

ایک فلمی منظر کی طرح رسیور میرے ہاتھ سے گر گیا.. اور جو بُو کے میں نے کسی کے لیے بھی نہیں خریدا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر بکھر گیا... میں بھی شاید مر گئی تھی اس لیے کہ میں ظفر سے محبت کرتی تھی..

اگرچہ اس کی شادی میری چھوٹی بہن سے ہو رہی تھی لیکن.. میں تھی جو اس کے ساتھ محبت میں مبتلا تھی اور ظاہر نہیں کرتی تھی..

تمہیں تو پتہ ہے کہ مشرقی اقدار میں اپنی محبت کی قربانی دینا اور چُپ رہنا کتنا قابل تحسین اور عظیم فعل ہے.. اگرچہ میں مشرقی اقدار کی کوئی ایسی پابند بھی نہ تھی۔

مجھے اپنے باپ کی سائیکل ابھی تک یاد ہے.. اس کے ہینڈل پر لگی گھنٹی کو بار بار بجانا میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہوتی تھی.. وہ گھنٹی گویا کسی جادو سے بھری تھی جو میرے ننھے منے ہاتھ کی جانب شعاعیں بھیجتی تھی کہ میرے قریب آؤ.. تمہارا انگوٹھا بہت منا سا ہے اور نرم ہے اور تمہیں بہت زور لگانا پڑے گا اس دروازے کو کھولنے کے لیے لیکن سنو میں تمہیں ایک بات بتاؤں کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور جونہی تم اپنا انگوٹھا مجھ پر جماؤ گی تو تمہیں زور لگا کر دھکیلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی میں خود بخود تمہیں جادوئی موسیقی سنانے لگوں گی... اور میں ڈرتی ڈرتی لطف سے لرزتی اپنے باپ کی جانب کن اکھیوں سے دیکھتی اور اس کے چہرے پر "شاباش بیٹی.. بجاؤ" کی مسکراہٹ ہوتی اور میں اپنا انگوٹھا گھنٹی پر رکھ دیتی۔ اور واقعی وہ اپنے وعدے کے مطابق صرف میرے لمس سے ٹنن ٹنن بجنے لگتی... بعد کی زندگی میں.. جب میں امریکہ میں تھی.. جب کبھی میں نے گزشتہ زندگی کے بندھے ہوئے ساکت اقدار کو توڑا.. الکوہل کا جو بھی گھونٹ بھرا... کسی مرد کے ساتھ آشنائی کا پہلا قدم اٹھایا تو وہ گھنٹی کہیں نہ کہیں سے ٹنن ٹنن کرتی میرے کانوں تک آ جاتی تھی اور پھر ان کے پردے اپنے لیے بند پا کر لوٹ جاتی تھی.. میں سنتی تھی اور ان سنی کر دیتی تھی..

اپنے باپ کو.. بابا کو... جب میں نے سوچا' سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے سر جھکا کر ہمارے کچے مکان کے چھوٹے سے دروازے میں سے داخل ہوتے ہوئے سوچا! میں بھی انہیں اس سائیکل سے الگ نہ کر سکی.. نہ کبھی صرف ان کا چہرہ میرے ذہن میں آیا نہ کبھی وہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے' سکول رجسٹر پر گئی رات جھکے ہوئے' پہلی تاریخ کو ناکافی تنخواہ کو بار بار گنتے ہوئے' ماتھے پر معاشی تنگی کی سلوٹیں لئے ہوئے میں نے کبھی انہیں نہ دیکھا۔ بعد کی زندگی میں وہ ہمیشہ سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ دھرے اپنی پرانی عینک درست کرتے میری جانب دیکھتے تھے۔

ان کی سائیکل بہت آراستہ پیراستہ ہوتی تھی.. تم کہہ سکتے ہو کہ فلی لوڈڈ ہوا کرتی

تھی۔ایئر پمپ اور ڈائنمو لائٹ کے ساتھ 'پچھلا ٹائر جتنی تیزی سے گھومتا لائٹ اتنی ہی تیز اور روشن ہوتی تھی... پچھلے مڈگارڈ پر سرخ اور زرد گول گول ریفلیکٹر لائٹس.. ہینڈل پر ایستادہ پلاسٹک کے پھولوں کا چیپ گلدستہ جس پر دھول جمی ہوتی تھی.. اس کے آگے بید کی آف وہائٹ نازک سی ٹوکری جو ہمیشہ ڈھلکی رہتی... وہ اتنی نازک تھی کہ بابا اس میں بہت کم کوئی چیز رکھتے کہ کہیں اسکے وزن سے وہ مزید نہ ڈھلک جائے۔ خراب نہ ہو جائے.. ہینڈل بار میں طرح طرح کے چوکور اور بیضوی آئینے کسے ہوتے تھے.. گھنٹی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں اپنے چہرے کی مسرت اور بے پایاں لطف کو انہی آئینوں میں دیکھتی تھی.. ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے وہ پورے پانچ روپے الگ کرتے... اپنے گھسے ہوئے تلووں والے شوز کے لیے نہیں اور نہ ہی ایک نئی عینک کے لیے بلکہ سائیکل کی آرائش کے لیے... وہ اس روز سکول سے لوٹتے تو ان کا چہرہ دمک رہا ہوتا.. وہ گھر میں داخل ہو کر گدی کو گرفت میں لیکر سائیکل کو ذرا اوپر اٹھاتے اور دائیں پاؤں سے پچھلے ٹائر کے درمیان میں معلق سٹینڈ پر بوجھ ڈال کر اسے نیچے کر کے سائیکل کو کھڑا کر دیتے.. اور پھر میری جانب تکنے لگتے 'پُر اشتیاق اور داد طلب نگاہوں سے صرف میری طرف دیکھتے کہ صرف میں تھی جو ان کی ہمراز تھی.. میں نہایت سنجیدہ اور پر تحقیق چہرہ بنائے سائیکل کی ایک ایک چیز کو نظر سے گزارتی جاتی اور پھر یکدم کسی ایسے پلاسٹک کے پھول 'سٹکر یا آئینے پر ٹھہر جاتی جو پہلے وہاں نہیں تھا اور میں شرارت سے بابا کو دیکھتی اور ان کا چہرہ اس تشویش سے بھر جاتا کہ کہیں میں نے ان کی پانچ روپے سے حاصل کردہ تازہ ترین آرائش مس تو نہیں کر دی.. اور جب میں کھلکھلا کر ہنس دیتی تو ان کی جان میں جان آتی اور پھر ہم دونوں باپ بیٹی دیر تک اس نئے پھول یا سٹکر یا آئینے کو ایک انمول خزانے سے کہیں بڑھ کر محبت اور چاؤ سے دیکھتے رہتے...

میری ماں 'ایک غصیلی طبیعت کی عورت.. معاشی مسائل نہ بھی ہوتے تو بھی وہ اسی طبیعت کی ہوتی.. بابا اور میرے اس مشترکہ سائیکل افیئر کو سخت ناپسندیدگی سے دیکھتی اور جانے کیا بڑبڑاتی رہتی..

اتوار کے روز چھٹی ہوتی اور وہ مجھے اٹھا کر سائیکل کے آگے درمیانی راڈ پر نصب ایک چھوٹی سی گدی پر بٹھاتے جو انہوں نے صرف میرے لیے وہاں لگوائی تھی۔ ایک پرانے دستر خوان میں تین روٹیاں 'اچار کی پھانکیں اور دو ابلے ہوئے انڈے باندھ کر انہیں اپنی

لاڈلی بید کی ٹوکری میں رکھتے اور ہم دونوں سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی سرخوشی میں مست اور لہکتے ہوئے.. اوڑک جانے والی سڑک پر راونہ ہو جاتے.. بابا پر جوش انداز میں پیڈل مارتے ذرا آگے جھک کر کوئی قصہ کہانی شروع کر دیتے.. جب ان کا خلجی خانہ بدوش باپ انہیں دیئے کی روشنی میں کتابوں اور کاپیوں پر مسلسل جھکا دیکھتا تھا اور اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کا یہ بیٹا اونٹوں اور خیموں کی بجائے کاغذوں میں کیوں گم ہوتا ہے.. یا جب وہ میٹرک میں پاس ہوئے تھے تو ان کے قبیلے والے یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ انہیں جشن کرنا چاہیے یا سوگوار ہونا چاہیے.. اور جب انہیں شہر میں ملازمت ملی تھی اور انہوں نے ایک شہری لڑکی اس کی ماں سے شادی کر لی تھی.. اور جس روز میں پیدا ہوئی تھی تو چلتن کی پہاڑیوں کے رنگ کیسے گلابی ہو گئے تھے.. اور بابا اس کہانی میں اپنی طرف سے تب تک اضافہ کرتے چلے جاتے جب تک کہ سڑک حنا جھیل کو دائیں ہاتھ پر فراموش کرتی ہوئی اوڑک کے سیبوں کے گھنے باغوں کے اندر تک نہ چلی جاتی..

اور پھر ان میں سے کوئی ایک باغ ہوتا جو ماموں فقیر اللہ نے اس برس ٹھیکے پر لیا ہوتا اور وہیں.. ظفر ہوتا۔

وہ درختوں کی جڑوں کو ایک دوسرے سے ملاتی برفانی پانیوں کی نالیوں میں سے ریت نکالتا 'ان کے راستے میں مٹی کے ڈھیر حائل کرتا ان کے رخ ایسے بدلتا کہ وہ باغ کے آخری درخت کو بھی سیراب کریں.. چھینٹے اڑاتا ظفر ہوتا..

وہ تقریباً میرا ہم عمر تھا۔

مجھے شلوار کے اوپر اس کے سفید ننگے بدن کا ایک ایک رؤاں اور بل یاد ہے..

ابھی شاہانہ پیدا نہیں ہوئی تھی..

باغوں کے اندر پکے ہوئے سیبوں اور پانیوں کے بہنے کی جو ٹھنڈی مہک ٹھہری ہوتی تھی.. اس نے امریکہ میں بھی میرا پیچھا کیا..

بابا کی سائیکل کی گھنٹی نے.. ظفر کی شلوار کے اوپر جو اس کا سفید بدن تھا اور سیبوں کے رس نے اور انہیں رس بھرا بنانے والے پانیوں کی مہک نے امریکہ میں مجھے ایک مجرم کی شرمندگی سے دوچار رکھا..

پہلا اتوار تھا جب میں چھٹی جماعت میں گئی تھی۔ میں بستر میں لیٹی بابا کی گھنٹی کی

منتظر رہی.. کب اس کی ٹن ٹن کی آواز آئے اور میں چھلانگ لگا کر چارپائی سے اتروں اور تیار ہونے لگوں..

مجھے چھلانگ لگا کر اپنے بستر سے باہر آنا تھا.. منہ ہاتھ دھونا تھا.. تین روٹیاں اچار کی پھانکیں ابلے ہوئے دو انڈے ایک دستر خوان میں بندھے بید کی ٹوکری میں.. اور ٹن ٹن اوڑک جانے والی سڑک.. جس کے آخر میں سیبوں کے بوجھ سے کبڑے ہونے والے درخت اور ان کے نیچے نالیوں میں چھینٹے اڑاتے ظفر کو ہونا تھا..

میں نے انتظار کیا.. ماں گہری گھوک نیند میں تھی اور بابا کروٹیں بدل رہے تھے "بابا دیر نہیں ہو گئی؟"

"آج نہیں جانا بیٹی.." عجیب دکھ ان کی آواز کو بجھاتا تھا..

"لیکن کیوں بابا.. آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں.."

"تو پھر کیوں نہیں جانا بابا.."

"تم اب بڑی ہو گئی ہو.." انہوں نے ایک اور کروٹ بدلی اور منہ پرے کر لیا..

ہمارے گھر کی کچی دیواریں اس اتوار کے بعد ذرا اونچی ہو گئیں.. اور ان کے آگے اور دیواریں وجود میں آ گئیں.. دروازے کے آگے ایک کھلا ویرانہ تھا اس پر بھی پردہ پڑ گیا.. ان کے پار جانے کی اجازت اب مجھے نہ تھی۔

ظفر دو چار ماہ بعد ماموں فقیر اللہ کے ہمراہ ہمارے گھر آتا.. لیکن اب اس کا گورا اور کومل سینہ ڈھکا ہوتا اور وہ چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا رہتا.. نظریں نیچی کئے جیسے اس کے پپوٹے پتھر کے ہو گئے ہوں اٹھ نہ سکتے ہوں.. میں اپنے آپ کو ماں کی ہدایت کے مطابق لپیٹ لپاٹ کر ایک مردے کی طرح ڈھکی ہوتی صرف ماموں کو سلام کرنے کے لئے کوٹھڑی میں سے باہر آتی اور پھر کھڑے کھڑے واپس چلی جاتی.. ذرا سی تاخیر ہوتی.. سلام کے بعد ذرا سا وقفہ آتا اور میں صرف ایک نظر سر جھکائے زمین کو گھورتے ظفر کو دیکھتی تو اسی لمحے شاہانہ کو گود میں سنبھالتی ماں کی غصیلی آواز آ جاتی "سلطانہ.." اور میں اندر چلی جاتی..

وہ دیواریں اور پردے ہر نئے دن کے ساتھ دبیز اور اندھے ہوتے گئے.. بابا مجھے خود سکول چھوڑنے جاتے اور چھٹی ہوتی تو ان کی بجی ہوئی سائیکل کے راڈ پر نصب چھوٹی سی

گدی میرے بیٹھنے کی منتظر ہوتی.. لیکن اب میں اس پر آسانی سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ وہ بہت چھوٹی رہ گئی تھی اور اور میرا بدن اس سے بڑا ہو گیا تھا.. اور پھر میں بڑی کلاسوں میں ہونے لگی اور بابا مجھے لینے آتے تو وہ میرا ماتھا چوم کر سائیکل کے ہینڈل کو تھام کر پیدل چلنے لگتے اور میں سفید چادر میں گھونگھٹ نکالے ان کے برابر میں ٹھوکریں کھاتی چلتی جاتی اور اس مختصر سی گدی کو تکتی رہتی اور مجھے یقین نہ آتا کہ کبھی میں اس پر بھی پوری آ جاتی تھی.. بابا کی سائیکل بہت پرانی ہو گئی تھی..

ماں نے بہت مخالفت کی.. تین دن بابا کو کھانے کے لئے کچھ نہ دیا.. پھر بھی انہوں نے میٹرک کے بعد مجھے کالج میں داخل کرا دیا..

وہ دیواریں اور پردے میرے وجود کا ایک حصہ بن چکے تھے.. اور ان کے پار کبھی کبھار مجھے ظفر کی جھلک نظر آ جاتی جس نے تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر اب فروٹ مارکیٹ میں آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا تھا..

ایم اے معاشیات میں.. میں نے پورے صوبے میں ٹاپ کیا..

دوسرے صوبوں میں طالب علم خواب دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی غیر ملکی سکالر شپ نصیب ہو جائے لیکن ہمارے ہاں سرکاری دفاتر میں.. چیف منسٹر اور سیکرٹریز کی میزوں پر ایسے سکالر شپ پڑے پڑے آؤٹ ڈیٹڈ ہو جاتے ہیں کیونکہ مراعات یافتہ طبقے کے بچے پڑھائی سے دور بھاگتے ہیں اور ہم جیسوں کی پسماندگی میں سے کوئی نکل ہی نہیں سکتا جو ان سکالر شپس پر اپنا حق جتا سکے۔

ماں نے پھر بھرپور مخالفت کی.. نہ صرف بابا کو بلکہ مجھے بھی کئی روز کھانے کے لئے کچھ نہ دیا.. چولہا گرم نہ کیا اور ہم افغانی تندور سے روٹیاں لا کر اچار سے کھاتے رہے.. شاہانہ ابھی ہائی سکول میں تھی..

انہی دنوں بابا ریٹائر ہو گئے.. "میں ایک نئی سائیکل بھی نہیں خرید سکتا" انہوں نے اس شام میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا "ساری عمر کی ٹیچنگ کے بعد اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے.. نہ کچھ سامنے نظر آتا ہے۔ تم جاؤ.. پی ایچ ڈی معمولی بات نہیں ہوتی۔ ہمارے خاندان میں تو کیا اس پورے علاقے میں کوئی بلوچ لڑکی ایسی نہیں ہے جس نے ڈاکٹریٹ کی ہو.. تم جاؤ.. لیکن واپس آ جانا"

"اب بھی.." جیسے اس کی ہتک ہو گئی ہو اس نے ایسے.. اگرچہ مسکرانے کی کوشش میں کہا..

"اب بھی کیا؟"

"تم مردوں کو استعمال کرتی ہو؟"

"یہ تو مرد پر منحصر ہے.." اس نے خاور کے بازو کو دبایا "لیکن.. اب نہیں۔"

"اب کیوں نہیں.." اس کے لہجے میں ایک بچے کی رنجیدگی تھی..

آس پاس اور دیوار کے سائے میں بچھی چارپائی.. اور ابھی تک زمین پر بچھے اس کھیس کے سامنے جس پر سلطانہ کھڑی ہوئی تھی.. اس کے سامنے جو پہاڑیاں تھیں وہ مویشیوں سے خالی ہو چکی تھیں.. اور ان پہاڑیوں کے اندر جانے کتنے جولیاں ابھی تک مدفون تھے.. سائے میں جا رہی تھیں.. ایک ایسی سناٹے میں ڈوبی تنہائی تھی جو صرف کھنڈروں کے اندر جنم لیتی ہے اور وہ بھی ہزاروں برس پرانے آثار کے اندر..

"تم سننا چاہتے ہو کہ اب کیوں نہیں..."

"اگر تم سنانا چاہتی ہو تو..."

"میں سنانا تو چاہتی ہوں.. کسی نہ کسی کو شریک کرنا چاہتی ہوں.. اپنے لیے ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں.. صرف اس لیے کہ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اس طرح وقت کے بہاؤ میں بہتا ہوا اپنی جڑوں سے دور ہو جاتا.."

میں ہمیشہ کسی بھی شے ' منظر یا کسی بھی رشتے سے چاہے وہ کتنا ہی عارضی اور سرسری کیوں نہ ہو.. جدا ہونے پر اس کی جدائی کا کرب ساتھ لے آتی تھی.. یہاں تک کہ میں اپنی کسی من پسند خوراک کا آخری لقمہ لیتے ہوئے.. اسے منہ تک لاتے ہوئے بھی جھجکتی تھی کہ یہ آخری ہے.. بابا کے ہمراہ اوڑک کے باغوں میں دن گزارنے کے بعد سڑک پر آتے ہی.. جونہی وہ مجھے گدی پر بٹھا کر پیڈل پر پاؤں مارتے تو مجھے ان درختوں سے الگ ہونے کا قلق ہونے لگتا.. میری ماں ہمیشہ اضطراب اور غصے کی حالت میں ہوتی تھی بہت کم پر سکون اور اطمینان میں ہوتی تھی اور جب ایسی ہوتی تھی تو جب بھی مجھے دیکھ کر مسکراتی تھی تو اس کی مسکراہٹ ماند پڑنے سے پہلے ہی اس کے گم ہو جانے کا دکھ میرے اندر جڑیں پکڑنے لگتا

تھا.. مجھے قلق ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ آخری بار ہوا ہے اور اس کے بعد فنا ہے یہ دوبارہ نہیں ہوگا... امریکہ میں پہلے چند ماہ تو شدید مغائرت ' گھر کی اداسی اور رشتوں سے بچھڑنے کے رنج میں گزرے... ہمہ وقت میرے کانوں میں بابا کی سائیکل کی گھنٹی بجتی رہتی.. مجھے نیند نہ آتی.. اور آدھی رات کو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور میرے ہوسٹل کے کمرے میں سیبوں کی مہک رچی ہوتی.. جیسے میرا بیڈ اوڑک کے کسی درخت تلے بچھا ہے.. ماں کا چہرہ.. غصیلا ' دکھ بھرا ابر دم نظروں کے سامنے آتا.. کبھی اس کے نقش دھندلانے لگتے ' آؤٹ آف فوکس ہو جاتے اور پھر میں بہت ہی ہمہ تن متوجہ ہو کر... امریکہ اور پاکستان کے درمیان فاصلوں کو منفی کر کے اپنے کچے گھر میں داخل ہو جاتی.. ذہن کے لیور کو گھما کر اسے پرفیکٹ فوکس میں لے آتی.. اور پھر رونے لگتی.. وہاں انسان جی بھر کے رو بھی نہیں سکتا کیونکہ آپ کی کوئی کلاس فیلو ' بیدار ہو کر آ جائے گی اور اس کا خیال ہو گا کہ تم اپنے کسی بوائے فرینڈ کی بے وفائی پر اپ سیٹ ہو.. گھر کے لیے ماں باپ کے لیے اور مٹی کی اداسی کے لیے رونے کا وہاں کانسپٹ نہیں ہے..

میں ایک اجنبی قبیلے کے اجنبی رسم و رواج میں تھی.. میری کشتی ڈوب چکی تھی اور میں تیرتی ہوئی ایک ایسے جزیرے میں جا پہنچی تھی جہاں کے لوگوں کی شکلیں اور رواج مختلف تھے ' رہن سہن کے انداز عجیب سے تھے اور میں ان میں ایک گمشدہ بچے کی طرح ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی..

تم جانتے ہو کہ انتھروپولوجی کیا ہے.. یہی کہ آپ اپنے معاشرے اور اس کی اقدار سے اور رہن سہن سے کٹ کر اس سے سراسر مختلف قبیلے میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر سوال کرتے ہیں.. ان لوگوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ انسان زندگی کو ایک مختلف سانچے میں کس طور بسر کرتے ہیں.. ان کے رشتوں کی نوعیت کیا ہے.. پیدائش اور موت پر ان کے کیا ردعمل ہوتے ہیں... انہیں سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں.. کہ یہی علم الانسان ہے.. میں نے بھی اُس معاشرے کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کی.. لیکن اپنے آپ کو ایک ریسرچ سکالر کی طرح الگ تھلگ ہو کر یہ مشاہدہ نہ کیا بلکہ آہستہ آہستہ میں ایک غیر محسوس طریقے سے اس معاشرے کے دھارے میں شامل ہو گئی یہاں تک کہ اس کے بہاؤ میں بے اختیار بہنے لگی.. میں ذہنی اور بدنی طور پر اُس آبائی دھارے کو فراموش کر گئی جس میں

سے کٹ کر میں ادھر ایک اجنبی قبیلے میں نکل تھی... اب میں ان سے جدا ہو کر ایک محفوظ فاصلے پر بیٹھ کر ان کا مشاہدہ نہیں کر رہی تھی بلکہ اس قبیلے کا ایک فرد ہو گئی تھی.. ان کی طرز رہائش' اخلاقی اقدار اور زندگی کرنے کے ڈھنگ میرے اپنے ہو گئے' پر ایسا نہیں کہ میں نے اپنے پس منظر اور ماضی کے رشتوں کو یکسر فراموش کر دیا.. انسان تو لاشعوری طور پر ہزاروں برس کی اجتماعی یادداشت کو بھی نہیں بھلاتا.. بس یہ تھا کہ سائیکل کی گھنٹی کی آواز جب بھی سنائی دیتی تو پہلے کی طرح میرے کانوں کے پردوں اور احساسات پر حاوی نہ ہوتی.. بہت دور کسی گہری غار کے اندر ملفوف سنائی دیتی.. اور سیبوں کی جو مہک تھی وہ میری ڈریسنگ ٹیبل پر آراستہ یوڈی کولون اور پرفیوم کی بوتلوں میں مکس اپ ہو جاتی اور میں کوشش کے باوجود اسے الگ کر کے سونگھ نہ سکتی.. ان کا وجود تھا لیکن ایسے دھندلکوں میں گم ہو گیا تھا جن تک میری رسائی نہ ہو سکتی تھی.. جیسے مدتوں پہلے مر جانے والے ایک عزیز کی یاد ہوتی ہے.. وہ بدن کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں مقیم تو ہوتی ہے لیکن وہ لمحہ' موجود میں آپ کی زندگی پر کہیں اثر انداز نہیں ہوتی... میرا قبیلہ بنی اسرائیل کے گمشدہ قبیلے کی مانند یاد کے صحرائے سینا میں کہیں تھا تو سہی لیکن میں اس سے جدا ہو کر ایک اور قبیلے کا فرد بن چکی تھی.. نہ صرف ان کے رواجوں کو قبول کر چکی تھی بلکہ انہیں مکمل طور پر اپنا کر اس میں اپنی شناخت کھو چکی تھی ... خاور... وہ لوگ زندگی کا تجربہ نہیں رکھتے جو یہ کہتے ہیں کہ ماں کی شفقت اور باپ کا سایہ کبھی نہیں بھولتا.. خون جوش مارتا ہے کبھی نہیں بدلتا.. سب کچھ بھول جاتا ہے بدل جاتا ہے صرف انسان اس کا اقرار نہیں کرتا.. میں کرتی ہوں.. اور اس میں کوئی شرمندگی نہیں ہے..

ڈاکٹریٹ کے بعد مجھے فوری طور پر اپنی ہی یونیورسٹی میں جاب آفر ہو گئی.... وہاں لوگ خواب دیکھتے ہیں ایسی اوپننگ کے اور میں نے اس کے لیے کوئی کوشش کوئی تردد نہ کیا اور جاب کی آفر میرے ہوسٹل کے کمرے تک خود آ گئی.. ویری لیوکریٹو.. مستقبل کے وسیع اور روشن امکانات کے ساتھ.. امریکہ دی لینڈ آف اپورچیونٹی.. اس نے مجھے گھر بیٹھے یہ اپورچیونٹی آفر کر دی.. میں پہلے سے زیادہ خود مختار ہو گئی.. اپنا کماتی تھی اور بہت کماتی تھی اور اپنا کھاتی تھی..

انہی دنوں گینگ کے کسی ایک رکن کے فلیٹ میں حسب معمول کسی بہانے ایک پارٹی تھی.. کہ آج فریڈی کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے.. آج میو تو.. نائیجیرین کی گوری گرل

فرینڈ نے اسے پہلا بوسہ دیا ہے... کیتھرین بالآخر اس مرد کو پھانسنے میں کامیاب ہو گئی ہے جو اسے گھاس ہی نہیں ڈالتا تھا.. وانگ وا چائنہ مین کی ماں نے اسے ہانگ چو کی چائے کا پیکٹ بھیجا ہے.. یا پھر کسی نے قریب آ کر یہ دریافت کر لیا ہے کہ ڈاکٹر سلطانہ شاہ کی آنکھیں نیلے کانٹیکٹ لینز لگانے کی وجہ سے اس رنگت کی نہیں ہیں بلکہ سچ مچ آئرش آنکھوں کی طرح مسکراتی اور نیلگوں ہیں.. اور یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ ایک پاکستانی لڑکی کی آنکھیں نیلی رنگت کی ہوں.. اور اگر یہ ہو گیا ہے تو اسی حیرت اور خوشی میں ایک پارٹی..

کسی بھی بہانے ہر شب... گینگ کے کسی بھی رکن کے فلیٹ یا گھر میں ایک پارٹی..

ایک ایسی ہی پارٹی تھی۔

لیکن اس شب ہم سب.. پندرہ بیس لڑکے اور لڑکیاں.. سب کے سب پروفیشنل.. ٹیچرز.. آرکی ٹیکٹس اور ڈاکٹرز.. اس فلیٹ میں پینے کو جو کچھ موجود تھا اسے اپنے اندر انڈیلتے گئے اور کچھ زیادہ ہی ڈرنک ہو گئے.. اتنے زیادہ کہ دو چار ڈرنکس کے بعد جو جوڑے چپکے سے کھسک جاتے تھے کسی بیڈ روم میں یا جگہ نہ ہو تو باتھ روم میں الگ ہو جاتے تھے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر گینگ کو "ہائے ایوری باڈی" کہہ کر منہ پونچھتے بار بار لباس درست کرتے پارٹی میں پھر سے شامل ہو جاتے تھے وہ بھی اس درجے کے خمار میں آ گئے کہ بدن اور جنس کو بھی فراموش کر گئے۔

ہم سب دنیا کو برباد کر دینا چاہتے تھے۔

ہم ایسی خوشی اور مستی میں تھے کہ پورے نیویارک کو اپنے نشے سے بل ڈوز کر سکتے تھے۔

جب فلیٹ میں آبی ذخیرے کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی.. اور بوتلوں کو اٹھا کر ان کی پشت پر تھپکیاں دینے کے باوجود ان میں سے شراب کا ایک قطرہ بھی برآمد نہ ہوا تو ہم سب غل کرتے' ایک اور بُوند کے لیے پاگل ہوتے' لڑھکتے اور ٹھوکریں کھاتے اور خداؤں ایسے یقین کے ساتھ کہ ہم کبھی فنا نہیں ہوں گے.. فلیٹ کے نیچے آئے.. جانے کیسے ففتھ ایونیو تک جا پہنچے اور اس کے ہر شراب خانے اور ریستوران کے دروازوں کو دھکیلتے اندر داخل ہو جاتے.. گرتے پڑتے شراب کی ڈیمانڈ کرتے.. میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ ہمیں شدید نفرت اور ناپسندیدگی سے دیکھتے لیکن ہمیں تو ان کے چہرے بھی نظر نہیں آ رہے

تھے ان کی نفرت اور ناپسندیدگی کیسے نظر آ جاتی.. ہم ان کے آگے دھری ڈرنکس بھی اٹھا اٹھا کر اپنے اندر انڈیلتے گئے.. کہاں کہاں سے ہمیں زبردستی نہ نکالا گیا.. ویٹرز نے کسی ریستوران میں سے ہمیں دھکے دے کر نکالا.. کسی شراب خانے میں پولیس بھی آ گئی تھی.. ہمیں کیا پرواہ تھی۔

ہم تو نیویارک کی تمام بلڈنگوں کو بل ڈوز کر دینے کے موڈ میں تھے.. انہیں ڈھانے کے لیے آئے تھے' دنیا فتح کرنے کے لیے آئے تھے..

مجھے بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ ساتویں آسمان پر ہوں یا کسی بے خود گہرائی میں گری بے تحاشہ قہقہے لگا رہی ہوں' کچھ پتہ نہ تھا.. لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں پیومنٹ پر اکیلی کھڑی ہنس ہنس کر دوہری ہوتی چلی جاتی ہوں اور جس امریکی لڑکے نے مجھے میرے فلیٹ پر ڈراپ کرنا تھا وہ کہیں آس پاس دکھائی نہیں دے رہا.. شاید وہ کسی گٹر میں گر گیا ہے' کسی ٹرام کے نیچے آ گیا ہے یا کسی ہسپتال میں ہے' کچھ پتہ نہ تھا۔

صرف میں تھی.. اور فٹ پاتھ پر اکیلی کھڑی' لڑکھڑاتی قہقہے لگا رہی تھی... انجائے کر رہی تھی۔ میری آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا.. کبھی میں ہنستے ہنستے دوہری ہو کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھتی تو وہ ہاتھوں کا بوجھ نہ سہار سکتے اور میں گر جاتی... اور گر کر پیومنٹ پر ٹانگیں پھیلائے لیٹ جاتی اور اسے چوم کر بار بار "ہیلو" کہتی.. لیکن پیومنٹ کے پتھر جواب نہ دیتے اور میں ناراض ہو جاتی۔ میں آخری بار گری تو وہیں فٹ پاتھ پر سو جانا چاہتی تھی لیکن میرے اندر کہیں خطرے کی کوئی گھنٹی بجتی تھی۔ شاید میرے بابا کی سائیکل کی گھنٹی تھی جو کہتی تھی' اٹھو.. تم نے گھر جانا ہے.. اٹھو.. اور میں گرتی پڑتی ڈولتی اور کبھی دو چار قدم آگے اور کبھی پیچھے ہوتی کسی نہ کسی طرح پھر سے کھڑی ہو گئی لیکن میرے قہقہے تھمنے میں نہ آتے تھے ..جب میں پیومنٹ پر گرتی تھی تو ٹانگیں پھیلانے سے وہ کولہوں تک برہنہ ہو جاتیں.. کیونکہ میں شلوار قمیض کو ایک عرصے سے ترک کر چکی تھی اور اب ایک لمبا سکرٹ پہنتی تھی.. لیکن کسے پرواہ تھی' وہ پہلی بار تو برہنہ نہیں ہوئی تھیں..

تم نے گھر جانا ہے.. تم نے گھر جانا ہے.. گھنٹی مجھے خبردار کرتی رہی..

"ٹیکسی۔ ٹیکسی" میں جو بھی کار گزرتی دیوانہ وار دونوں ہاتھ لہراتی' اس کے سامنے آ جاتی اور اسے روکنے کی کوشش کرتی.. پھر مجھ میں سکت نہ رہی اور میں وہیں فٹ پاتھ

پر کھڑی ہاتھ ہلاتی "ٹیکسی ٹیکسی" پکارتی رہی.. بالآخر ایک ٹیکسی کہیں سے نمودار ہوئی اور فٹ پاتھ کے کنارے کے ساتھ آ گئی.. میں نے اس کے پچھلے دروازے کے ہینڈل کو بمشکل اپنی آنکھوں سے فوکس میں کیا کیونکہ ہر شے دوہری تہری اور دھندلائی ہوئی نظر آ رہی تھی ..اور جب وہ ہینڈل تین ہینڈلوں کی بجائے ایک میں سمٹ کر آیا تو میں نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مبذول کی' بار بار اپنے آپ کو کہا کہ سلطانہ یہ ہینڈل ہے.. تم نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا ہے اور اسے کھینچ کر دروازہ کھول کر ٹیکسی کے اندر جانا ہے....

مجھے اصولاً تو اس لمحے اتنی رات گئے' نیویارک شہر میں' ایسی حالت میں کسی بھی ٹیکسی پر سوار ہونے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا' لیکن اس لمحے میرے لیے نہ تو کوئی اصول تھا اور کوئی دن تھا اور نہ کوئی رات تھی اور میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا جو پہلے سے بگڑا ہوا نہیں تھا۔

میں پچھلی نشست پر جھول کر گری اور پھر سر جھٹک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سوبر ہونے کی کوشش میں مسکرانے لگی..

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے وہ سوال نہیں کیا جو وہ ہر سواری سے کرتے ہیں کہ میم آپ کہاں جائیں گی۔ اس نے میرے بیٹھتے ہی ٹیکسی سٹارٹ کر دی اور اپنا بیک ویو مرر ایڈجسٹ کیا اور مائنڈ یو اس کے ساتھ مرجھائے ہوئے موتیے کے پھولوں کا کوئی ہار نہیں لٹکتا تھا..

وہ کوئی سیاہ بالوں والا نہایت ہینڈسم شخص تھا میں اس کے سر کے پچھلے حصے سے اندازہ لگا سکتی تھی۔

اس کے ڈیش بورڈ پر ایک چمکیلا فلوروسنٹ سٹکر چسپاں تھا جس پر جب کبھی پیچھے سے کوئی کار آتی تو اس کی لائٹس سے وہ اتنا روشن ہو جاتا کہ میری آنکھوں میں چبھنے لگتا۔ میں آنکھیں میچ کر اسے پڑھنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی عبارت دوہری تہری ہو کر گڈمڈ ہو جاتی.. ناآشنا سے لفظ تھے جو میری آنکھوں کے سامنے رکتے نہ تھے اور خمار کے باعث مسلسل حرکت کرنے لگتے تھے۔

وہ بہت ہینڈسم اور بہت چپ تھا اور بالکل خاموشی سے ایک فرض کی ادائیگی کی طرح ٹیکسی ڈرائیو کر رہا تھا.. میں نے کچھ لمحے تو صبر کیا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

کہا"تم اتنے سوبر کیوں ہو؟ کیا کوئی مر گیا ہے.."

"نہیں سسٹر..." اس نے پیچھے دیکھے بغیر آہستہ سے کہا..

سسٹر... یہ اس نے کیسا لفظ بولا ہے.. "کیا تم نے مجھے یہ کہا ہے... سسٹر؟" میں پھر ہنستے ہنستے دوہری ہو کر نشست پر گر گئی بلکہ لیٹ گئی اور پھر بڑی مشکل سے اٹھ کر پھر اس کے کندھے کو تھپکا"کیا میں ٹھیک سن رہی ہوں؟ تم نے مجھے سسٹر کہا؟"

"ہاں سسٹر...."

میں یکدم طیش میں آ گئی.."ہے سسٹر فکر... وہاٹ دے فلنگ ہیل آر یو ٹاکنگ اباؤٹ.. ہے مین.. میں کسی کی سسٹر نہیں ہوں.. آئی ڈونٹ ہیو اے بردر.. تم سن رہے ہو... تم نے میری بے عزتی کی ہے.. مجھ سے معافی مانگو.."

"آئی ایم سوری سسٹر..."

"میں تمہیں جان سے مار دوں گی اگر تم نے پھر مجھے سسٹر کہا تو.. مجھے کسی بھائی کی ضرورت نہیں... تم ٹیکسی روکو.. میں اترنا چاہتی ہوں.. روکو.. ورنہ میں شور مچا دوں گی..."

"سوری... آپ مجھے معاف کر دیں.. پلیز بیٹھی رہیں.." اس نے پیچھے مڑ کر پھر بھی نہیں دیکھا بس ونڈ شیلڈ پر نظریں جمائے یہ کہتا رہا..

"او کے.." مجھ میں سکت بالکل نہ رہی تھی.. اور میں گھر بھی پہنچنا چاہتی تھی

"ٹھیک ہے.. ڈرائیو آن.."

مجھے نیویارک کے ٹیکسی ڈرائیوروں کا ایک وسیع تجربہ تھا..

اگر وہ تھارو بریڈ امریکی گورا ہے تو وہ آپ سے منزل کا پتہ پوچھنے کے بعد چپکے سے ڈرائیو کرتا چلا جائے گا.. اسے ایک غیر ملکی چہرے کو پچھلی نشست پر دراز ہو کر اس کا عارضی آقا ہو جانا اچھا نہیں لگے گا.. اگر وہ ایک ایفرو ہے یا پورٹو ریکن ہے تو وہ بیک ویو مرر میں تمہیں دیکھتے ہی فلرٹ کرنے لگے گا.. اور اگر وہ پاکستانی ہے تو یقیناً اس کا میٹر تیز ہو گا اور وہ بہت مؤدب ہو گا اور باجی آپ کو یہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے.. گرین کارڈ مل گیا ہے یا نہیں.. میرا ایک دوست اپنے اپارٹمنٹ میں پاکستانی کھانے بناتا ہے.. چکن بریانی اور کوفتے.. ویری چیپ.. میں اس کا کارڈ آپ کو دیتا ہوں.. ہوم ڈلیوری اور حلال میٹ.. ٹرائی کریں باجی..

لیکن یہ ڈرائیور کسی اور ہی قومیت کا تھا جس کے مزاج کو میں نہیں جانتی تھی..

ایک مکمل طور پر نشے میں دُھت شخص کے ساتھ اگر آپ کچھ دیر بات نہ کریں تو وہ روٹھ جاتا ہے۔ خاموشی کو اپنی بے عزتی سمجھتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جو چپ ہے میرے خلاف ہے اور مجھے پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے میں نے اس کی خاموشی کو پسند نہ کیا اور پھر اس کے کندھے کو تھپک کر کہا"مسٹر.. آئی ایم ناٹ سٹوپڈ.. مجھے پتہ ہے کہ تم مجھے بیک ویو مرر میں دیکھ رہے ہو.. ڈونٹ یو تھنک آئی ایم پریٹی.."

"یو آر سسٹر.."

میں اس کا سر توڑ دینا چاہتی ہوں.. پھر وہی سسٹر.. لیکن ٹیکسی رک رہی تھی۔

ٹیکسی رکی اور میں نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ مارا.. اور وہ نہیں کھل رہا تھا۔

شائد اس ٹیکسی میں فیکٹری والے وہ لیور لگانا بھول گئے تھے جسے دبانے سے دروازہ کھلتا تھا۔ اس نے' سیاہ بالوں والے ڈرائیور نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر اپنی نشست سے باہر آ کر دروازہ کھول دیا..

"تھینک یو.." میں باہر نکلی اور گرتی گرتی بچی.. "ہاؤ مچ؟"

اس نے کرائے کی کوئی رقم بتائی.. اور میں نے اپنا پرس کھول کر جسے حیرت انگیز طور پر میں ابھی تک تھامے ہوئے تھی وہ رقم یا اس کے لگ بھگ کچھ ادائیگی کر دی اور پھر ایک دس ڈالر کا بل اس کی جانب اچھال دیا.. اس سیاہ بالوں والے احمق نے اسے ہوا میں گرتے ہوئے فوراً اسے اپنی ہتھیلی کا سہارا دے کر دبوچا نہیں.. اسے فٹ پاتھ پر گرنے دیا..

"اس اٹھا لو مسٹر.. یہ تمہارا ٹپ ہے"

وہ نہایت تحمل سے جھکا اور نوٹ اٹھا لیا..

"تمہیں پتہ ہے کہ میں یہ ہیوی ٹپ تمہیں کیوں دے رہی ہوں..؟"

"کیوں؟" اس نے نظریں جھکائے اسی تحمل سے پوچھا..

"صرف اس لئے کہ آئندہ تم کسی باعزت عورت کو سسٹر نہ کہو.."

میں نے اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی طرف دیکھا تو وہ وہاں موجود نہ تھی.. مجھے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ صرف ایک دھند تھی جس میں اب پیٹ کے اندر ایک متلی کا احساس ابھرتا تھا.. میں اپنے آپ کو سنبھالتی' میرے گھٹنے بھڑتے اور ٹانگوں میں جان نہیں تھی' میں ڈولتی ہوئی اس دھند کی طرف بڑھنے لگی۔

"تم اپنے اپارٹمنٹ تک نہیں پہنچ پاؤ گی سسٹر.." پیچھے سے اس کا ہاتھ میرے کمر کو تھامنے کے لئے آیا "میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں"

میں اب احتجاج کرنے کے قابل نہیں تھی.. لیکن اس نے مجھے سہارا دیا تو میں نے اپنا سارا بے اختیار بوجھ اس پر ڈال دیا اور پھر مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا "اے مسٹر.. تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو.. میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں"

وہ ایک ذاتی ملازم کی طرح میری دیکھ بھال کرتا.. مجھے سنبھالتا مگر میرے بدن سے بچتا مجھے میرے اپارٹمنٹ تک لے گیا..

اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے اپنے پرس میں سے ایک چابی تلاش کرنے کی کوشش کی اور وہ وہاں نہیں تھی۔

"یہ مجھے دیجئے.." اس نے نہایت احتیاط سے پرس میرے ہاتھوں میں سے لے لیا اور میں بڑبڑاتی رہی "پرس سنیچر.. میں پولیس کو بلالوں گی.. میرا پرس واپس کرو" لیکن اس نے دھیان نہ دیا اور چابی نکال کر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول دیا.. دروازے کے ساتھ ہی میں اندر لڑھک گئی.. وہ باہر کھڑا رہا.. میں نے دروازہ اس کے منہ پر مار کر بند کرنے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ کہیں اور جا لگا اور میں اپنے ہی بے اختیار زور میں فرش پر گر گئی اور پھر لاکھ کوشش کرنے پر بھی اٹھنے سے لاچار ہو گئی.. وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا "وہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو سسٹر فکر.. میری مدد کرو" میں نے بازو اٹھا کر کہا..

وہ اندر آیا.. ایک احتیاط پسند جھجک کے ساتھ میرے بدن کو سمیٹ کر اٹھایا اور مجھے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا.. اور پھر منہ موڑ کر جانے لگا تو میں نے پکار کر کہا اگرچہ میں مکمل خمار سے بھی کہیں آگے کی منزلوں پر تھی مگر مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے.. "ہے مسٹر.. تم مجھ میں.. میری باڈی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے.. آر یو ڈمب؟"

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا.. وہ بلاشبہ ذہنی طور پر ماؤف تھا.. ڈمب تھا.. اور وہ مجھے ٹھیک طرح سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا.. وہ اس لمحے کوئی جانور بھی ہو سکتا تھا.. کوئی بھیڑیا.. کوئی گیدڑ.. یا کوئی انسان بھی.. اگر نظر کچھ نہ آئے تو کوئی شے کچھ بھی ہو سکتی ہے.. انسان اور حیوان میں فرق نہیں رہتا۔ اس کی شکل نشے میں فرق مٹا دیتی ہے.. میں پھر سے ہنسنے لگی۔

"ہے ڈونٹ یو تھنک مائی باڈی از بیوٹی فل.." میں نے جان بوجھ کر اپنے لمبے سکرٹ کو کولہوں تک سمیٹ کر بے خودی کی ترنگ میں کہا..

"یو آر بیوتی فل.. سسٹر.." اس کا لہجہ میں نے پہلی بار محسوس کیا اطالوی قسم کا تھا جو بیوٹی فل کو بیوتی فل کہتا تھا۔

اس کے سسٹر کہنے پر میں پھر بگڑ گئی "ہولی شٹ.." میں نے سر جھٹک کر کہا "تم ہو کون.. پورٹوریکن.. اٹیلین.. وہاٹ شٹ آر یو؟"

"آئی ایم این ایرانین سسٹر.."

"اوہ.." مجھے شدید متلی ہو رہی تھی میرے پیٹ میں جتنا بھی مختلف اقسام کا الکوحل مکس اپ تھا وہ میرے گلے کے راستے باہر آنے کو زور کرتا تھا اور منہ پر ہتھیلی جمائے اسے روکنے کی کوشش کرتی تھی "تم ایرانی ہو؟"

"یس سسٹر.."

"ہے.. ہم تو ہمسائے ہیں.." میں خوش ہو گئی "شیک ہینڈز.. آئی ایم فرام کوئٹہ.. بلوچستان.. پاکستانی بلوچستان.. وی آر نیکسٹ ڈور نیبرز.. شیک ہینڈز" میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا اور وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ شائد میں ہاتھ نیچے کر لوں اور پھر جیسے وہ ایک فرض ادا کر رہا ہو اس نے میرا ہاتھ چھوا اور پیچھے ہو گیا..

اور اس لمحے اس کی ٹیکسی کے ڈیش بورڈ پر چسپاں جو سٹکر تھا جس پر پیچھے سے آنے والی ٹریفک کی لائٹیں پڑتی تھیں تو وہ چمک کر میری آنکھوں کو دکھ دیتا تھا وہ سٹکر میرے خمار آلود دماغ میں تیرنے لگا.. اس پر کیا لکھا تھا جو مجھ سے پڑھا نہیں جا رہا تھا.. "تم مجھ سے ٹھیک طرح سے ہاتھ نہیں ملاتے.. نہ سہی.. لیکن تمہارے اس سٹکر پر کیا لکھا تھا.. آئی لو میڈونا.. آئی لو فری سیکس.. یا آئی وانٹ ٹو میک یو پریگنٹ تو نہیں لکھا تھا کہ کچھ اور لکھا تھا.. کیا لکھا تھا.."

وہ جیسے ایک خاص شرمندگی سے مسکرایا.. اور اپنے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا "وہ.. کلمہ شریف کا سٹکر ہے.. سسٹر.."

"وہاٹ؟" میں نے بستر پر سے اپنے اوندھے پن سے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر سے ڈھیر ہو گئی.. اور پھر ڈولتی ہوئی اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی "تم ان چیزوں پر یقین رکھتے ہو؟" اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا.. نظریں نیچی کئے کھڑا رہا..

"آئی ایم آلسو اے موزلم.." میں نے اپنے لمبے سکرٹ کو جو کولہوں کے اوپر تک سمٹ چکا تھا عقیدت کے اظہار کے طور پر کھینچ کر نیچے کیا اور برہنہ ٹانگوں کو ڈھانپ لیا "بٹ آئی ڈونٹ بیلیو ان دس راٹ.."

"مجھے پتہ ہے کہ آپ ایک مسلمان خاتون ہیں سسٹر.."

"ہاؤ دے فک ڈو یو نو دیٹ؟" مجھ میں بولنے کی قوت گھٹتی جاتی تھی اور میری پھولی ہوئی زبان ایک مرتے ہوئے سانپ کی دُم کی طرح ہولے ہولے حرکت کرتی تھی اور لڑکھڑاتی تھی "تمہیں.. تمہیں کیسے پتہ ہے کہ میں کوئٹہ کے ایک سکول ماسٹر کی بیٹی ہوں جس نے ایم اے کرنے کے بعد امریکہ.. لیکن تمہیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ کوئٹہ کہاں ہے.. نہیں.. نہیں نہیں تم جانتے ہو کہ جانتے ہو کہ کوئٹہ کہاں ہے.. ہم تم پڑوسی ہیں ایرانی برادر.."

اس لمحے اگر وہ چلا بھی جاتا تو میں اس مقام کو گھورتے ہوئے جہاں وہ کھڑا تھا باتیں کرتی چلی جاتی.. یہ میں نہیں میرا خمار بولتا تھا جسے کسی مقابل کی ضرورت نہیں تھی "تمہیں پتہ ہے.. ڈو یو نو دیٹ.. میں پردے میں گھر سے نکلتی تھی' ایک حنوط شدہ ممی کی طرح لپٹی ہوئی۔ ایک پارسل کی طرح پیک شدہ.. بلکہ پارسل کے تو کہیں کہیں سے تناسب ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن میرے.. نہیں نہیں.. اور پھر سکالر شپ آ گیا.. میرا باپ بہت فکر مند تھا.. بہت.." میں نے سر جھٹکا.. کیونکہ مجھے سائیکل کی گھنٹی سنائی دینے لگی.. یا شائد یہ میرے اپارٹمنٹ کی بیل تھی.. ہو از رنگنگ.. یہ کون ہے.. کون ہے جو گھنٹی بجاتا ہے.. میں نے کان لگا کر سنا.. اور پھر اس کی جانب دیکھا جو بُت بنا کھڑا مجھے سن رہا تھا.. اگر یہ آواز مجھے سنائی دے رہی تھی تو یقیناً اس کے کانوں میں بھی آ رہی ہو گی ہے.. کیا تم بھی سن رہے ہو؟.. غور سے سنو.. کین یو ہیئر اٹ؟.. میرا باپ ہمارے کچے گھر کے صحن میں داخل ہو رہا ہے اور مجھے متوجہ کرنے کے لئے سائیکل کی گھنٹی بجا رہا ہے.. ٹن ٹنا ٹن.. تم سن رہے ہو.. نہیں.. تم بہرے ہو.. یو آر ڈیف ڈیف.. انی وے میرا باپ بہت فکر مند تھا.. امریکہ.. اکیلی لڑکی.. اور مجھ میں ڈر تھا لیکن میں یہاں آئی تب مجھ پر کھلا کہ زندگی کیا ہے.. وہاٹ از لائف.. دس از.. دس از لائف ڈیم اٹ.. باقی سب بُل شٹ ہے.. زندگی رواجوں اور مذہبی ممبو جمبو بڑبڑانے کا نام نہیں ہے لیکن.. ہاؤ ڈو یو نو.. دیٹ آئی ایم اے موزلم.. لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں کہ مجھے مسلم ہونے پر فخر ہے.. ہاں.. آئی ایم ویری پراؤڈ ٹو بی اے موزلم.." میں

ابھی تک بستر پر بکھری پڑی تھی.. اب میں نے کہنیوں کے سہارے اپنے آپ کو اٹھایا اور ٹانگیں سمیٹ کر آلتی پالتی مار کر مہاتما بدھ کی طرح بیٹھ گئی.. ہر خواہش کو پورا کرنے والے بدھ کی طرح اور بولتی گئی.. "ہاں تو واز گائے.. تم کیسے جانتے ہو کہ میں.. اوہ ہاں.. یہ تو بہت ہی آسان ہے" میں نے اپنے گلے کے گرد انگلیاں پھیریں تو لاکٹ ابھی موجود تھا.. تم نے اس لاکٹ پر جو "اللہ" لکھا ہوا ہے.. تم نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا ہے.."

"نہیں؟"

"تو پھر تم کوئی گورو ہو.. غیب کا علم جانتے ہو ایرانی برادر.."

میں اگرچہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی لیکن مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا.. غنودگی اور ٹوٹتے خمار کی بے بسی میرے اندر لہریں لیتی مجھے ڈھا رہی تھی۔

وہ بدستور اپارٹمنٹ کے کھلے دروازے میں کھڑا تھا.. سر جھکائے.. میری طرف دیکھتا نہیں تھا صرف سن رہا تھا.. اور یہی تو رنج تھا مجھے.. اپنے آپ کو بے عزت محسوس کر رہی تھی کہ وہ میری جانب اس نظر سے نہیں دیکھتا تھا جو ہر اس امریکی کی نظر ہوتی ہے جب اس کے سامنے خمار میں گم اپنے بدن سے بے خبر ایک نوجوان لڑکی ایک اپارٹمنٹ میں تنہا ایک بستر پر بیٹھی ہوتی ہے.. بیٹھی تو ہوتی ہے لیکن اسے اگر ایک تنکے سے بھی چھو دیا جائے تو وہ لیٹ جاتی ہے.. اس نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں ایسے جانتا ہوں کہ تم.. اگرچہ ڈرنک ہو سسٹر.. لیکن تم میں اب بھی ایک حجاب ہے.. تم وہ بدمستی نہیں ہے جو ایک عام امریکی لڑکی میں ہوتی ہے.. تمہارا چہرہ بے حیا نہیں ہو سکتا مکمل طور پر.. تم جو کر لو.. تم ان کی طرح نہیں ہو سکتیں اور بے شک تمہارا سارا وجود بے حجاب ہو جائے تب بھی تمہاری آنکھوں میں ایک جھجک ہے.. اس جھجک نے مجھے بتایا ہے کہ تم مسلم ہو.. تم اب آرام کرو.. میں چلتا ہوں"

"وہاٹ بُل شیٹ.. دفع ہو جاؤ.. د.. د.. دفع.. ہو ہو جاؤ.." میں نے چیخ کر کہا اور اتنے زور سے کہا کہ میرے بیٹھنے کا بیلنس ڈولنے لگا اور میں اوندھے منہ گرنے لگی.. گرتے ہوئے.. جب تک میری ناک بستر کی چادر پر کریش ہو جاتی اس درمیانی مدت میں.. ان لمحوں میں جو بہت آہستہ سلو موشن میں تھے۔ نشے میں تیرتی' ہلکی ہوتی.. اپارٹمنٹ کی ہر شے کے ساتھ میں بھی اڑتی پرواز کرتی تھی۔ میری سٹڈی ٹیبل پر آراستہ کتابیں ورق الٹتی تھیں

جیسے جیسے میری طبیعت اُلٹتی تھی.. کھڑکی کے پردے ہلتے تھے۔ میرے پلنگ کے پائے ہوا کے دوش پر تیرتے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ایک گلاس.. دو گلاسوں میں بدلتا تھا.. پھر تین اور پھر درجنوں گلاسوں میں بدلتا تھا۔ میں اگر ہاتھ بڑھا سکتی تو ان میں جو حقیقی گلاس تھا اسے نہیں تھام سکتی تھی.. ٹیبل لیمپ دھندلاتا تھا.. سامنے تپائی پر بجی ظفر کی تصویر آؤٹ آف فوکس ہو کر کئی چہرے دکھاتی تھی' اس کی کئی ناکیں تھیں' درجنوں آنکھیں تھیں اور تہہ در تہہ بے شمار مسکراہٹیں تھیں.. وارڈ روب کے کھلے دروازے میں سے میرا بلوچی ڈریس ہینگر سے جھولتا تھا اور اس پر گول شیشوں اور رنگین دھاگوں کے پیٹرن جگمگاتے اور دھندلاتے تھے اور ہر چھوٹے سے شیشے میں ماضی کی شبیہیں ابھرتی تھیں' گھنٹیاں بجتی تھیں اور اپارٹمنٹ میں سیبوں کی مہک تیرتی تھی۔

اور اُس مغربی پہناوے میں میرا بدن آزاد اور بے پرواہ.. جو کبھی ایک چادر میں دفن ایک مردے کی طرح بے جان اور بے نام تھا.. تب سیبوں کی گھنی مہک پر ایک اور مہک حاوی ہونے لگی.. الکوحل کی بوسیدہ اور بساند چھوڑتی مہک جو مجھ میں رچی ہوئی تھی.. کیلیفورنیا کے انگوروں کا خمیر.. کسی پورٹ کسی مارٹینی یا رم.. یا سکاچ کی دھاریں تھیں جو سیبوں کی مہک پر حاوی ہوتی تھیں.. اور بستر پر اوندھے منہ گرتے ہوئے اس بے خودی کے خلا میں تیرتے اور گرتے ہوئے میں نے ایک شیلف میں.. انتھروپولوجی کی ڈھیر کتابوں' ریسرچ پیپرز اور سڈنی شیلڈن کے ناولوں کے درمیان ایک شہاب ثاقب کو چھوتے.. فضا میں تیرتے.. روشنی کا جھماکا تخلیق کر کے فوراً ہی گم ہوتے دیکھا.. جسے میری سخت گیر ماں نے ایئرپورٹ روانہ ہونے سے پیشتر ایک سبز رنگ کے تھیلے میں لپیٹ کر میرے کپڑوں کے درمیان رکھا تھا.. "بیٹی اسے پڑھا کرنا.. غافل نہ ہونا.."

بیٹی نے امریکہ میں آ کر بہت دنوں تک سر پر دوپٹہ اوڑھ کر اسے باقاعدگی سے پڑھا.. غفلت نہ برتی.. نہ سمجھتے ہوئے بھی.. عقیدت کی جہالت میں.. سر ہلاتے ہوئے پڑھا..

اور پھر کچھ بے قاعدگی آنے لگی.. غفلت کا احساس تو تھا لیکن ایک بے نام آہستگی اور دھیرج سے.. بیٹی کی روح میں آزادی داخل ہونے لگی.. وہ ایک نئے قبیلے کے رسم و رواج قبول کرنے لگی اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ پرانے قبیلے کی رسمیں اور عقیدے مضحکہ خیز لگنے لگے..

اسے اب کتنے زمانے' کتنے یُگ بیت چکے تھے' انتھروپولوجی کی کتابوں.. ریسرچ پیپرز اور بیسٹ سیلرز ناولوں کے درمیان کوئی ایک اور کتاب ہوئے.. ان میں بے نام ہوئے کتنے یُگ بیت چکے تھے.. وہ کسی اور قبیلے کی تحریر تھی جواب میرا نہ تھا..

ہر شے پرواز کرتی تھی.. متحرک اور بس سے باہر ہوتی تھی..

اور اوندھے منہ گرنے کا عمل مکمل ہوا اور میری ناک بستر کی چادر پر کریش کر گئی.. میں اسی حالت میں پڑی رہی اور شاؤٹ کرنے لگی "دفع ہو جاؤ.. گیٹ دے ہیل آؤٹ آف ہیئر.. نہیں تو میں پولیس کو اطلاع کر دوں گی کہ.. کہ.. ایک ایرانین ٹیرورسٹ میرے اپارٹمنٹ میں گھس آیا ہے اور.. اور.. مجھے سسٹر کہتا ہے.." اور مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا میرا منہ بستر کی چادر میں دھنسا ہوا تھا اور میری پشت بلند تھی جیسے سجدے میں جانے سے ہوتی ہے اور میں بے اختیار ہنستی گئی.. میری آنکھوں اور کھلے منہ سے رالیں بہتی تھیں..

وہ ابھی تک وہاں تھا.. میری دھمکی کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا.. وہ ذرا آگے آیا.. اس کے ہاتھ میری جانب بڑھے اور وہ مجھے درجنوں ہاتھ دکھائی دیے.. شائد اب وہ میرے بدن کی کشش محسوس کرتا تھا آخر وہ مرد تھا کتنی دیر اپنے آپ کو روک سکتا تھا.. اس کے ہاتھ آگے آئے.. میں اوندھے منہ گری کن اکھیوں سے ان کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ مشرقی مرد کی یہ سسٹر منافقت ابھی انجام کو پہنچ جائے گی.. اس کے ہاتھ آگے ہوئے اور میرے کندھوں کو تھپک کر پھر پیچھے چلے گئے.. "سسٹر.. تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے.. سونے کی کوشش کرو.. لیکن یہ زندگی نہیں ہے" اور پھر وہ پلٹ کر واقعی جانے لگا..

میں نے بمشکل اپنے آپ کو اٹھایا.. اپنے آپ کو پھر سے اوندھے منہ گرنے سے بچایا" ہے وائز گائے.. جانے سے پہلے مجھے زندگی کے بارے میں تو بتاتے جاؤ کہ یہ نہیں تو پھر کیا ہے.." اور میں پھر قہقہے لگانے لگی.. میرا لباس میری طرح بے ترتیب اور خمار میں تھا اور لاپرواہ تھا کہ وہ میرے بدن کے کس حصے کو ڈھکتا ہے اور کس کو برہنہ کرتا ہے..

وہ آہستگی سے پلٹا.. "سسٹر.. یوں ڈرنک ہو کر تو ہر کوئی ہنس سکتا ہے.. قہقہے لگا سکتا ہے.. مزا تو تب ہے کہ اگر تم نے شراب نہ پی ہو.. اور پھر تم ہنسو.. قہقہے لگاؤ.. یہ زندگی ہے" اور یہ کہہ کر وہ دروازے میں سے نکل گیا..

اُس دن کے بعد.. آج تک میں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔

جولیاں کی پہاڑی پر بکھرے معبد اور درس گاہ کے کھنڈر تاریکی کی گہری گپھا میں گم سکوت میں تھے.. ہوا میں جو سرد نمی تھی وہ اس اوس کی تھی جو ان کے بدنوں کو شہباز کی چارپائی کی ادوائن کو ٹھنڈ سے دوچار کراتی تھی......

بڑے تالاب کے گرد وہ طاقچے تھے جن میں نصب ساکیا منی کے بُت اب بے گھر ہو کر ٹیکسلا میوزیم کے شوکیسوں میں قید تھے اور ان کے پتھروں پر دھوپ کے نشان تھے.. اور جو طالب علم اور بھکشو تبت اور چین سے آگہی حاصل کرنے کے لیے جولیاں آتے تھے ان کی رہائش کوٹھڑیوں پر اب چھتیں نہیں تھیں..

گھپ اندھیرا تھا اس لیے وہ ہاتھ تھامے ہوئے چلتے تھے..

سلطانہ الگ ہوئی اور ایک کوٹھڑی کے اندر چلی گئی..

"اس کوٹھڑی میں کچھ دیر رہنا چاہیے.. اس میں پتہ نہیں کتنی متلاشی روحوں کے سانس ہیں.. ان سانسوں میں شاید وہ جواب ہوں جن کی میں متلاشی ہوں.. میں موت کی ماہیت کو سمجھ نہیں سکی.. ایرانین برادر نے زندگی کی جو توجیہہ کی تھی اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا تھا.. لیکن کیا بس یہی توجیہہ ہے.. میں ابھی تک اندھیرے میں ہوں۔"

خاور نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو وہاں ایک تاریک آسمان تھا لیکن اس تاریکی میں بجھتے ہوئے نیم روشن ستارے نمایاں ہوتے تھے۔

سلطانہ کی ان نیلگوں آنکھوں میں جن میں ایرانی برادر کو ایک جھجک نظر آئی تھی ان میں کوئی ایک ستارا اترا اور بے چھت کوٹھڑی کے در و دیوار نیلاہٹ میں رنگے گئے..

"میں اندھیرے میں ہوں اور اس کے باوجود تمہاری جانب کھنچی چلی جاتی ہوں.. اب اس کی توجیہہ کیا ہے؟"

اجرک کے کھلے کرتے اور شلوار میں اس کا بدن بے حد مختصر تھا.. ایک مٹھی میں آ جانے والا بدن.. اس کی آنکھوں کے تلے اس کے ہونٹ تھے جو دکھائی نہیں دیتے تھے..

متلاشی روحوں کے سانسوں میں کچھ اور سانس شامل ہوئے.. کیونکہ ہونٹوں کی نمی دیکھنے سے نہیں محسوس کرنے سے ہوتی ہے..

ریلنگ پر رکھے ہاتھ کا لمس جب سفر کرتے ہونٹوں تک پہنچتا ہے تو اس کی گرم نمی سے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور ایک مٹھی میں آ جانے والا بدن بھی اپنے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔

سرکپ کے شہر قدیم اور خاموش.. ٹیکسلا میوزیم کی آئیوی میں ڈھکی تاریکی میں روپوش... دھرماراجیکا سٹوپا کی قربت میں سے گزرتے.. اور پھر یکدم جی ٹی روڈ کے غل اور تیز فل لائٹس میں شامل ہونے تک ایک ٹھہری ہوئی خاموشی نے ان کی میزبانی کی..

اس کی مٹھی ابھی تک اس حدت میں تھی جو اس میں آ جانے والے بدن نے عنائت کی تھی..

"کل رات پیر سہاوا سے واپسی پر... اگر میں دائیں ہاتھ مڑنے کا انڈی کیٹر نہ دیتا اور سیدھا چلا جاتا تو کیا واقعی تم میرے ساتھ چلی جاتیں؟"

"پل بھر کے لیے شعور کھو دینے کا کوئی لمحہ تھا.. مجھے یاد نہیں۔"

"کیا تم سیریس تھیں؟"

"میں وہاں تھی ہی نہیں.. بار بار اس کا تذکرہ مت کرو" وہ ویسے ہی ٹھنڈی اور لاتعلق ہو گئی جیسے اپنے ہوسٹل کے لونگ روم میں تھی.. ایک اجنبی وجود "احتیاط سے ڈرائیو کرو.. سامنے سے آنے والی ہیوی ٹریفک کی فل لائٹس آنکھوں کو اندھا کر رہی ہیں۔"

سپر مارکیٹ کے ویران چوک میں آج بھی "مسٹر بکس" کے نیون سائن کی روشنیاں تارکول پر جلتی بجھتی اسے رنگین کرتی تھیں.. چوک سے بلیو ایریا کی جانب سٹیئرنگ گھماتے ہوئے خاور نے پھر اس کی طرف دیکھا کہ شاید اس کے چہرے پر کوئی رنگ آئے لیکن وہ ایک ایسے اجنبی کی مانند لاتعلق بیٹھی تھی جس نے اس کی کار میں لفٹ لی تھی..

"دائیں ہاتھ پر ناظم الدین روڈ کا موڑ ہے.."

"ہاں ہاں میں اندھی نہیں ہوں.. ادھر ہی مڑنا ہے.." اس نے ایک بیزار ناپسندیدگی سے کہا۔

وہ یکدم طیش میں آ گیا.. "میں تمہیں سمجھ نہیں سکا.."

"میں بھی موت کو اور زندگی کو سمجھ نہیں سکی.. اگلے ماہ میں ڈاکٹر ہاشم سے شادی کر رہی ہوں.. وہ میرا کولیگ ہے.. اور ہم دونوں اکثر دور افتادہ دیہات میں ٹور کے لیے جاتے

رہتے ہیں.. پولیو کی ویکسین کے فوائد بتانے.."

وہ مکمل بے اعتنائی اور اجنبیت سے دروازہ کھول کر اتر گئی..

پانیوں کے سفر نے سب کو تھکا دیا تھا..

سب سو چکے تھے..

البتہ ایک مسافر ابھی تک بیدار تھا.. اور آنکھیں نہ جھپکتا تھا۔ خاور کی کمر پر اس کی گرم ہواڑ کی پھونک وقفوں وقفوں سے آ رہی تھی اور وہ اس کی موجودگی سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔

پکھی نہیں سوئی تھی۔

وہ کسی ٹیلے پر بیٹھی اپنی سیاہ دراوڑی آنکھیں کھولے کوئی سیاہ سحر پھونکے چلی جا رہی تھی۔

طبع حرص سے کبھی آزاد نہیں ہوتی اگرچہ بدن حرص کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

خاور نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے پاس آنے کو کہا..

وہ اپنے بھاری کولہوں سے ریت جھاڑتی ہوئی اٹھی اور پاؤں تلے کی ریت میں سے قدم نکالتی آہستہ آہستہ نکالتی اس کے قریب آ بیٹھی..

"جی سائیں.."

"تمہارا بچہ کہاں ہے؟"

"کشتی میں پڑا سوتا ہے سائیں.."

"سرور اعتراض نہیں کرتا؟"

"نہ سائیں.. روزی روزگار کا معاملہ ہے.. آپ لوگ ہمارا کچھ لے کر تو نہیں جاتے، کچھ دے کر جاتے ہو.. پر سائیں ایک عرض گزاروں؟"

"بولو..."

"بہت بے پرواہ ہو سائیں.. ہمارے تو جو ادھر کشتی میں آتا ہے تو پہلی رات ہی حکم لگا دیتا ہے.. ہم حکم کے بندے ہیں.. پر سائیں آپ بے پرواہ ہو بہت راتوں کے بعد خیال کیا ..اب حکم لگاؤ۔"

اس کی کاٹھی بہت مضبوط تھی.. ایک دراوڑ پیٹھ ریت میں دھنستی اپنے کولہوں کی چوڑائی پر ٹھہرتی تھی.. اس کے میلے کچیلے جھگے میں سے اس کی چھاتیاں زور کرتی تھیں..

وہ سلطانہ کے مجسّے سے بالکل مخالف سمت میں تھی..

وہ ایک غیر جانبدار مبصر کی مانند بہت دیر تک اسے جانچتا رہا۔

"حکم کریں سائیں.. ادھر ریت پر یا کشتی میں.."

"تم کشتی میں جا کر اپنے بچے کا خیال کرو پکھی.. اس کے بغیر بھی تمہارے روزی روزگار کا بند وبست ہو جائے گا.."

خاور کو محسوس ہوا کہ جب پکھی اٹھی ہے تو اس میں روزی روزگار سے اجتناب کی مایوسی نہ تھی بلکہ حیاتی کے کل تجربے کے برعکس جو ردعمل خاور کا تھا اس کی حیرانی تھی..

بارہ کھو کے گھر میں عابدہ سومرو کا جو فون اس رات آیا وہ آخری لگتا تھا..

اس کی آواز پہچانی نہیں جاتی تھی، نزخرے کی خرخراہٹ اور ڈوبتی ہوئی نبضوں جیسی ایک مرتی ہوئی کسی اور عورت کی آواز.. جس کے لفظ اٹکتے اور ڈوبتے تھے اور سمجھ میں نہیں آتے تھے..

"مجھے دکھائی نہیں دے رہا... میری آنکھیں... میں نے ٹٹول ٹٹول کر تمہارا نمبر ڈائل کیا ہے... بہت... بہت اندھیرا ہے.. جھوٹ بولا تھا ڈاکٹروں نے... کہ میں... میں نیند میں... مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا.. میری رگیں کٹ رہی ہیں.. میں... میں... کچھ نظر نہیں آ رہا.. صرف سورج کا ایک سرخ گولا ہے.. تمہارے.. تمہارے چہرے سے پرے.. کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکا ہے.. میری زبان بھی بند.. بند ہونے کو ہے.. خاور.. سائیں.. کرم کرو.. تم آ نہیں سکتے... کیا تم..."

فون بند ہوتے ہی اس نے اپنے ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا.. کل کسی بھی فلائٹ کے لئے.. کراچی کے لئے.. میری بکنگ کر دو..

کل تو نہیں.. کسی بھی فلائٹ پر کوئی نشست نہیں.. البتہ پرسوں...

لیکن کل...

چانس پر بھی نہیں ہے..

ٹھیک ہے.. پرسوں..

"شی از پلیئنگ ود یو..." اس کی غلافی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ "وہ تم سے کھیل رہی ہے.."

"عابدہ؟"

"نہیں نہیں.. یہ سلطانہ.. وہ اپنے بدن کے زور سے تم سے کھیل رہی ہے.."

"اس کا بدن تو ایک مٹھی میں آسکتا ہے.. جب کہ تم.."

"ڈونٹ بی سلی.. میں نے تو تین بچوں کو جنا ہے اور..."

"اس کے باوجود تمہارے بدن میں وہ زور ہے جس سے تم کھیل سکتی ہو.. تم اُس کی نسبت کہیں زیادہ کشش کی حامل ہو..."

وہ ذرا شرما گئی.. "لیکن یہ جو کہانیاں وہ تمہیں سناتی ہے.. اپنے بارے میں یہ سب وہ گھڑتی ہے تمہیں چرنے کے لئے.. کسی کو بھی یہ کہانیاں سناؤ وہ تمہیں یہی کہے گا.."

"اگر میں تمہاری کہانی کسی کو بھی سناؤں تو بھی وہ یہی کہے گا کہ یہ من گھڑت ہے.."

"بہر حال تمہیں عابدہ کو دیکھنے جانا چاہئے.. ہر صورت میں.. کسی مرتے ہوئے شخص کو انکار نہیں کرنا چاہئے.. جو شخص یہ جانتا ہو کہ وہ مرنے والا ہے اس کی ناامیدی اور بے بسی سے تم کیسے واقف ہو سکتے ہو.. تمہیں جلد از جلد جانا چاہئے' کہیں دیر نہ ہو جائے.. لیکن اس سے بچو اس نیلی آنکھوں والی نوجوان چڑیل سے جس کے امریکی لہجے سے تم متاثر ہو گئے ہو.."

نیلی آنکھوں والی چڑیل اس شب کی مغائرت اور اجنبیت بھلا چکی تھی جب اس کا فون آیا.. اسے امید بھی تھی اور وسوسے بھی تھے.. عابدہ کی مرگ بے بسی میں ڈوبی ہوئی آواز نے سلطانہ کو ذرا پیچھے دھکیل دیا تھا.. اگر وہ اس کی تشویش اور کراچی جانے میں نہ الجھا ہوتا تو وہ اب تک ایک مرتبہ پھر اس سخت گیر وارڈن کے سامنے کھڑا ہوتا.. بے شک پھر بے عزت اور بے توقیر ہوتا لیکن اس کی بے رخی کے باوجود وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا..

اور پھر فون آگیا.. جس میں اپنائیت کا رچاؤ تھا..

"کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہے؟"

"آل دے ٹائم ان دے ورلڈ..."

اس کی آواز سنتے ہوئے ایک بچگانہ مسرت سے دوچار ہوتا تھا.. اسے بہت وسوسے تھے کہ وہ دوبارہ فون نہیں کرے گی..

"کیا ہم مل سکتے ہیں؟"

"ہاں.. لیکن.."

"میرا رویہ ایسا تھا کہ تم شکایت کر سکتے ہو.. لیکن میں بس ایسی ہی ہوں.. اور تم سے ملنا چاہتی ہوں.."

"مجھے آج سہ پہر کراچی جانا ہے..."

اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ نہیں.. عابدہ سومرو کے لئے وہ اب کچھ نہیں کر سکتا.. سلطانہ کو دیکھنے کی ہوس اتنی شدید تھی کہ وہ ہر اخلاقی قدر کو پامال کر سکتا تھا..

"بہت ضروری ہے؟"

"ہاں.. زندگی اور موت کا مسئلہ ہے.. لیکن.."

"آج سہ پہر؟.. کیا یہ ممکن ہے کہ تم.. آپ.. ابھی کچھ دیر کے لئے اسلام آباد آجائیں.."

وہ "تم" اور "آپ" کے درمیان بھٹکتی رہتی تھی۔

اس کی کیا توجیہہ ہے کہ ایک عورت گفتگو کے دوران "آپ" سے مخاطب ہوتی ہے پھر یکدم "تم" کہتی ہے اور پھر سے "آپ" کی جانب لوٹ آتی ہے.. یہ کچھ لہریں تھیں اس کے اندر جو کنارے کی آخری حدوں تک پہنچ کر اس کی قربت سے چھوتی تھیں تو وہ "تم" ہو جاتا تھا اور جب وہی لہریں سمٹ کر دور ہونے لگتی تھیں تو پھر "آپ" آجاتا تھا..

"ہاں.. ڈاکٹر ہاشم اگر معترض نہ ہوں تو..."

وہ اس شب کے بعد جب اسے یکدم ڈاکٹر ہاشم کے ہونے کی اطلاع دی گئی تھی' وہ اس انجانے ڈاکٹر کے لئے بغض اور کینہ پال رہا تھا.. وہ جو بھی تھا.. اس کی نسبت کہیں زیادہ کم

عمر.. ہینڈسم اور مردانگی کی قوت سے بھرا ہوا تھا.. اور سلطانہ کا حقدار تھا.. لیکن خاور کے اندر بھی جو دوسرا وجود تھا وہ اس ڈاکٹر ہاشم کے ہم پلّہ.. اتنا ہی کم عمر' ہینڈسم اور مردانگی کی قوت سے بھرپور تھا.. بے شک حقائق اس کے برعکس تھے.. لیکن ان دنوں.. ایک نسوانی تثلیث کی زد میں.. قربت مرگ میں.. تمام حقائق جھٹلائے جا رہے تھے..

فون پر اس کی آنکھوں کی مدھم ہنسی اس کے کانوں تک آئی جو کہتی تھی.. "یو سلی اولڈ مین"

غار کی اتھاہ تاریکی اور گہرائی میں سے... اس میں مقیم چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ اور ان کی چیں چیں کرتی آوازیں ایک ہلکی گونج کے ساتھ باہر آتی تھیں اور ان کے ہمراہ ایک سرد ہوا سفر کرتی آتی تھی جو ان دونوں کی پشتوں سے ٹکراتی ریڑھ کی ہڈیوں کو ٹھنڈا کرتی اس بلندی سے نیچے اتر جاتی تھی۔

پیلی دھوپ کے سنہرے پن میں آئی ہوئی لمبی جنگلی گھاس بھی سنہری ہوتی تھی اور پہاڑیوں پر جہاں جہاں چھاؤں تھی وہاں ڈھلوانوں پر وہی گھاس گہرے سبز رنگ میں ڈھلتی سرسراتی تھی.. نامعلوم سی ہوا کی موج کی زد میں آ کر وہ دوہری ہوتی تھی.. چھاؤں بے آواز رینگتی ہوئی دھوپ کی روشن اور زرد ملکیت میں داخل ہوتی تو سنہری گھاس سائے میں آ کر سیاہی مائل ہو جاتی.. اور بہت نیچے.. بھوری' سنہری اور سیاہی مائل گھاس کی ڈھلوانوں سے کہیں نیچے مُہرا مرادو کی خانقاہ کے کھنڈر روپوش تھے.. اور ان کی روپوشی سے پرے.. خان پور جانے والی سڑک درختوں کی ایک سبز غار کے اندر تھی اور اس کے آگے مالٹوں کے باغ تھے۔ ہریاول کا ایک طویل میدان تھا جس میں کہیں کہیں گھر اور گاؤں تھے اور ان کے آخر میں سردیوں کی ہلکی دھند میں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا.. تاحد نظر وہی منظر تھا جو جولیاں کے کھنڈروں سے نظر کے سامنے آتا تھا اس لئے کہ یہ دونوں بدھ خانقاہیں متوازی پہاڑیوں میں واقع تھیں.. جولیاں پہاڑی کی چوٹی پر تھی اور مُہرا مرادو پہاڑیوں کے دامن میں چھپی ہوئی تھی۔

صرف چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ کانوں میں آتی تھی یا ہوا تھی.. جو گھاس پر سرسراتی چلتی تھی تو وہ دوہری ہوتی تھی... یا پھر اس بلند مقام پر... غار کے دہانے پر ایک

سناٹے اور تنہائی کی موجودگی تھی جو سنائی دیتی تھی..

اور کبھی ایک طویل وقفے کے بعد کسی ڈھلوان کی گھاس میں نظر نہ آتے کسی ڈھور ڈنگر کے گلے میں بندھی گھنٹی کا ارتعاش.. ٹن ٹن.. سندھ کے کناروں پر اترنے والے مویشیوں کے ترنم آویز گھنٹیوں کے بلاوے کی طرح.. ڈھلوانوں پر سفر کرتے ان کے کانوں میں آتا اور پھر ان کی گونج مٹتے ہی پھر سے سناٹے کی حکمرانی ہو جاتی..

وہ ایسی بلندی پر تھے کہ ٹیکسلا سے خان پور جاتی ہوئی سڑک پر... درختوں کی سبز غار میں چھپی ہوئی سڑک پر ٹریفک کا جو شور تھا وہ ان تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ جاتا تھا۔

اور وہ اس کی زد سے باہر.. چمگادڑوں کی سیاہ کلبلاہٹ سے بھری اتھاہ تاریکی میں اتری ہوئی غار کے دہانے پر بیٹھے.. کنکروں اور سخت گھاس پر براجمان آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھے تھے اور سامنے پھیلے منظر کو تکتے تھے.. ان بدھ بھکشوؤں کی طرح جنہیں یہی تاکشیلا.. یہی مقامات اور یہی وادی امن آشتی اور نروان عطا کرتی تھی.. اسی لئے انہوں نے اس کی ڈھلوانوں پر اپنی مقدس ترین خانقاہیں' عبادت گاہیں اور درس گاہیں تعمیر کیں.. انہیں بھی یہی وہم تھا کہ اُن کا عقیدہ بھی تا ابد ہے.. یہ خانقاہیں اور سٹوپاز ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گے.. اور اُن کی جگہ کوئی اور نیا عقیدہ' نیا معبد نہیں آئے گا.. ہر نسل اسی وہم کا شکار ہوتی ہے.. اس کی اسیر ہوتی ہے اور اس زمین کو صرف اپنے مذہب اور روایت کی قیدی سمجھتی ہے.. جب کہ زمین پابند نہیں ہوتی.. وقت اور زمانے کے تغیر اس پر رونما ہونے والے عقیدے اور عبادت گاہیں بدلتے رہتے ہیں.. ان عبادت گزاروں کو یہاں سے رخصت ہوئے ہزاروں برس گزر چکے تھے.. اور جو آج کے عبادت گزار تھے انہیں بھی.. یہاں سے رخصت ہوئے ہزاروں برس گزر جائیں گے.. لیکن لمحۂ موجود میں وہ ابھی ایک وہم میں ہیں۔

ایک پر پھیلاتی چمگادڑ غار کے اندر سے نمودار ہوئی اور ایک بڑی سیاہ پتنگ کی مانند ان کے سروں پر سے ڈولتی ہوئی گزر گئی.. سلطانہ خوفزدہ ہو کر جھکی کہ اس نے چمگادڑ کی پھڑپھڑاہٹ کو اپنے باب کٹ بالوں پر محسوس کیا تھا..

"تم ہمیشہ مجھے عجیب و غریب وہم انگیز جگہوں پر لے آتے ہو"

"یہ ان چمگادڑوں کی طرح میری آماجگاہیں ہیں.. میرے خفیہ ٹھکانے ہیں.."

"اور آپ ایک خاص منصوبے کے تحت اپنی فرینڈز کو ان خفیہ ٹھکانوں پر لاتے

ہیں اور وہ ان کے سیاہ سحر میں مبتلا ہو کر آپ کے قریب ہو جاتی ہیں؟"

"نہیں.. تم پہلی عورت ہو جس کے ساتھ میں یہاں آیا ہوں.."

"آپ مجھے ساتھ لے کر آئے ہیں.. میں آپ کے ساتھ نہیں آئی.."

"درست..."

"اس روز ہم جولیاں کے کھنڈروں میں گئے تھے.. یہیں کہیں.. اور آج.. تمہیں اس علاقے سے کوئی خاص رغبت ہے؟"

"پہلے تو نہیں تھی.. پھر غروب کی کرنوں کی نزدیکی میں اور تنہائی میں چونکہ انسان خود کھنڈر ہو رہا ہوتا ہے... عناصر میں مل جانے کا وقت قریب آنے لگتا ہے تو اسے کھنڈر ہی اچھے لگتے ہیں.."

"اور چمگادڑیں.." وہ ہنسنے لگی..

"ہاں چمگادڑیں اور چڑیلیں بھی..." خاور کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی..

اسے احساس ہوا کہ منظر کا پھیلاؤ' بلندی اور گھاس کی سرسراہٹ اور تنہائی اس پر غالب آگئی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ سلطانہ کے وجود سے غافل ہو گیا تھا۔

سرد دن کی دھوپ میں.. خاور نے اسے دیکھا تو جیسے پہلی بار اسے ننگی آنکھ سے دیکھ رہا تھا.. کلوز اپ میں اس کے چہرے کو ایک بڑی سکرین پر دیکھ رہا تھا... کانوں کو روپوش کرتے کندھوں سے ذرا اوپر جھولتے نیم سنہری بال جن میں کہیں کہیں سفیدی کی لکیریں تھیں اور بھلی لگتی تھیں' ان کے نیچے رخساروں پر روئیں تھے جو دھوپ میں الگ الگ اور سنہری ہوتے تھے.. جیسے سونے کی کومل کونپلیں مساموں میں سے پھوٹ رہی ہوں اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے نہایت خفیف سے حرکت کرتے تھے.. گہرے براؤن رنگ کی لپ سٹک کے نیچے ہونٹوں کے جو مسام تھے وہ بھی زندہ اور بولتے تھے.. جدا جدا دکھائی دیتے تھے اور آنکھوں میں جو کانچ ایسی نیلاہٹ تھی وہ سیال لگتی تھی۔ جیسے ابھی بہنے لگے گی اور اس کے رخساروں پر نیلی دھاریاں بناتی گردن کے راستے اس کے سینے پر پھیل کر اسے بھی نیلا کر دے گی۔ وہ اسے ایسے نظر آ رہی تھی جیسے وہ ایک مائیکروسکوپ پر جھک کر اسے دیکھ رہا ہو.. ہر مسام اور ہر روئیں کی تفصیل واضح اور دلکش تھی..

اس پر سے نظریں ہٹا کر خاور نے نیچے پھیلے ہوئے منظر کو دیکھا تو بھی اس کا چہرہ

ساتھ چلا آیا اور اور منظر کے سامنے حائل ہو گیا.. وہ آنکھیں جھپکے بغیر ایک فاترالعقل شخص کی مانند ہو رہا تھا جو شیشے کے ٹکڑے کی تیز دھار سے اپنی کلائیاں چھیلتا رہتا ہے' گردن پر اس شیشے کو ایک آری کی طرح چلاتا ہے اس میں سے خون نکلتا ہے اور اسے کوئی اذیت نہیں ہوتی' درد نہیں ہوتا صرف خون نکلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے کہ یہ کہاں سے آ گیا.. وہ ایسی ایک بے حس محویت سے اپنی آنکھوں اور منظر کے درمیان حائل چہرے کو تکتا جا رہا تھا.. یہ چہرہ کہاں سے آ گیا.. اس کے روئیں اور مسام چومنے کی چاہت اس میں سرکشی کرتی تھی..

"ہیلو..."

سلطانہ کی انگلیاں اس کی آنکھوں کے سامنے آئیں۔

"کیا تم ابھی تک یہاں ہو؟... کہاں ہو؟"

"تم وہاں بھی ہو" اس نے ہاتھ سے ڈھلوان کے پار کی وسعت کی طرف اشارہ کیا اور پھر منہ موڑ کر اسے دیکھا۔ "اور یہاں بھی... میں کہیں نہیں ہوں۔"

ایک مقامی چرواہا اپنے مویشیوں کو ہانکتا بلند گھاس میں سے نمودار ہوا..

اس نے سر اٹھا کر انہیں غار کے دہانے پر براجمان دیکھا اور شک سے دیکھا کہ یہ شہر کے لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں.. پھر شاید اس نے ان کی عمروں کے تفاوت کو دیکھا اور مطمئن ہو کر سر جھکا لیا اور اپنے مویشی ہانکتا نیچے چلا گیا..

وہ ایک طویل مدت کے بعد یہاں آیا تھا..

مہرہ مرادو کی خانقاہ سے بلند ایک ڈھلوان کی اوٹ میں پوشیدہ یہ غار اور اس کا دہانہ داؤد کی دریافت تھی.. وہ ہمیشہ انجانے' بھید بھرے اور الگ ٹھکانے تلاش کرتا اور اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا لے جاتا کہ وہ بہت چست' ایک بھیڑیئے کی مانند صحت مند اور غراتا ہوا پھرتیلا تھا.. یہ ایسے ٹھکانے ہوتے جن کی خبر بہت کم لوگوں کو ہوتی.. نور پور کے اوپر برازیل کے بارشوں والے جنگلوں ایسی ایک خفیہ آبشار.. پیر سوہاوہ سے کہیں آگے وہ ویران ریسٹ ہاؤس جہاں راتوں کو معدوم ہو جانے والی نسلوں کے آخری پرندے بولتے تھے.. اورنگ زیب کے زمانے کا ایک کنواں اور اسی عہد کی چرخڑی.. سون ندی کے کنارے وہ ذخیرہ جو سانپوں سے اٹا پڑا تھا اور سپیروں کی مرغوب شکار گاہ تھی.. اس کے برابر میں ہائی وے کا وہ حصہ جہاں سردیوں کی یخ راتوں میں ٹھٹھرتے ہوئے سانپ رینگتے ہوئے آتے تھے تاکہ

تارکول میں جذب دن کی دھوپ کی ہلکی حدت جو رات ہونے پر اس میں موجود ہوتی تھی' اس پر لوٹ سکیں اور پھر ٹریفک سے کچلے جاتے تھے.. اور پھر یہ غار.. اس کے الگ ہی ٹھکانے تھے..

پہلی بار وہ اسے زبردستی یہاں لایا تھا..

خانپور جانے والی روڈ سے الگ ہو کر ناہموار اچھلتے کودتے کچے اور سنگدل راستے پر کار ڈال کر.. کسی غیر ملکی کے تعمیر کردہ گنبد نما گھر کے پھاٹک سے گزرتے.. اور اس کے بارے میں مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے اور اس کی تہہ خانے میں مذہبی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جسے وہ پڑھتا رہتا ہے اور شاید ہی اپنے گھر سے باہر آتا ہے یا کسی سے میل ملاپ کرتا ہے.. وہ ایک ندی کی قربت میں پہنچے تھے جہاں داؤد نے کار پارک کر دی تھی... مہرہ مرادو کی عبادت گاہ کے کھنڈروں کا رکھوالا بابا طفیل بخش اس کا پرانا بیلی تھا.. داؤد کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ وہ پہلی ملاقات پر ہی دوسرے شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا' پرانا بیلی بنا لیتا تھا۔ بابا طفیل بخش نے انہیں پہلے تو ان آثار کے بارے میں ایک راہنما لیکچر دیا... کچھ شکستہ مجسمے اور ستون دکھائے.. خانقاہ کی کوٹھڑیاں دکھائیں اور پھر ان کھنڈروں کے اوپر اس کی رہائش میں جو کچی کوٹھڑی تھی اس کی چوکھٹ کے برابر میں اینٹوں پر رکھے گھڑے میں سے پانی پلایا جو خنک اور شیریں تھا اور پھر کہا "صاحب آپ تو غار پر جانے کے لئے آتے ہو.. تم چلو.. میں کھانا بنا کر لے آؤں گا۔"

کھنڈروں سے غار تک کی چڑھائی جان لیوا تھی.. لیکن داؤد ایک بکری کی پھرتی اور ایک بھیڑیے کی صحت مندی کے ساتھ جستیں بھرتا آگے آگے چلا جا رہا تھا اور خاور ہر دوسرے پتھر کو تھام کر.. اگرچہ یہ برسوں پہلے کا قصہ تھا.. تب بھی وہ اپنے سانس کو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانے کے خوف سے اسے بچانے کے لئے ہونکتا ہوا کھڑا ہو جاتا تھا۔

غار تک پہنچ کر وہ اس کے دہانے کے آگے بیٹھ گئے اور سامنے کے منظر کی سرکشی نے ان کی آنکھوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ صرف ان کے لئے ہو گیا۔

داؤد نے بیپر کپس میں اپنے لئے اور اس کے لئے کچھ پینے کے لئے انڈیلا اور وہ باتیں کرنے لگے..

یہ کوئی اور سیارہ کوئی اور کائنات تھی جس میں وہ تنہا سفر کرنے لگے.. آس پاس

سے کہکشائیں اور اجنبی دنیائیں اور بلیک ہول گزرتے جاتے تھے مگر وہ تنہا تھے..

"تم کبھی اس غار کے اندر بھی گئے ہو؟" اس نے پوچھا تھا..

"ہاں یار.." وہ ایک لگڑ بگڑ کی طرح بے پناہ ہنسنے لگا اور اس کی ہنسی سے بہت دور چرتے مویشی بھی تھوتھنیاں اٹھا کر دیکھنے لگے کہ یہ ہولناک آواز کہاں سے آئی ہے اور ہراساں ہو گئے۔ سرسراتی ہوئی گھاس بھی لمحہ بھر کے لئے ساکت اور دم بخود ہو گئی۔ "ہاں یار.. میں نے تحقیق کی ہے.. ادھر کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ غار اندر ہی اندر مرگلہ کی پہاڑیوں تک جاتا ہے اور ہزاروں سال پہلے گوتم کے جو چیلے ہوتے تھے وہ مشعلیں جلا کر اس کی تاریکی کے اندر اترتے تھے اور پھر سفر کرتے ہوئے کسی مقام پر ٹھہر جاتے تھے اور گیان دھیان میں گم ہو جاتے تھے.. میں ایک بار اس غار کے اندر بہت دور تک گیا تھا کہ شاید وہ بھکشو ابھی تک گیان دھیان میں فنا ہوں اور انہیں علم ہی نہ ہو کہ باہر ہزاروں برس بیت چکے ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک بدھ بھکشو سے پوچھوں کے بابا لوگ ہمیں تو سمجھ نہیں آئی.. ہم تو ٹکریں مار مار کر ہلکان ہو گئے ہیں لیکن کچھ پتا نہیں چلا تو.. تم ہی بتادو کہ اس زندگی کا مقصد کیا ہے.. وہ نہ ملیں تو ان کے ڈھانچوں سے ہی پوچھ لوں.. لیکن خاور جونہی میں غار کے اندر داخل ہوا اور باہر سے آنے والی روشنی مدھم ہو کر یکدم گھپ اندھیرے میں بدلی ہے تو میں گھبرا گیا.. چگادڑوں کے بسیرے اور ان کی پھڑپھڑاہٹ سے نہیں.. بلکہ موت ایسے اندھیرے سے... یار موت سے بڑا ڈر لگتا ہے.."

شام ہوئی تو بابا طفیل بخش ہانپتا ہوا ایک کچی ہانڈی اور دستر خوان میں بندھی روٹیاں اٹھائے اوپر آتا دکھائی دیا.. وہ دونوں کھانے کے بعد نیم تاریکی میں بھٹکتے نیچے آئے اور دنیا کے پرشور عذاب میں داخل ہو گئے..

خاور ایک طویل مدت کے بعد یہاں آیا تھا..

یہاں پہنچنے پر اس نے غار کے سامنے جو جھاڑیاں اور پتھر تھے انہیں جھک کر غور سے دیکھا تھا.. داؤد کے آثار تھے.. وہاں ابھی تک اگرچہ چپکے ہوئے اور بارشوں سے بوسیدہ وہ دونوں بیپر کپ موجود تھے.. وہ جو داؤد کا تھا اوندھا ہو کر گھاس میں اٹکا ہوا تھا.. اور اس بیپر کپ کے کناروں سے ابلتے ہوئے وہ اس کی ہنسی اور لاپرواہ پوری زندگی کو سن سکتا تھا..

پچھلے برس اس بھیڑیا بدن اور پھڑکتے ہوئے شخص کا دل بے وجہ بے جواز رک گیا

تھا اور اس پر جھکنے والے دوست نے دیکھا کہ جتنی دیر میں وہ تشویش سے ابھی مسکراتے اور سگریٹ کا آخری کش لگاتے داؤد کے چہرے تک گیا ہے تو اتنی دیر میں اس کی زندہ آنکھیں مردہ ہو گئیں..

اسی لئے وہ اتنی مدت کے بعد یہاں آیا تھا..

"تم کہیں تو ہو.."

سلطانہ کے لہجے میں گھبراہٹ تھی.. اس کی اتنی طویل خاموشی اسے خدشات میں مبتلا کر رہی تھی..

"میں یہیں ہوں.." اس نے سر جھٹک کر جواب دیا۔ "شاید میں عمر رفتہ کی غنودگی میں تھا۔ تم جانتی ہو کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسان میں غنودگی اور مستی در آتی ہے.."

ایک اور سیاہ پتنگ چمگادڑ جھولتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزر کر ایک نیم دائرے میں ڈولتی غار میں واپس چلی گئی..

"تم چمگادڑوں سے ملنا پسند کرو گی؟"

"نہیں.." اس نے سر جھٹکا اور اس کے بال دیر تک اس کی گردن پر ایک ایک کر کے گرتے رہے.. "تم ایک عجیب خصلت کے شخص ہو لیکن.. ہاں.. اگر تم میرا ہاتھ تھام لو تو.."

غار کے اندر پتھروں کے انبار اور سیلاہٹ تھی.. باہر جتنی بھی روشنی باقی تھی وہ بہت دور تک نہیں اترتی تھی مدھم ہو کر یکدم بجھ جاتی تھی اور آگے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا.. آگے ایک سرد اندھیرا منہ کھولے ہوئے تھا.. ایک آہنگی ہوا کی تھی جو ان کے چہروں کو چھوتی ہوئی نکلتی تھی.. اور لاتعداد چمگادڑوں کی چیں چیں اور پروں کی سیاہ پھڑپھڑاہٹ تھی..

ٹارچ کی روشنی بھی چند قدم جا کر دم توڑ دیتی تھی..

اس کا بدن ایسا تھا کہ مٹھی میں آ سکتا تھا اور وہ اس کی مٹھی میں دھڑکتا تھا.. وہ اسے سہارا نہیں دے رہا تھا بلکہ وہ تھی جو اسے آسرا دے رہی تھی..

پہلی بار وہ اس غار کے اندر اترا تھا اور اس کے اندر بچپن کے سب بھوت پریت قہقہے لگاتے ہوئے پھر سے جنم لیتے تھے.. وہ خوفزدہ تھا لیکن اپنے خوف کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

ٹارچ کی روشنی پتھروں میں پوشیدہ ایک آبی ذخیرے پر پڑی اور وہ رک گئے.. ایک تالاب سا تھا جس میں غار کی چھت میں سے برستے پانی ٹپ ٹپ گرتے تھے.. اور ٹارچ کی روشنی

میں تالاب کے پانی اتنے شفاف تھے کہ اس کی تہہ برہنہ لگتی تھی اور عجیب ہیئت اور رنگوں کے کیڑے مکوڑے اس میں تیرتے تھے۔ ان میں ایک چھوٹی سی سفید دودھیا سفید رنگت کی مچھلی تھی جس کی آنکھیں نہ تھیں اور وہ بے چینی سے اپنی نابینائی میں ادھر ادھر تیرتی تھی اور آس پاس جو کیڑے مکوڑے تھے ان کی.. ٹارچ کی لائٹ میں چندھیا دینے والی سراسیمگی کو محسوس کرتی تھی..

"کیا یہی مرگ ہے؟" اس کے بازو میں پیوست سلطانہ چمٹی ہوئی.. یک جان ہو کر.. اس کے مٹھی بھر بدن کی اور آنکھوں کی نیلاہٹ تھر تھراتی ہوئی اس سے پوچھتی تھی..

"میں نہیں جانتا.."

"میں تم سے مرگ کا بھید پوچھنے آئی تھی.. کیا یہی مرگ ہے؟ گھپ اندھیرا.. اور ایک تالاب میں تیرتی تنہا اندھی مچھلی.."

"میں نہیں جانتا.."

تالاب کی شفاف سطح پر مرکوز روشنی کے دائرے کو اٹھا کر اس نے سلطانہ کے چہرے کی جانب کیا.. اس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ دیکھ نہ سکتی ہو"۔ "یہ میں ہوں.. آج میں نے اپنے آپ کو دیکھ لیا ہے.." وہ بہت دھیرج میں تھی.. اطمینان میں تھی اور بولتی جا رہی تھی.. "میں اسی طور نابینائی میں تیر رہی تھی.. اپنے تئیں سب کچھ دیکھتی تھی... اپنے قبیلے کو تیاگ کر دوسرے قبیلے کے رسم و رواج اپناتی تھی اور ویسے تو ہر کوئی ہنس سکتا تھا اور قہقہے لگا سکتا تھا.. جیسے میں لگاتی تھی.." اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں اور ان کے مقابل ٹارچ کی گولائی کو روشن پایا تو حیران ہو گئی۔ "پلیز ٹارچ کو پرے کرو... واپس چلو.. میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

غار کے دہانے سے باہر آتے ہی پہلے سانس نے ان کو اطمینان دیا کہ وہ زندہ ہیں.. غار کے گھپ اندھیروں کی مرگ سے بچ کر نکل آئے ہیں.. گھاس میں اٹکا ہوا بارشوں سے بوسیدہ اور پچکا ہوا پیپر کپ اگرچہ زندگی کی بے اعتباری کا شکوہ کرتا تھا..

بابا طفیل بخش اپنی ہانڈی اٹھائے دستر خوان سنبھالے اوپر آ رہا تھا..

کھانے کے بعد وہ تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے نابیناؤں کی طرح بھٹکتے.. ٹھوکریں کھاتے نیچے کھنڈروں تک آئے کہ شام کے بعد رات کی تاریکی یکدم امڈ کر آئی

اور ہر سو چھا گئی۔ مُہرہ مرادو کی خانقاہ بھی ہزاروں برسوں کی ایک اور رات میں پنہاں تھی اور صرف بابا طفیل بخش کی لالٹین تھی جو اس کے شکستہ مجسموں.. دیواروں، کوٹھڑیوں اور خشک تالاب کو اندھیرے میں سے پل بھر کے لئے باہر لاتی تھی.. اور اس تالاب میں سفید رنگت کی کوئی اندھی مچھلی نہ تیرتی تھی..

"سٹوپا کی زیارت تو کریں گے ناں صاحب جی؟"

"ہاں..."

خانقاہ کے ایک کونے میں ٹین کا ایک سستا اور کھڑکھڑاتا دروازہ تھا جو مقفل تھا..

بابا طفیل بخش نے کُرتے کی لمبی جیب میں پورا ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکال کر اس قفل میں متعدد بار گھمائی اور دروازہ وا کر دیا۔

"آؤ صاحب جی.."

ایک مختصر اور ناکافی کمرے کے اندر شاید دنیا بھر میں ابھی تک موجود.. ہزاروں برس کی شکست و ریخت کو سہنے کے باوجود ابھی تک مکمل حالت میں محفوظ چونے سے تخلیق کردہ ایک سات منزلہ سٹوپا اس ناکافی کمرے کی قید میں تھا.. وہ ایک ایسے سرو کی مانند اونچا ہوتا تھا جسے قید تنہائی میں ایک عرصہ ہو چکا ہو.. اس کی ساتوں منزلوں پر ابھرتے بدھ کی حیات کے ادوار.. بنیاد کو کندھوں پر سہارتے دیوتا.. مینڈک اور ہاتھی ابھی تک اپنی قدیم حالت میں.. موجود تھے..

سٹوپا اور کمرے کی دیواروں کے درمیان بس اتنی سی جگہ تھی کہ اس میں سے کندھوں کو ذرا ترچھا کر کے ہی گزرا جا سکتا تھا..

لالٹین کی روشنی صرف دو منزلوں تک جاتی تھی اور ان سے اوپر سات آسمانوں کی علامت منزلیں کمرے کی چھت کی نزدیکی میں اندھیرے میں گم تھیں..

بابا طفیل بخش لالٹین اپنے چہرے کے برابر کئے سٹوپے کی گولائی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا، ہر نشان، ہر ابھار اور دل کشی کو روشن کرتا اس کے گرد پھیرے لگانے لگا.. اور وہ دونوں پجاریوں کی مانند اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے.. گوتم کی حیات ہر پھیرے کے خاتمے پر اگلی منزل پر اٹھ جاتی.. ملکہ مایا تالاب کے کنارے بدھ کی پیدائش کے منظر سے آغاز ہوتا تھا اور اس کی موت کے بعد اس کی راکھ کو مختلف پیالوں میں محفوظ کر کے اونٹوں

اور ہاتھیوں پر لاد کر ملک بھر کی ریاستوں کو روانہ کئے جانے کے منظر تک...

ہر منزل کا پھیرا مکمل ہونے پر بابا طفیل بخش لالٹین کو اور اونچا کر کے اگلی منزل کو روشن کرتے چلنے لگتا..

"بابا..."

"جی صاحب.." وہ ایک تجربہ کار اور احتیاط پسند شخص تھا اس لئے ان پر نظر نہیں ڈالتا تھا، صرف لالٹین کی روشنی کی زد میں آنے والے چونے کی مجسموں کی طرف دیکھتا تھا۔

"آپ یہ لالٹین رکھ دیں... ہم ابھی آ جائیں گے۔"

"جی صاحب.." ان کی جانب نگاہ کئے بغیر اس نے لالٹین زمین پر رکھی اور ٹین کا دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے باہر چلا گیا۔

چونے کے گھیرے دار سات آسمان اس مختصر کمرے میں صرف ایک لالٹین کی روشنی میں ایک ایک کر کے اوپر ہوتے تاریکی میں جا رہے تھے..

"ہاں.. تمہیں عجیب و ہم انگیز جگہوں پر آنے کا خبط تھا.." وہ ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی.. جیسے ایک امریکی لڑکی ہی بے تکلفی سے بیٹھ سکتی ہے.. دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں پر سر رکھے.. "کوئی اپنی ڈیٹ کو ایسے انہونے مقام پر بھی لا سکتا ہے، میرے گمان میں بھی نہ تھا.. اور یہ مقام مجھ پر اثر کرتا ہے.. میں نے بہت سے قبیلے بدلے ہیں اور اگر میں زیادہ دیر یہاں رہی تو مجھے پھر سے اپنا قبیلہ بدلنا ہوگا.. انسان اپنے عقیدے اور اس کی عبادت گاہوں کے ماحول میں ہی رہے تو محفوظ رہتا ہے.. ذرا اس سے باہر نکلے تو شک جڑیں پھیلانے لگتا ہے کہ کیا پتا یہ سچ ہو.."

لالٹین میں تیل کم ہو رہا تھا.. بتی پھڑپھڑاتی اور یکدم جل اٹھتی.. وہ اس کے برابر میں جا بیٹھا۔

مہاتما بدھ... کنول آسن میں.. گیا کے جنگلوں میں.. اگلی ٹانگوں پر جھکے اپنے گھوڑے کنتھکا سے رخصت ہوتے ہوئے.. مست ہاتھی کو رام کرتے.. اندر سالا غار میں بلاؤں اور آفتوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے.. ایک بھاری پایوں کے پلنگ پر مردہ حالت میں اور گنجے بھکشو بین کرتے.. اور ان کی چتا کے شعلے... سب کے سب لالٹین کی پھڑپھڑاتی روشنی میں.. اندھیرے میں اوجھل ہوتے اور یکدم روشن ہوتے.. زندہ ہوتے.. حرکت میں آ جاتے..

"کیا پتا یہی سچ ہو.. لیکن..اس کے سوا ایک سچ ہے... جس کا مجھے پتا ہے..اور میں کہنا چاہتی ہوں۔" سلطانہ کے ہاتھ نے اس کے جھریوں بھرے ہاتھ کو تلاش کیا اور اپنے لمس سے اسے رام کیا۔ "تم نے کل صبح کراچی جانا ہے...اور مجھے بھی کل شام اپنی کینیڈین این جی او کی جانب سے ایک ماہ کے لئے سری لنکا کے لئے روانہ ہونا ہے...ایک انٹرنیشنل ریسرچ پروجیکٹ ہے اس میں شریک ہونے کے لئے..اسی لئے میں آپ سے آج ہی ملنا چاہتی تھی..."

"آئی ہوپ یو ول انجائے یور سیلف..."

"پلیز مجھے درمیان میں مت ٹوکو ورنہ میں... میں بھٹک جاؤں گی' کہہ نہ سکوں گی..اگر میں نے اس رات تمہیں یہ کہا تھا کہ اگر تم دائیں ہاتھ پر ناظم الدین روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھے چلے جاؤ تو میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی..تو یہ سچ تھا..اس ایک لمحے میں جو میری سوچ اور بدن سے ماورا کہیں سے یکدم اترا تھا' میں اتنی ہی سنجیدہ تھی جتنی کہ میں اپنے باپ کی بیٹی ہوں..اگرچہ کار سے اترتے ہی میں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی تھی.. تشویش اور شرمندگی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا تھا لیکن..اس لمحے کا سچ وہی تھا.."

"مجھے شبہ ہوا تھا کہ تم کوئی منصوبہ ساز بری عورت ہو.."

"کوئی بھی مرد یہی سوچے گا..اسی لئے میں شرمندہ تھی..اظہار کے سینکڑوں اور طریقے ہیں..لیکن اسی صورت میں جب سوچ سمجھ کر اپنی کیفیت کا بیان ہو... میں نے وہ نہیں سوچا تھا جو میں نے تم سے کہا..وہ لمحہ مجھ پر ایک ناگہانی آفت کی مانند ٹوٹ پڑا تھا..اور وہی سچ تھا.."

سلطانہ سمٹی ہوئی اس کے ساتھ آ لگی..اس کے اندر سمٹتی گئی..

سٹوپا کے اس حصے پر جہاں مہاتما کو گیان حاصل ہوا تھا' روشنی یکدم بڑھ گئی۔

"تم مجھے کبھی اپنے گھر لے کر نہیں گئے... جہاں تم رہتے ہو..سوتے ہو..جاگتے ہو..دانتوں کو برش کرتے ہو..صبح کا پہلا سگریٹ پیتے ہو..وہ تحریریں لکھتے ہو جن میں مرگ ہوتی ہے جو مجھے تمہارے پاس لے آئی ہے..."

"وہاں..کچھ بھی نہیں ہے.."

"کیا میں وہاں ہو سکتی ہوں؟"

پھڑ پھڑاتی اور بجھنے والی لالٹین کی روشنائی میں بھی اس کے گالوں کے روئیں اور ہونٹوں کے مسام ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے تیز دھوپ میں ہوں۔

"سری لنکا سے واپسی پر..." وہ ہاتھ بڑھا کر چونے کے اس مجسمے پر انگلیاں پھیرنے لگی جو بدھ کے نروان کی شانتی کی شعاعوں میں تھا۔ "پلیز ابھی مجھے ٹوکنا نہیں... ورنہ میں بھٹک جاؤں گی..سری لنکا سے واپسی پر میں..ڈاکٹر ہاشم سے معذرت کر سکتی ہوں اگر آپ..."

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا..

بہت دیر بعد وہ اس فقرے کی شدت اور یک لخت آمد کے ٹکراؤ سے باہر آیا..

سلطانہ کی خانہ بدوش نیلگوں آنکھوں کی ہمزاد دو نیلی بناوٹیں جیسے اس کے چہرے سے الگ ہو کر چونے کی سفیدی میں ابھرے ہوئے مجسموں کے گرد طواف کرتی انہیں اپنے رنگ میں بھگونے لگیں... بھڑکتی روشنی بھی نیلاہٹ میں رنگنے لگی..

"میں تو..." ایک پیدائشی طور لکنت زدہ بچے کی طرح خاور عجز اور حیرت سے لڑکھڑانے لگا..ایک کند ذہن طالب علم کی مانند گھبرا گیا.. "میں تو... آئی ایم سکسٹی... ایک عمر رسیدہ شخص ہوں... قربت مرگ میں ہوں..تو.."

"اور میں قربت محبت میں ہوں..میں اپنے ماضی کے تجربوں کو آواز نہیں دینا چاہتی کیونکہ بہت شور ہو گا..بازگشت ایسی ہو گی کہ کان بہرے ہو جائیں گے...بے شمار قصے واپس آئیں گے اور ان میں سے کچھ میں تمہیں سنا بھی چکی ہوں..میں نے بہت آوارہ گردی کی ہے لیکن میں تمہارے مقام پر ٹھہر جانا چاہتی ہوں..میرے لئے نہ مرگ وجود رکھتی ہے اور نہ تمہاری عمر..."

"اور نہ اس ہاتھ پر ابھرتی جھریوں کا نیم مردہ جھرمٹ..."

"نہیں... وہ مجھے اب دکھائی نہیں دیتے..یہ درست ہے کہ جرابوں اور اونی ٹوپیوں والے کاؤنٹر سے ہٹ کر کورڈ مارکیٹ کے اندر جب میں نے آپ کو دیکھا تھا تو مجھے یہ سب کچھ نظر آیا تھا جو بیتے برسوں نے تمہارے چہرے پر چھوڑا تھا..یہ درست..تمہاری عمر تمہارے سراپے پر درج تھی..لیکن مرگلا پہاڑیوں میں جو شام ہوئی تھی اور پھر رات اتری

تھی اور سپر مارکیٹ کے چوک سے مڑتے ہوئے.. تب تک.. وہ سب کچھ.. معدوم ہو گیا تھا اور تم صرف ایک شخص تھے.. جس کی رفاقت میں زندگی میں پہلی بار... میں خوش تھی.. اطمینان میں تھی.. جیسے میں اپنے باپ کی رفاقت میں ہوا کرتی تھی.."

اوپر... مختصر کمرے کی چھت تک.. سات آسمان تھے.. سات سُر تھے.. سات رنگ اور ساتھ کیفیتیں تھیں اور سلطانہ مہاتما کے نروان کو اپنی انگلیوں میں جذب کرتی بولتی تھی۔

"سنو... نہ اس ہاتھ پر ابھرتی جھرّیوں کا جال.. اور نہ تمہارا زوال... اور نہ تمہارے رخساروں کا ماس جو ڈھیلا ہوتا ہے اور نہ وہ سانس جو اکھڑتا ہے اور نہ ہی وہ آنکھیں جو بے دم ہوتی ہیں... ان کی میرے لئے کوئی حیثیت نہیں ...ہاں یہ تو ممکن ہے اور تمہیں اختیار ہے کہ میرا جو سچ ہے وہ تمہارا سچ نہ ہو... اور میں تم سے جواب نہیں مانگوں گی.. صرف یہ ہے کہ اگر سری لنکا سے واپسی پر... تم ایئرپورٹ پر موجود ہوئے تو... میں ڈاکٹر ہاشم کو انکار کر دوں گی..."

آخری بار پھڑپھڑا کر لالٹین کی بتی بجھ گئی.. لیکن سٹوپا کے ساتوں آسمان چھت تک جاتے ہوئے ایک ہلکی نیلاہٹ میں گھلتے جا رہے تھے..

خیمہ ہوا کے شرلاٹے بھرتے تیز و تند بگولوں کی گرفت میں آیا ہوا 'ایک جال میں جکڑے پرندے کی طرح بے بس اور بے حساب پھڑپھڑاتا تھا..

اس کی پھڑپھڑاہٹ مسلسل تھی اور سانس نہ لیتی تھی..

وہ ایک جل مرغی تھا جس کے پنجے ایک ڈور سے جکڑے ہوئے تھے اور وہ پھڑپھڑاتا تھا کہ میں اس سے چھوٹ جاؤں..

ان ہواؤں کے دباؤ سے خیمے کا کپڑا پچکتا تھا.. اور پھولتا تھا.. اس کی چھت ہوا کے بوجھ سے نیچے آتی تھی اور خاور اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹا دونوں ہاتھ بلند کئے اسے سہارتا اپنے اوپر گرنے سے بچاتا تھا..

باہر کہرام برپا تھا..

فہیم کی دیگچیاں اور برتن... سرور کی پرات.. اڑتے پھرتے تھے... گرتے تھے اور پھر لڑھکتے ہوئے کسی سخت شے سے ٹکرا کر چیخنے لگتے تھے... الاؤ کی جلی بجھی ٹہنیاں ہوا کے زور سے گھومتی ہوئی خیمے کے پردے سے ٹکراتی تھیں..

ہوا کے بے لگام بگولے خیمے کو ایک ناتواں جھاڑی کی مانند جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے..

خیمے کی کچھ میخیں ریت میں سے باہر آ چکی تھیں.. ریت میں میخ اگرچہ گہرائی تک اتر جاتی ہے مگر اس کی پکڑ میں گرفت نہیں ہوتی... اور خیمے کے فلیپ دوہرے ہو کر بے تاب دستکیں دیتے تھے.. ریت پر اپنے ہاتھ مارتے تھے اور کبھی پردے پر تیز بارش کی طرح برستے تھے..

اُس رات میں پہلے تو نہ ہوا تھی اور نہ کوئی سرگوشی.. سوائے سندھ کے بہاؤ کے..

انڈس کوئین کو رخصت کر کے خاور اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گیا تھا.. اور اس لمحے اتنی خاموشی اور ایسا ٹھہراؤ تھا کہ خیمے سے دور کنارے کے ساتھ لنگر انداز کشتی کے فرش پر اپنا جبڑا کھولے لیٹی پکھی کے خراٹے بھی سنائی دیتے تھے.. نہ ہوا تھی اور نہ کوئی سرگوشی.. سوائے سندھ کے بہاؤ کے.. اور سندھ سائیں ایک بوڑھی عورت کے چرخے کی طرح بہت مدھم رُوں رُوں کرتا بہتا تھا..

انڈس کوئین کو رخصت کر کے وہ اپنے خیمے کی علیحدگی اور تنہائی میں یہ حساب کرتا رہا کہ آج کیا تاریخ ہے اور سلطانہ کتنے روز بعد کولمبو سے واپس آئے گی اور اسلام آباد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں سے باہر آ رہی ہو گی..

اور کیا وہ اقرار ایک وقتی ابال تھا.. اس ایک لمحے کی طرح جب وہ اس کی جیب کی رقم کا حساب مانگتی تھی اور بعد میں شرمندگی اور شک سے دوچار ہوتی تھی... ایک عارضی اور جذباتی لاوا تھا جس نے وقت کی ڈھلوان پر بہتے ہوئے کچھ دیر بعد ٹھنڈا ہو جانا تھا..

لگاؤ میں کتنی گہرائی تھی...

واپسی کا سفر بہاؤ کے ساتھ تھا اور وہ ایک دو روز میں غازی گھاٹ پہنچ سکتے تھے.. اور وہاں سے اسلام آباد... لیکن یہ بھی عین ممکن تھا اس کی خصلت سے مطابقت رکھتا تھا کہ وہ واپس آئے تو پھر سے ٹھنڈی اور لاتعلق ہو.. سب کچھ بھول چکی ہو... اسے یاد دلایا جائے تو وہ کہہ دے کہ میں تو اس لمحے میں سٹوپا کے سات آسمانوں تلے لالٹین کی روشنی میں.. وہاں تھی ہی نہیں.. اس کا تذکرہ مت کرو.. تو پھر کیا ہو گا..

وہ اکثر وہاں نہیں ہوتی تھی جہاں وہ ہوتی تھی..

کروٹیں بدلتے ' سلیپنگ بیگ میں کروٹیں بدلتے سندھ کی مدھم رُوں رُوں کی آہستگی نیند کا ہزارپایہ لے آئی جو اس پر غالب آتا گیا.. اس نیند کے اندر کہیں اس کی سنڈی

کے بک شیلف کے پیچھے سے دیوار اور کتابیں مسمار کرتا بل ڈوزر کا بلیڈ نمودار ہوتا ہے اور وہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کر رہا ہے.. اپنا پورا زور لگا رہا ہے.. بل ڈوزر بھی ایک بُل کی مانند بے پناہ قوت اپنے آہنی بدن میں رکھتا ہے اور وہ ایک ناتواں بل فائٹر کی مانند اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے.. اسے پیچھے دھکیلنے.. اپنی ذات کے نہاں خانے سٹڈی کو بچانے کی تگ ودو میں ہے..

یہ کشمکش جاری تھی جب سکوت ٹوٹا اور باہر ایک سرسراہٹ کا آغاز ہوا جو لمحوں میں شرلاٹے بھرتی تیز ہواؤں میں بدلی اور اس کا خیمہ پھڑ پھڑانے لگا.. رات کا جانے کونسا پہر تھا.. خیمہ جیسے پہلے آب رواں پر خاموشی سے بہتا تھا اور اب کسی سمندری طوفان کی زد میں آ کر دباؤ کی شدت نہیں سہار تا تھا اور ایک ٹین کی مانند پچکتا تھا... پہلے تو وہ اس یک لخت موسمی تغیر سے لطف اندوز ہوا... آوازوں اور مہیب شرلاٹوں کو غور سے سنتا سلیپنگ بیگ میں لیٹا آنکھیں کھولے تبدیلی کے عمل کو غور سے سنتا رہا.. پھر ان میں کسی ناگہانی المیے کی صداؤں کا عنصر جنم لینے لگا.. ان سے خوف آنے لگا..

خیمہ اس کے دونوں ہاتھوں سے سنبھلتا نہ تھا.. وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بازو سیدھے کر کے خیمے کے پچکنے اور ہوا کے دباؤ سے مجبور ہو کر ڈھے جانے کے قریب وجود کو سہارا دینے کی کوشش کرنے لگا... خیمے کا میخوں سے آزاد کپڑا اس کے ماتھے سے ٹکرا کر چہرے سے چمٹتا تھا..

باہر.. دیگچیاں اور پراتیں اور چائے کے مگ اڑتے پھرتے تھے' رسّوں سے بندھی کشتی بار بار کنارے سے ٹکراتی تھی اور اتنی شدت سے ٹکراتی تھی کہ اس کی دھمک ریت میں جذب ہو کر خیمے کے اندر اس کے بدن تک پہنچتی تھی اور اس سے ٹکراتی تھی..

سرور اور ماماں جعفر بھاگتے پھرتے تھے.. وہ کشتی کے آزاد ہو کر سندھ میں کھو جانے سے خوفزدہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے شور مچا رہے تھے.. فہیم کی آواز بھی آتی تھی.. ہوا کی شدت میں کمی نہیں آ رہی تھی..

"پلیز کم ان..."

ساتویں منزل پر ایک طویل اور خاموش راہداری کے آخر میں وہ فلیٹ تھا جس کی

کال بیل بہت دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد' تذبذب اور فیصلہ نہ کر سکنے کی اذیت کے بعد.. خاور نے بجائی تھی...

ایئر پورٹ سے وہ سیدھا جناح ہوسپٹل پہنچا تھا.. اسے کچھ کچھ یاد پڑتا تھا کہ ٹیلیفون پر آخری بار گفتگو کرتے ہوئے جب کہ اس کی آواز ایک بھراہٹ میں بدل چکی تھی' اس نے شاید جناح ہوسپٹل کا نام ہی لیا تھا.. یا کوئی اور پرائیویٹ ہوسپٹل تھا جہاں سے وہ بول رہی تھی اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں آ رہا تھا.. اس کی آواز اتنی لاغر اور خرخراہٹ والی تھی کہ فقرے سمجھ میں نہ آتے تھے۔

استقبالیہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی تھکاوٹ میں ڈوبی مکا کی مسکراہٹ والی سسٹر نے نہایت اہتمام سے پرائیویٹ کمروں میں داخل مریضوں کی فہرست چیک کی.. دوبارہ دھیان سے چیک کی اور سر ہلایا "آئی ایم سوری لیکن.... نہیں سر... مسز عابدہ سومرو کے نام کی کوئی پیشنٹ یہاں ایڈمٹ نہیں ہے.."

"ایسا تو نہیں ہے کہ... میرا مطلب ہے.. ان کی حالت اچھی نہیں تھی تو.."

سسٹر نے ایک اور رجسٹر اٹھا کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی "نہیں سر... ان دو چار دنوں میں اس نام کی کوئی ڈیتھ بھی نہیں ہوئی..."

"آ... کین آئی میک اے کال پلیز.. اے لوکل کال.."

"پلیز گو اہیڈ.."

سسٹر نے فون اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا..

عابدہ کے کمرے سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا.. ظاہر ہے وہ وہاں موجود نہیں تھی..

اسے اپنی شدید ابتر طبیعت اور حماقت کا احساس ہوا... یوں منہ اٹھا کر کراچی چلے آنے سے پیشتر اسے کسی نے کسی طور چیک تو کر لینا چاہئے تھا کہ وہ کہاں اور کس ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہے... وہ اپنے آپ کو کوستا ہوسپٹل سے باہر آ رہا تھا جب اسے ساتویں منزل پر واقع اس فلیٹ کا خیال آیا جس کی کھڑکی کی چوکھٹ پر سورج تادیر انکار رہا تھا.. لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جس رہائشی کمپلیکس میں وہ فلیٹ واقع ہے وہ کہاں ہے.. سوائے اس کے کہ اس کی کھڑکی کا رخ سمندر کی جانب ہے..

ایک ٹیکسی پر سوار ہو کر اس نے ایک بظاہر بے مقصد اور طویل سفر کیا.. درجنوں بلکہ سینکڑوں ایسی عمارتوں کو جانچا جو ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھیں..بار بار اترا..ہر بلڈنگ کو پہچاننے کی سعی کی۔ اس کے محل وقوع کا اندازہ کیا.. کسی سے پوچھا بھی نہیں جاسکتا تھا اور کیا پوچھتا... اور یہ محض اتفاق تھا کہ ٹیکسی کی ونڈ سکرین کے سامنے "ہیپی ٹوڈلرز نرسری" کا بورڈ آیا اور گزر گیا...اسی نرسری کے سامنے وہ عمارت تھی..

"پلیز کم ان..."

دروازہ اندر سے مقفل نہیں تھا..

"آئی ایم سوری بٹ... میرا نام خاور ہے اور میں اسلام آباد سے آیا ہوں...اور عابدہ..."

"میں آپ کو جانتی ہوں.. آپ اندر آجائیں۔"

یہ وہی فلیٹ تھا جس کے اندر داخل ہونے پر اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے مکین کی سانسیں ابھی تک وہاں موجود تھیں..یہی مکین تھی جو اس کے سامنے کھڑی تھی..

سندھ کا ایک چھپر کاؤ.. ڈیکور مغربی.. پلنگ کے سرہانے ایک سکوت میں آیا ہوا چوبی مور...اور ماند پڑتے ہوئے سات آئینے..

"میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں.. میں عابدہ کے بہت نزدیک ہوں.. اس کی کوئی بات زندگی کا کوئی بھی رُخ مجھ سے چھپا نہیں ہوا۔ اس لئے میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں.. میرا نام شہلا آفریدی ہے..."

وہ ایک نہایت پچی تلی اور ہر شے سے آگاہ اور سنجیدہ شخصیت کی مالک عورت تھی..خاور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا.. سپاٹ رہا.. جیسے کسی پتھر کو سامنے پایا ہو.. وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے لئے وہ کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ اس کے لہجے میں سے کہیں کہیں ناپسندیدگی کا عنصر جھلکتا تھا...

"پلیز میک یورسیلف کمفرٹ ایبل..."

"تھینک یو" وہ جھجکتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا "عابدہ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے..." نہایت سرد لہجے میں اس نے کہا اور پھر اس کے سامنے سندھی

جھولے پر بیٹھ کر جھولنے لگی۔ "آپ ایک ادھیڑ عمر کے مرد ہیں آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا..."

"جی..."

"اگر ایک نوجوان لڑکی جسے اپنے حواس پر اختیار نہیں آپ سے رابطہ کرتی ہے' آپ سے محبت کا اظہار کرتی ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ اس کے لائق نہیں اور آپ کو پیچھے ہٹ جانا چاہئے تھا.."

"جی.. شاید ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور میں نے..اس کی طبیعت کیسی ہے' میں صرف اس کا حال جاننے کے لئے یہاں آیا ہوں.."

"میں آپ کے لئے کافی بنا کر لاسکتی ہوں..."

"جی نہیں' شکریہ"

"عابدہ ایک کامپلیکسڈ چائلڈ ہے.." وہ اپنے ننگے پاؤں سے قالین پر دباؤ ڈال کر جھولے کو جھلانے لگی۔ "یہ آپ کے لئے ایک شاک ہوگا لیکن وہ مکمل طور پر صحت مند ہے..اسے کوئی بیماری نہیں.. لیکن اس کے کچھ واہمے ہیں...اور وہ سمجھتی ہے اور ان لمحوں میں تہہ دل سے یہ سمجھتی ہے' جھوٹ نہیں بولتی کہ..وہ طرح طرح کی خوفناک بیماریوں کا شکار ہے.. مر رہی ہے اور کوئی اس سے محبت نہیں کرتا' پرواہ نہیں کرتا...یہ اس کے نفسیاتی عارضے ہیں جن سے میں بخوبی واقف ہوں... کیا آپ کو بھی اس نے اپنی عزیز ترین سہیلی کی موت کے بارے میں بتایا تھا.. بتایا ہوگا.. وہ میں ہوں.. میرا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا لیکن وہ ایک مکمل وارفتگی میں چلی جاتی ہے اور یقین کر لیتی ہے کہ ایسا ہو گیا ہے... میری لاش کو دیکھتی ہے' اس پر رو رو کر ہلکان ہو جاتی ہے' شدت غم سے بیمار پڑ جاتی ہے.. بے ہوش ہو جاتی ہے.. مجھے دفن کر آتی ہے.. ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی تفصیل بتاتی ہے جن سے وہ کبھی ملی بھی نہیں ہوتی...ایسی انٹرنیشنل یونیورسٹیوں میں پڑھ چکی ہوتی ہے جن کے نصاب سے بھی وہ واقف نہیں ہوتی...اسے البتہ دنیا کے بڑے بڑے ہسپتالوں اور مشہور ڈاکٹروں کے ناموں کا پتا ہے..اور کبھی کبھار وہ کسی ایسے شخص کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو جاتی ہے جسے اس نے کبھی ٹیلی ویژن پر دیکھ لیا ہو.. کسی اخبار میں اس کی تصویر نظروں سے گزر گئی ہو.. مجھے آپ سے یہی شکایت ہے کہ آپ نے اپنی عمر کو نہیں

دیکھا اور مردانہ انا پرستی کے زعم میں اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔"

یہ عورت... سندھی جھولے پر آہستہ آہستہ جھولتی ہوئی.. نپی تلی.. ہر شے سے آگاہ جو کچھ کہہ رہی ہے کیا یہ حقیقت ہے..یا یہ خود کوئی نفسیاتی مریضہ ہے جس کے اپنے کچھ واہمے ہیں... کیا پتا عابدہ ایک حقیقت ہو جسے یہ ایک واہمہ بنا کر پیش کر رہی ہے..

"اس کے پورے بدن پر نیلے دھبے اور کھرینڈ تھے... وہ تو واہمہ نہیں.."

"نہیں..وہ ایک عام سکن الرجی کے آثار ہیں' اس کے سوا کچھ بھی نہیں..."

"وہ کسی بھی ایسے مرد کے عشق میں مبتلا ہو جاتی تھی جو..."

"ہاں..."

"اور مرد بھی تھے؟"

"ہاں..."

"آپ اس کی نفسیاتی کمزوریوں سے آگاہ تھیں اور اس کے باوجود آپ نے یہ فلیٹ اس کے سپرد کر دیا..."

"میں کر بھی کیا سکتی تھی..وہ واقعی ان وقتوں میں آپ کی شخصیت میں پوری طرح الجھ چکی تھی..آپ کے عشق میں اس بری طرح سے گرفتار تھی کہ اپنے خاوند اور بیٹی کو بھی چھوڑ دینا چاہتی تھی..میں جانتی تھی کہ یہ ایک عارضی پڑاؤ ہے' وہ زیادہ دیر یہاں قیام نہیں کرے گی..میں اس کے ساتھ بحث نہیں کر سکتی تھی' اسے روک نہیں سکتی تھی کہ ان وقتوں میں وہ واقعی مکمل طور پر آپ کے ساتھ کومٹڈ تھی اور اگر میں یہ فلیٹ آپ دونوں کے لئے خالی نہ کرتی تو میں اسے کھو دیتی...اور وہ اتنی پیاری اور عزیز چیز ہے اور اتنی معصوم ہے کہ میں اسے کھونا نہیں چاہتی تھی... میں آپ کے لئے کافی بنا کر لا سکتی ہوں.."

"تھینکس..."

سورج ذرا نیچے ہوا اور شیشے کی کھڑکی کے کنارے پر اٹک کر پورے فلیٹ کو چکا چوند کر دیا...ایک سمندری پرندہ آہستگی سے پر ہلاتا سرخ گولے میں داخل ہوا..تادیر اس میں ہولے ہولے پرواز کرتا رہا اور پھر نکل گیا.. عشق کا سرسبز ذخیرہ ویران تھا..اس میں نہ کوئی مور بولتا تھا اور نہ جن کے ساتھ چمن میں بچھے پلنگ پر کوئی گلے لگ کر سوتا تھا...

"وہ کہاں ہے؟"

"اس وقت؟...اپنے خاوند کے ساتھ...امریکہ میں...اپنی بچی کے ساتھ.. دو روز ہو گئے ہیں۔"

"اور وہ صحت مند اور خوش ہے؟"

"ہاں...اور فون پر مجھ سے بات کرتی رہتی ہے..اور اس نے کبھی آپ کا حوالہ نہیں دیا..وہ وہاں سے کوچ کر کے آگے جا چکی ہے جہاں آپ تھے..میں آپ کے لئے کافی کا ایک کپ بنا کر لاتی ہوں..."

دھمک...دھمک...ٹھک...ٹھک...

کشتی تیز ہواؤں کے آگے بے بس سندھ کے پانیوں پر ڈولتی کھونٹے سے بندھے کسی اڑیل بیل کی مانند کناروں کے ساتھ سر ٹکراتی تھی.. جیسے اکلوتے بیٹے کی مرگ پر ایک ماں اس چوکھٹ پر سر پٹختی ہے جسے پار کر کے وہ آخری بار گھر سے نکلا تھا۔

خاور ایک سیمسن کی طرح جو معبد کے ستونوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا' خیمے کو سہارا دیتا تھا اور باہر فہیم کی دیگچیاں اور سرور کی پرات ہواؤں میں اڑتی پھرتی دفیں بجاتی سنائی دیتی تھیں..

ہواؤں کی شدت میں تو کمی نہ ہوئی البتہ اس کے بازو تھک گئے...اور اس کا سر نیند سے بوجھل ہونے لگا... شوکتی ہوائیں معمول ہو گئیں۔

سرور اور ماماں جعفر کشتی کو قابو میں رکھنے کی سعی کرتے..گال مندا کرتے ہواؤں کے سنگ ان کے سُر میں سُر ملاتے شور کرتے تھے..

دریا کے ریتلے کنارے ایک مہیب آواز کے ساتھ پانیوں میں گرتے تھے۔ جیسے ان میں کسی نے چھلانگ لگا دی ہو..ان کا ریتلا بوجھ پانی میں گرتا تھا اور ہولناک گونج کو جنم دے کر گم ہو جاتا تھا..

ٹھہن ہے... ٹھہن ہے سائیں..یہ کون پکارتا تھا..

نیند کی مدہوشی میں... سلیپنگ بیگ میں سر لپیٹے بدن کی تھکن اور پچھلی رات کے جگراتے میں..اس نے بمشکل کروٹ بدلی..

ہاں وہ فون پر مجھ سے بات کرتی رہتی ہے.. اس نے کبھی آپ کا حوالہ نہیں دیا.. وہ وہاں سے کوچ کر کے آگے جا چکی ہے جہاں آپ تھے..

سائیں ہم تو آپ کے مرید ہیں' آپ کی چوکھٹ پر حاضری دینا چاہتے ہیں.. حکم کریں سائیں..

جھکڑ اور تیز ہوائیں صبح تک چلتی رہیں.. ان میں کمی نہ آتی تھی۔ پو پھٹی تو جیسے وہ اسی کی منتظر تھیں۔ یکدم سکون ہو گیا.. ہر شے اتھل پتھل اور بے چینی اور بے اختیاری سے نکل کر سکوت میں آ گئی.. سب کچھ ٹھہر گیا... کشتی کناروں سے ٹکرا ٹکرا کر اب ایک نامراد عاشق کی طرح ستا رہی تھی.. جنوں رخصت ہو چکا تھا.. سب چہروں پر ریت اور ہواؤں کی تندی کی نشانیاں تھیں اور پپوٹے ان کے بوجھ سے بمشکل کھلتے تھے... برتن اور دیگچیاں.. چمچے ہوئے.. فہیم سر جھکائے انہیں جھاڑیوں میں تلاش کر رہا تھا..

کنارے کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مردہ مچھلیاں پڑی تھیں.. کہیں کہیں کسی ایک کی دُم لمحہ بھر کے لئے پھڑکتی..

سرور نے بانس پانی کے سینے میں اتارا.. کشتی نے کنارے سے ٹکرا کر اپنے آپ کو پرے کیا اور سندھ کے بہاؤ میں آ گئی۔

ابھی پو پھٹ رہی تھی.. نیم تاریکی بہت بچے سے منظر کا دامن چھوڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی ریت اور نیند کے جھونکے تھے.. پپوٹے کھلتے نہ تھے..

"میں آرام کرتا ہوں فہیم.. مجھے ڈسٹرب نہ کرنا"

"ٹھیک ہے سائیں... رات بہت بے آرامی رہی.. آپ ریسٹ کرو"

سندھ کی ندیا دھیرے دھیرے بہتی تھی اور کشتی اسی دھیرج سے اس میں بہتی تھی اور خاور اس کے ہلکوروں میں اپنے بدن کے تھکاؤ اور جگراتے کو زائل کرنے کے لئے داخل ہوا اور عارضی موت کے تجربے کے اندر اترتا گیا..

ان گنت عارضی پڑاؤ تھے جو غازی گھاٹ سے چلنے کے بعد رات کے بسیروں کے لئے آئے.. سروٹوں کے گھنے ذخیرے.. ریتلے ٹاپو' بے آباد جزیرے' پرندوں کی چراگاہیں.. ایسے ٹیلے جن پر صرف ایک دو خیمے بمشکل جگہ پاتے تھے اور فہیم احتیاط سے جھومر ڈالتا تھا کہ کہیں پانی میں نہ گر جائے.. یہ سب عارضی پڑاؤ تھے اور وہ انہیں اپنی ضرورت کے مطابق استعمال

کرتے تھے.. ان کی ریت کو روندتے تھے' الاؤ جلا کر ان کے بدن کو سیاہ کرتے تھے.. خالی ڈبے' پلاسٹک کی بوتلیں.. ہڈیاں.. شاپر.. ان کے کنوارپن پر بکھیر کر انہیں چھوڑ دیتے تھے..

اور جب اگلا پڑاؤ آتا تھا تو پچھلا پڑاؤ انہیں یاد بھی نہیں رہتا تھا..

میں جانتی تھی کہ یہ ایک عارضی پڑاؤ ہے' وہ زیادہ دیر یہاں قیام نہیں کرے گی۔

عابدہ سومرو نے بھی اسے استعمال کیا تھا... اس کے بدن پر جھوٹ اور نفسیاتی عارضے کے الاؤ جلا کر اسے شب بھر کے لئے استعمال کیا تھا... اسے بیوقوف بنایا تھا اور وہ بن گیا تھا.. شہلا آفریدی درست کہتی تھی.. ایک ادھیڑ عمر کے مرد کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا.. پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا..

لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی..

پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا..

انسان ہمیشہ سے ایک عارضی پڑاؤ رہا ہے... ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ دوسرے قصوروار ہیں... اس کی بیوی کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا.. وہ زندگی کے ایجنڈے میں ایک آئٹم تھا جو گھریلو اخراجات کا بندوبست کرتا ہے' بچے پیدا کرتا ہے.. اور یہ بچے بھی اس کے عارضی پڑاؤ میں ذرا ٹھہرے اور کوچ کر گئے.. ان میں سے ہر فرد اس لمحے جب وہ اس میں قیام کرتا تھا انتہائی بے لوث تھا اور اس سے محبت کرتا تھا.. اس قیام کے دوران کہیں کوئی خود غرضی شامل نہ تھی.. اس کی بیوی نے بھی اسے بہت احتیاط اور لگن سے سنبھال کر رکھا تھا.. بچے بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اور ان کی بانہوں کا لمس اس سے جدا نہ ہوتا تھا.. لیکن وہ ایک عارضی پڑاؤ ہی تھا.. اگر عابدہ سومرو نے بھی اسی تسلسل میں اسے استعمال کیا.. اگرچہ ان لمحوں میں اس کی محبت میں بری طرح الجھی رہی.. تو یہ پہلی بار نہ تھا..

اور غلافی آنکھیں بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی تھیں.. وہ بھی تو ایک غلام ڈھونے والے سمندری جہاز کے کپتان کی طرح تھی جو اپنے خاوند اور بچوں کے عارضی پڑاؤ سے نکل کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے چلی جاتی تھی..

سلطانہ کی زندگی میں بھی ایسے ان گنت پڑاؤ تھے.. اپنے کچے گھر کے صحن میں سائیکل کی گھنٹی پر اپنا ننھا منا انگوٹھا رکھتی ہوئی.. اوزک کے باغوں میں.. امریکہ کے فٹ پاتھوں

پر اوندھی پڑی قہقہے لگاتی اور ایک ایرانی ٹیکسی ڈرائیور کے ایک فقرے کی سچائی پر ایمان لا کر اپنی زندگی کا نقشہ بدلتی ہوئی.. جو ڈاکٹر ہاشم کے عارضی پڑاؤ سے اُٹھ کر اُس کی خیمہ بستی میں آنے کو تیار تھی.. اور اس عمر میں اُس کا پڑاؤ تو قدرتی طور پر بے حد عارضی تھا..

ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ وہ عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال ہوا جب کہ دوسروں کو اس سے بھی یہی شکایت ہوتی ہے..

بُلھن ہے... بُلھن ہے سائیں.. یہ کون پکارتا تھا..

خاور نے کروٹ بدل کر اس آواز پر کان دھرا اور ابھی تک ریت بھری آنکھوں کے پپوٹوں کو اوپر کیا.. کشتی کے پلیٹ فارم پر سرور اور جعفر کے سیاہ پاؤں نہیں تھے، فہیم جھکا ہوا تھا۔ "سائیں آپ کو ڈسٹرب کیا ہے مگر جاگ جاؤ.. کیا خوش بخت دیہاڑا ہے.. سندھ سائیں کے سینے پر اندھی ڈولفن ابھرتی ہے اور نظارہ کراتی ہے.. سائیں باہر آ کر دیدار کرو.. منظر کشی کرو..."

خاور باہر آ گیا۔

سندھ سائیں کا وسیع حوصلہ مند سینہ ہموار تھا.. پانیوں کی ایک بچھی بچھی بہتی چادر تھی جس پر پو پھٹنے کے بعد ابھی ابھی سورج کی زرد کرنیں اتری تھیں اور اس چادر کو نیم سنہری رنگتی تھیں.. جہاں تک نظر کام کرتی تھی وہاں تک صرف پانیوں کی کسمساتی چادر تھی اور اس پر کوئی ایک لہر.. کوئی ایک کروٹ دکھائی نہ دیتی تھی..

"ابھی نظر نہیں ہٹاؤ سائیں.. دیکھتے رہو.. دیدار کرائے گی سائیں.." فہیم بُت بنا.. آنکھوں کو پتھر کیے اُدھر تکتا جا رہا تھا.. سرور اپنے بانس کو بھولے ایک عقیدت اور حیرانی کو اپنے سیاہ چہرے پر نقش کیے پانی کی ہموار اور ابد تک جاتی چادر کو دیکھتا جاتا تھا.. آنکھیں نہیں جھپکتا تھا۔ جعفر بھی اسی حالت میں تھا.. وہ دونوں پانیوں کو ایسے تکتے تھے جیسے ان میں سے خواجہ خضر کا ظہور ہونے کو ہے..

"نظارہ کرو سائیں.." فہیم یکدم چیخا اور سندھ کی چادر کے جس حصے پر خاور نظریں جمائے ہوئے تھا اس سے بالکل مخالف سمت میں اشارہ کیا..

جتنی دیر میں پلٹ کر اس نے اُدھر نگاہ کی.. وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ وہاں چادر

میں وہ ہموارگی برقرار نہ تھی.. وہاں کچھ تلاطم، کچھ بلبلے اور کروٹیں تھیں..

"کدھر فہیم"

"سائیں وہ غوطہ لگا گئی ہے.. ابھی ابھرے گی.. بس نظر بھر کر دیکھتے رہو.. جدھر ڈوبی ہے ادھر سے ذرا آگے نظر رکھو.. سانس لینے کے لئے اوپر آئے گی اور نظارہ کرائے گی.."

کشتی آپو آپ اپنی من مرضی سے ڈولتی بہتی جاتی تھی..

وہ آرگوس کے سحر زدہ ملاح تھے جنہوں نے سائرنز کے گیت سن لئے تھے..

ایک مدت گزر گئی.. اس کی ریت بھری آنکھیں تھکنے لگیں..

صرف پکھی تھی جو اس انتظار میں شامل نہیں تھی.. بلھن کو دیکھنے کی چاہت نہ رکھتی تھی.. وہ اس گہما گہمی سے لاتعلق کشتی کے پچھلے حصے میں گوٹھ مارے حسب معمول اپنا جھگا اٹھا کر اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی.. صرف ایک بار اس کی سیاہ آنکھوں نے اس تک سفر کیا لیکن اس کے سانسوں کی ہواڑ میں اب دعوت کی وہ گرمی نہ تھی کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ اس سائیں میں وہ بات نہیں ہے جو اسے میل کرنے پر مجبور کر دے..

کرنیں تیز اور روشن بھالوں کی طرح پانی میں اتر کر بجھتی جاتی تھیں.. اور اسی پانی میں سے یکدم آنکھ کے جھپکتے ہی ایک سرمئی رنگت کی پُشت کا ابھار بلند ہوا... آبی چادر کی ہموارگی چاک ہوئی اور اس میں سے انڈس ڈولفن کا نابینا وجود ابھرا... اس کی گیلی پشت پر کرنیں پھسلتی گئیں..

خاور کا دم رک گیا.. یہ ایسا پرشکوہ منظر تھا.. آنکھوں میں ریت کے جو ذرے تھے وہ موم ہو گئے اور اب وہ کوشش بھی کرتا تو اپنے پپوٹوں کو جھپکا نہیں سکتا تھا۔

ڈولفن ابھرتی گئی.. گیلے بدن پر سورج کو وصول کرتی ہوئی.. روشن ہوتی ابھرتی گئی اور پھر اس کی اندھی تھوتھنی پل بھر کے لئے پانیوں سے باہر آئی اور پھر اسی پل میں وہ تمام کی تمام پھر سے ڈوب گئی.. آبی چادر پر اس کے عارضی پڑاؤ کے چند بلبلے اور لہریں باقی رہ گئیں جو فوراً ہی ہموار ہو کر اس کی موجودگی کے امکان سے منحرف ہو گئیں..

"اب اِدھر نظر کرو سائیں.." فہیم نے وہاں سے نگاہیں ہٹائیں اور کشتی کے عین برابر میں اپنی توجہ مرکوز کی۔ "اِدھر آئے گی"

اور وہی ڈولفن اب کے ابھری تو کشتی کو تقریباً اپنے کندھوں سے دھکیلتی پانی سے

نکلی... اس کی تھوتھنی باہر آئی تو بے چراغ اور بے نور تھی..

وہ انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی کہ وہ وہاں ہیں..

وہ ڈولفن اگرچہ چند لمحوں کے لئے نمودار ہوئی لیکن اس کی نظروں کے سامنے وہ جیسے ساکت ہو گئی... وی سی آر پر چلنے والے کسی نظر کی مانند ریموٹ کا بٹن دبانے سے ٹھہر گئی... تصویر ہو گئی.. اور پھر دوبارہ اسی بٹن کے دبانے سے متحرک ہو کر غڑاپ سے پانیوں میں ڈوب گئی..

یہ ڈولفن آپرا کا آغاز تھا..

پانیوں کے اندر جانے وہ کتنی تھیں..

پھر سندھ کی آبی چادر تار تار ہونے لگی.. وہ جا بجا ابھرتی تھیں.. شعاعوں کی زد میں آ کر روشن ہوتی تھیں اور پھر ڈوب جاتی تھیں..

جیسے وہ ایک پرفارمنس دے رہی ہوں.. سدھائی ہوئی ہوں.. اور صرف ان کے لئے جو ایک کشتی پر سوار ان کی آماجگاہ میں آ نکلے تھے، پرفارم کر رہی تھیں۔

ان کے رنگ سرمئی تھے.. لیکن کشتی سے دور ایک طویل فاصلے پر ایک بہت بڑی جسامت کی ڈولفن سانس لینے کے لئے پانیوں میں سے باہر آئی تو وہ برف سفید تھی۔

وہ کوئی موبی ڈک تھی۔

نہیں.. موبی ڈک تو ایک قاتل وہیل تھی، اس کے اندر کیپٹن اہاب کی ٹانگ کے علاوہ متعدد کشتیوں کے تختے اور ملاحوں کے بدن تھے جنہیں وہ نگل چکی تھی..

اس ڈولفن نے کوئی ایسی واردات نہیں کی تھی..

وہ تو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی.. واردات کیسے کر سکتی تھی۔

وہ سفید ڈولفن بار بار ایک ہی مقام پر ظاہر ہو رہی تھی اور خاور اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کشتی اس کے قریب ہو جائے.. وہ اس کے لشکیلے سفید بدن میں کوئی ہارپون گاڑ کر... کوئی نیزہ اتار کر اسے مارنا نہیں چاہتا تھا.. بلکہ اسے اپنی نزدیک ترین قربت میں دیکھنا چاہتا تھا.. کہ جب وہ پانیوں میں سے جنم لیتی ہے تو اس کی تھوتھنی پر جہاں اس کی آنکھیں ہونی چاہئے تھیں وہاں اگر کچھ بھی نہیں ہے.. تو کیا اس قربت میں وہ اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتی ہے کہ وہ وہاں ہے.. خاور وہاں ہے... اور اس کا گھر مسمار ہو چکا ہے... وہ بے سہارا اور بے گھر ہے.. اور اس کی حیات ایک عارضی پڑاؤ ہے...

یہ جاننے کے لئے اسے سفید ڈولفن کی ہمسائیگی کی چاہت تھی..

سندھ کے پانی ان کے بار بار ابھرنے سے جیسے ابل رہے تھے..

انہیں سانس نہ آتا تھا کہ ہر لحظہ ان میں سے کوئی ایک ڈولفن سانس لینے کے لئے کھلی فضا میں پہلے اپنی پشت نمودار کرتی تھی اور پھر اپنی تھوتھنی بلند کرتی تھی... نابینائی کی بے چارگی سے بلند کرتی تھی... ایک وہیل کی طرح ظاہر ہوتی تھی اور ڈوب جاتی تھی..

سرور اور جعفر جو عام حالات میں گلہریوں کی طرح ٹر ٹر کرتے رہتے تھے، خاموش کھڑے انہیں تکتے جاتے تھے..

"سرور..."

"جی سائیں.." وہ گھبرا کر اپنے سکوت میں سے باہر آیا..

"تم پانی کے پُونگ ہو.. سندھ سائیں میں سے ہی اپنا رزق نکالتے ہو تو کبھی اسے بھی شکار کرتے ہو۔"

"نہ سائیں نہ.." سرور نے کانوں کی لویں چھو کر جیسے ایک عظیم گناہ کے لئے معافی مانگی۔ "نہ... بلہن کو پکڑنا تو گناہ ہے سائیں... پر کبھی گناہ ہو جاتا ہے.. ہم لوگ رات کے وقت مچھلی کے شکار کے لئے دریا میں جال ڈال کر چلے جاتے ہیں اور جب سویرے وہاں آتے ہیں تو... کبھی سال دو سال بعد ایسا ہو جاتا ہے کہ اس جال میں بلہن بھی پھنس جاتی ہے.. اور وہ ہمیشہ مردہ حالت میں ملتی ہے کیونکہ پانی کے اندر باہر آ کر سانس لینے کے بغیر وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی... جال میں پھنس کر پوری رات نہیں نکال سکتی اور مر جاتی ہے.. تو ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہوتا... ہم تو بلہن کو بڑا سائیں مانتے ہیں.. کیونکہ جب یہ نظر میں آوے تو ہمیں شکار ملتا ہے.. اس کا دیدار مبارک ہوتا ہے.. جان بوجھ کر کبھی نہیں مارتے... اب سوہنا رب اس کی قضا لے آوے تو بھی ملول ہوتے ہیں..."

سندھ کی چادر لیر و لیر ہو رہی تھی..

اس میں ایک مسلسل تلاطم کی کیفیت تھی... ان کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہ تھی.. مگر وہ جا بجا ابھرتی... اٹکھیلیاں کرتی.. ڈوبتی ابھرتی.. قلابیں کرتی تھیں..

"یہ تو ادھر گھر بنائے کھڑی ہے سائیں..." سرور کا جتنا انہیں دیکھنے کے ہیجان

سے ذرا کانپتا تھا۔ "ادھر پانیوں کا میل ہو رہا ہے ناں... تو بیچ میں جہاں دونوں دھارے زور کرتے آتے ہیں اور ان کا ملاپ ہوتا ہے تو ادھر کچھ علاقہ ایسا بنتا ہے کہ اس میں پانی کھڑے ہوتے ہیں جیسے گھڑے میں ہوں تو ان میں مچھلی بہت آتی ہے اور بلہن جو ہے اسے کھانے کے شوق میں خاص طور پر ادھر آجاتی ہے.. گھر بنائے کھڑی ہے سائیں.."

ایک اور سست اور لاپرواہ ڈولفن نے پانی میں سے ابھار کیا لیکن اس کی تھوتھنی باہر نہ آئی اور وہ ایک سمندری جہاز کی طرح بہت دھیرے دھیرے پانی میں ڈوب گئی..

ماماں جعفر ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا..

وہ ایک ایسا ملاح تھا جو پانیوں کے گہرے بھید نہ کھولنے کا وچن دے چکا تھا اور کچھ نہیں بولتا تھا.. کچھی اپنی حیاتی میں بہت کچھ دیکھ چکی تھی.. اُس کے بدن کی ریت بہت بار عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال ہو چکی تھی اور وہ بھی کچھ نہیں بولتی تھی' بچے کو چمٹائے بیٹھی تھی..

"ماماں..." سرور اپنے بلہن کے دکھاوے کے مسرت آمیز ہیجان میں شرارت سے پکارا۔ "تو نہیں بولتا... ہم تو تیرے بال ہیں بڑے کہتے تھے کہ تو نے ایک بار بلہن کو گھر والی کیا تھا.."

جواب میں ماماں نے اپنی ٹھیٹھ زبان میں اس کے ساتھ کچھ گال مندا کیا لیکن اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا..

فہیم جو پچھلی رات کے جھگڑے میں برتنوں کے پچک کر ناکارہ ہو جانے کے رنج میں تھا یکدم کھل اٹھا۔ "ہاں جعفر یہ کیا قصہ ہے.. بلہن گھر والی کیسے ہو سکتی ہے.. ہیں؟"

"سائیں کے سامنے تو زبان نہیں کھلتی فہیم..." جعفر نے چھاتی کو شرمندگی سے کھجلایا "اور بتانے کی بات بھی نہیں یونہی مشہوری ہو گئی ہے.. جوانی میں بہت نادانی ہوتی ہے۔ بندہ جنور ہو جاتا ہے پر میں نہیں ہوا.. یونہی قصہ بنا لیا ہے.."

ایک اور ڈولفن سندھ کے سینے کو چیر کر اوپر آئی اور پھر پانیوں کو پچھاڑتی ہوئی نیچے چلی گئی..

"سناؤ ناں ماماں..." سرور نے اپنی دائیں آنکھ بند کر کے خاور کی جانب دیکھا اور مسکرانے لگا..

"کچھی تو نہیں سنتی..." جعفر نے پیچھے مڑ کر تسلی کی اور پھر بولا "میں بہت چھوٹا تھا ابھی جوانی میں نکل رہا تھا جب میرے دادا کے جال میں ایک بلہن پھنس گئی.. مامن ماسا نے بتایا تھا کہ بلہن... ایک لڑکی کی طرح ہوتی ہے.. اس کے اعضا بھی ایک عورت والے ہوتے ہیں اور اگر تم اسے گھر والی سمجھ کر اس کے ساتھ میل کرو تو ساری زندگی تمہارا زور کم نہیں ہوتا.."

"بلہن کے ساتھ"

"ہاں سائیں.. پر میں جنور نہیں ہوا.. پر یہ قصے مشہور ہیں کہ ایسا ہوتا ہے اور اسی لئے ہمارے ہاں رواج ہے کہ اگر ایک بندہ بلہن کو پکڑ کر لے آتا ہے تو قبیلے والے اسے نہیں کھاتے.. ہاں اگر دو ہوں تب کھا لیتے ہیں کہ پاک ہو گی..."

"ماماں اصل بھید نہیں کھولتے... چلو سائیں کو ہی کان میں بتا دو کہ کیا ہوا تھا.."

فہیم اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ "قصے یونہی تو مشہور نہیں ہو جاتے..."

"ہو جاتے ہیں.." جعفر کے چہرے پر ناراضگی ابھری..

"اسے بلہن کیوں بولتے ہیں؟"

"ادھر کی بولی میں بلہن کسی چھلانگ لگانے والی شے کو بولتے ہیں اور اگر کوئی موٹا اور بدہیئت شخص ہو اسے بھی کہتے ہیں..."

فہیم اس کے پاس ہوا.. اپنی پرمسرت کیفیت کو رخصت کر کے نہایت سنجیدگی سے اپنی آواز مدھم کر کے اسے کہنے لگا۔ "سائیں برا نہ ماننا پر ایک بات پوچھ لوں... یہ درست ہے کہ سائیں برمانی نے ہدایت کی تھی کہ خاور صاحب جہاں تک جائیں لے جاؤ. تم نے ان کا ساتھ دینا ہے جب تک یہ خود لوٹنے کو نہ کہیں.. پر سائیں آج سویرے بھی سرور اور جعفر نے مجھ سے بات کی تھی کہ بہت دن ہو گئے ہیں.. صاحب نے گھر کب جانا ہے.. تو سائیں کبھی نہ کبھی تو واپس جانا ہے تو کب جانا ہے.. آپ کا گھر تو ہو گا.. سب کا ہوتا ہے تو کب جانا ہے..."

وہ گئی رات... جب کہ بارہ کہو کے دیہات مکمل تاریکی میں سوتے تھے اور کہیں کہیں ایک آدھ بلب ٹمٹماتا تھا.. مری روڈ اجاڑ ہو چکی تھی اور سملی ڈیم کو جاتی سڑک پر

ویرانی اور اکلاپے کے سوا کچھ نہ تھا... وہ سفید کاغذوں پر جھکا.. جو ٹیبل لیمپ کی تیز روشنی میں کچھ زیادہ سفید ہوتے تھے اپنے ذہن پر بوجھ ڈالتا تھا... ان پر اتارنے کے لئے لفظوں کا چناؤ کرتا تھا جب اس ٹھہرے ہوئے سکوت بھرے سناٹے میں اس کے عین سامنے جو بک شیلف تھا' اس کے اندر ایک گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور بغیر کسی انتباہ کے بل ڈوزر کے آہنی بلیڈ اپنے دانت کھولے دیوار کو ڈھاتے ہوئے اس کی کتابوں' تصویروں اور مجسموں کو مسمار کرتے اس کی کرسی تک آگئے تھے... اس نے بمشکل اپنے آپ کو ملبے میں دفن ہونے سے بچایا تھا..

اُس تک آنے سے پیشتر وہ اس کے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں دندناتے انہیں ملیامیٹ کر چکے تھے۔

صبح ہوئی تو وہ ایک کھنڈر کے درمیان میں تھا..

اُس کا گھر کسی حد تک غیر قانونی تو تھا کہ اس کا نقشہ پاس نہیں ہوا تھا لیکن آس پاس سینکڑوں گھر اسی طور وجود میں آئے تھے.. اور وہ سب کے سب نہیں گرائے گئے تھے.. بل ڈوزر کے آہنی بلیڈ اندھے نہیں تھے' تخصیص کر سکتے تھے.. وہ دیکھ سکتے تھے کہ کون حیثیت والا ہے.. کسے صرف چھونا ہے صرف چار دیواری کو گرانا ہے.. اور کسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینی ہیں اور کسے کھنڈر کر دینا ہے.. جن کے لئے آنکھیں کھلی رکھی گئیں وہ اقتدار کے ایوانوں تک رسائی رکھتے تھے.. جرم کی دنیا میں اہمیت رکھتے تھے.. کچھ سیاست دان تھے اور کچھ سائنس دان اور کچھ فوجی... لیکن اس کی خاور کی کوئی حیثیت نہ تھی... ایک کاغذ کالے کرنے والے شخص کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے.. اس کی وقعت اور تعظیم کیا ہو سکتی تھی۔

بہت سے دوسرے تھے جو آہ و بکا کرتے تھے۔ ان کے بچے سہمے ہوئے تھے اور زندگی کے کُل آثار ملبے میں دبے پڑے تھے.. وہ درخواستیں تیار کر رہے تھے.. حکومت کے ایوانوں میں جو بُت تھے' ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے.. احتجاج کرنے کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے.. لیکن اس نے روشنی ہوتے ہی ملبے میں سے چند کتابیں نکالیں جو اوندھی پڑی تھیں وارڈروب ابھی سلامت تھی اس میں سے چند کپڑے کھینچ کر نکالے اور انہیں ایک بیگ میں ٹھونس کر اس کھنڈر میں سے نکل گیا.. برمانی اُسے یکدم چوٹی زیریں میں

اپنے کُنج میں اپنے سامنے پا کر حیران رہ گیا تھا" سائیں آپ کدھر؟"

"سندھ سائیں پر گھر بنانے آیا ہوں" اُس نے ہنس کر کہا تھا۔

فہیم اپنی نادانی میں یہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص کا ایک گھر ہوتا ہے جہاں اسے بالآخر لوٹنا ہوتا ہے.. اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کوئی ایک فرد ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے پاس لوٹنے کے لئے کوئی گھر نہیں ہوتا... البتہ لمحہ بہ لمحہ گھٹتی ہوئی حیات کے قبضے میں جتنے بھی روز و شب رہ گئے تھے' ان میں سلطانہ کی قربت ممکن تھی.. وہ گھر ہو سکتی تھی..

"تو کب لوٹنا ہے سائیں؟"

"آج کہیں رات کریں گے فہیم... تو کل سویرے ہم واپس ہو جائیں گے۔"

بہت دیر سے کوئی ڈولفن سینۂ آب پر نہیں ابھری تھی... وہ بقول سرور پانیوں کے اندر گھر بنائے کھڑی تھیں اور لوٹ چکی تھیں۔

نیم سیاہ رنگت میں سے تیز دانت مسکراہٹ اور سرخوشی میں لشکاتا فہیم آج پھر جھومر ڈال رہا تھا.. مرغابی کے پنجوں ایسی سیاہ ہتھیلیاں سرور کی تھیں جو پرات پر چپو چلاتی اس میں سے چھم چھم غنائیت ابھارتی تھیں جس پر فہیم کا لچکیلا بدن لہریں بناتا ریت پر ناچتا تھا اور وہ.. سرور منہ کھولے آج پھر ملاح کو پکارتا تھا..

ملاحا... حا... ہالی نہ بیڑی ٹور ساڈھے یار ونجناں...

ملا... حا... حا... ماماں جعفر دوری میں بُوٹی گھوٹتا ڈنڈے کی گولائی سے لپٹے گھنگھروؤں کو ملا.. حا... حا کی تال پر چھنکاتا اور سر جھٹکتا تھا..

سندھ کی آبی کائنات میں گھرا سرکنڈوں اور سروٹوں اور دب گھاس سے اٹا ایک گھنا ذخیرہ تھا جس کے اندر کہیں ایک ہموار ریتلا ٹکڑا تھا اس ذخیرے میں چھپا ہوا.. اور یہاں بیٹھے ہوئے شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان قد آدم سرکنڈوں کے پار چند فرلانگ کے فاصلے پر پانی شروع ہو جاتے ہیں.. دریا ہے.. اور ایک کشتی ہے جسے کنارے پر ٹھونکے گئے کھونٹوں سے آج اتنی مضبوطی سے باندھا گیا ہے جیسے گلیور کو بونوں نے رسیوں سے جکڑ لیا تھا۔ یہ اہتمام اس لئے کیا گیا تھا کہ اگر آج پھر پچھلی رات والا جھکڑ پھر سے حملہ آور ہو جائے تو کشتی اپنی جگہ پر قائم رہے اور کناروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر ہلکان نہ ہو..

کشتی آج پہلی بار سیاہ رات میں اکیلی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اسے تنہا چھوڑ کر اس کے مسافر کہاں چلے گئے ہیں کیونکہ وہاں سے نہ ذخیرے کے درمیان جھومر ڈالتا فہیم دکھائی دیتا تھا نہ سرور کی پرات کی دھمک یہاں تک آتی تھی اور نہ الاؤ کی روشنی کی کوئی خبر ملتی تھی..

فہیم سروٹوں کے جزیرے کے بیچ ایک اور جزیرے میں جھومر ڈالتا تھا اور الاؤ کی روشنی سے سرکنڈوں پر سائے وجود میں آتے تھے جو حرکت کرتے رقص کرتے تھے جیسے وہ سائے فہیم کے ساتھی ہوں اور پس منظر میں اس کی پیروی کر رہے ہوں.. اس کی سنگت میں ہوں۔ پچکی ہوئی دیگچیاں.. ایک ہانڈی.. کچھ برتن آگ کے کناروں پر رکھے ہوئے تھے تاکہ ان میں سنگھاڑا مچھلی کا جو سالن ہے.. بھنی ہوئی مرغی اور شدید میٹھا حلوہ اور پراٹھے ہیں' وہ ٹھنڈے نہ ہو جائیں کوئلوں کی قربت میں گرم رہیں.. کہ ابھی تو بُوٹی کا دور لگ رہا تھا' کھانے کی باری بعد میں آنی تھی..

اور انہیں کھانے سے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی..

بُوٹی ان کے اندر دُھنک مچا رہی تھی... اور وہ لاپرواہ ہو چکے تھے..

ریت پر رقص کرتا ایک اونٹ کی طرح پاؤں آگے پیچھے جماتا فہیم دونوں ہاتھ پھیلائے جھومر ڈالتا ہنستا ہوا پکھی کے پاس ہوتا گیا جو بظاہر ان سے لاتعلق بیٹھی تھی لیکن بوٹی کے چند گھونٹ جو اس کے حلق سے اترے تھے وہ اسے بھی ایک خاص لہک اور مستی سے دوچار کرتے تھے اور وہ کن اکھیوں سے بھی تکتی تھی۔ "پکھیے.. آجا.. آ.." فہیم نے جھک کر اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے۔

سرور نے پرات سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور خوش ہو گیا.. پوری بتیسی نکال کر پرات پر زور سے ہتھیلی مار کر تال دی اور پھر کسی دبلے سے بن مانس کی طرح چیخا "چل اوئے پکھیے..."

پکھی فہیم کے جکڑے ہوئے ہاتھوں سے بندھی اٹھ کھڑی ہوئی.. اور وہ ہنستی جاتی تھی.. اس ہنسی نے اس کا مہاندرہ بدل دیا اور وہ خاور سے پہچانی نہ گئی... وہ صرف اس ہنسی سے ایک مختلف عورت ہو گئی تھی.. فہیم نے اس کے بازوؤں کو اونچا کیا اور پھر انہیں چھوڑ کر اس کے گرد ناچنے لگا۔ سرور کی پرات کی تال سے پکھی کا بدن واقف تھا اس کی سُر میں تھا.. اس لئے وہ نہایت آسانی سے اس کے ہمراہ حرکت کرنے لگی..

ماماں جعفر بھی نہ رہ سکا اور "پکھی اوئے پکھی" کہہ کر بوٹی گھوٹنے والا ڈنڈا دونوں ہاتھوں میں تھام کر اٹھا اس کے گھنگھرو چھنکاتا فہیم کی طرح قدم آگے پیچھے رکھتا ان دونوں کے گرد چکر کاٹتا جھومر ڈالنے لگا..

رات کی اجاڑ اور بے آباد سیاہی میں الاؤ کی ٹہنیوں کے جلنے سے ان کے سلگنے' ٹوٹنے اور کوئلہ بن کر راکھ ہونے کی آوازیں اور سرسراہٹ جنم لیتی تھیں... جیسے کائنات کا سکوت ہولے ہولے ٹوٹتا ہو۔ اُس میں دراڑیں پڑتی ہوں.. اور ان تینوں کے پرچھائیاں الاؤ سے دور سرکنڈوں پر بے حساب ہوتی تھیں' لاتعداد متحرک ہجوم ہوتی تھیں جیسے وہاں ایک اور دنیا ہو.. ان کے بجتے ہوئے جتنے جنم تھے ان کے سائے رقص کرتے ہوں.. ہزاروں برسوں کی تنہائی اور گمشدگی سے تنگ آئے ہوئے جنم آج کی شب ظاہر ہوگئے ہوں.. لیکن ان کے قریب نہ آتے ہوں ذرا فاصلے پر رہتے سرونوں پر حرکت کرتے سائے ڈالتے جھومر ناچتے ہوں..

اُن کی سرخوشی اور بے حجاب مسرت کا سبب صرف بُوٹی کے گھونٹ نہ تھے... وہ کل سویرے اس بے جواز مسافت کو ترک کر کے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے.. غازی گھاٹ کے ساحل کو واپس جا رہے تھے.. فہیم اپنے نور پور جا رہا تھا.. پچھلی چند راتوں میں ان کے جو پڑاؤ تھے ان کے جو ڈیرے تھے ان میں پہلے پہل کی رونقیں نہیں تھیں' خاموشی اور ٹھہری ہوئی اداسی اتر چکی تھی.. وہ صاحب کے لئے اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے.. اس کی چاکری کرتے تھے.. کشتی کھیتے تھے' کھانا بنا کر خیمے لگاتے تھے اور ایک وہم کے ساتھ سو جاتے تھے.. انہیں وہم تھا کہ یہ سائیں کوئی بلا ہے.. بھوت پریت کا سنگی ساتھی ہے جو ہمیں اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا جانے کہاں لے جا رہا ہے.. جانے ہم لوٹتے بھی ہیں یا نہیں... نہ یہ پرندوں کا شکاری ہے.. نہ دارو کا شوقین ہے اور نہ اس نے پکھی پر نظر کی ہے.. چنانچہ یہ صرف ساوی کے گھونٹ نہ تھے... وہ اپنی رہائی پر خوش تھے..

وہ آج تک کناروں پر ہی قیام کرتے تھے... جس ٹاپو پر رات بسر کرنے کا فیصلہ ہوتا اس کے کنارے کشتی باندھتے اور اسی کے قریب چولہے جلاتے.. خیمے نصب کرتے اور الاؤ روشن کرتے لیکن آج وہ کشتی کو چھوڑ کر ادھر گھنے ذخیرے کے اندر رات کرنے کے لئے آگئے تھے..

"سائیں کناروں پر تو ہمیشہ منظر کشی کرتے ہیں..." فہیم نے اس سے اجازت مانگی تھی۔ "آج آخری بار الاؤ جلائیں گے تو ذرا ادھر سرونوں کے اندر چل کر رات کرتے ہیں' منظر کشی ادھر کرتے ہیں... ہوا بھی کم ہوگی اور منظر بھی عجب ہوگا..."

انہیں رہائی کی نوید مل چکی تھی اس لئے وہ مسرت سے لبریز ہو رہے تھے..

خاور کے آئندہ دنوں میں ایک کھنڈر تھا اور واپسی کا خوف ایک تینددوے کی طرح اس کی ایک ایک رگ سے لپٹ کر اس کا سانس روکتا تھا.. اُس نے کہاں واپس جانا تھا۔

کراچی سے واپسی پر وہ بہت دن ایک بے یقین کیفیت میں بے حس رہا... جیسے مصنوعی ٹانگوں والا ایک شخص اپنے نچلے دھڑ میں کچھ بھی محسوس نہیں کرتا..

یہ محبت میں ہزیمت نہیں تھی.. یہ نہیں کہ وہ عابدہ سومرو کے عشق کے زیرِ آب جال میں ایک اندھی ڈولفن کی طرح پھنس گیا تھا.. وہ تو اس کی موت کے خدشے کے چنگل میں الجھ کر اس کے قریب ہوا تھا.. وہ اس کے لئے رویا تھا... اس کی خرخراتی آواز اور قربت مرگ اس کے دل میں چھید ڈالتی تھی.. کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکا سورج کا سُرخ وجود ان دونوں کو جنس اور محبت کے ملاپ میں یک جان ہوتے نہیں بلکہ متوقع موت کی آخری رسوم میں الجھے ہوئے دیکھتا تھا.. اور پھر یکدم شہلا آفریدی نے اسے برہنہ کر دیا.. اس کے پاس سوائے شرمندگی کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا.. ایک عارضی پڑاؤ پر ایک شب گزار کر وہ آگے چلی گئی تھی...

بہت دنوں سے غلافی آنکھوں کا فون بھی نہیں آیا تھا... لاہور سے کراچی تک کے سفر میں جہاز میں جو وقوعہ ہوا تھا اس کے بعد وہ احتیاط کرنے لگا تھا.. اس کے فون کا جواب نہ دیتا تھا.. وہ "ہیلو" کہنے کے بعد منتیں کرنے لگتی تھی کہ اب ایسا نہیں ہوگا لیکن اس کا کچھ اعتبار نہ تھا.. وہ خود اپنے آپ کو پاگل خانہ کہتی تھی تو ایک پاگل خانہ کا کیا اعتبار اور پھر وہ پسیج گیا تھا.. باقاعدگی سے تو نہیں کبھی کبھار اس سے مل لیتا تھا لیکن.. اب بہت دنوں سے اُس کا فون نہیں آیا تھا.. اور اب اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا فون آجائے اور وہ اپنے زیرو پوائنٹ پر کھڑے ہو کر... چکن ٹومیٹو سینڈوچ چباتے ہوئے.. بارہ کہو کے دیہات میں اولین بلب روشن ہوتے ہوئے.. دیکھتے.. مخروط دم والے کرلے کو رینگتے.. دیکھتے.. اسے عابدہ سومرو کی اصلیت کے بارے میں بتائے.. اسے اپنی شرمندگی میں حصہ دار بنائے..

خاور اس کے ردعمل کو جانتا تھا.. وہ جانتا تھا کہ اس نے عابدہ کے نفسیاتی بہاؤ اور اس سے لاتعلق موت کی قربت.. عدم اور نیستی کی داستانوں کے بے بنیاد ہونے پر نہایت

خوش ہوتا تھا.. اپنی غلافی آنکھوں کو جھپکتے ہوئے مسلسل روتا تھا اور خوش ہوتا تھا.. اور اس کے باوجود وہ اسے اپنی شرمندگی کا حصہ دار بنانا چاہتا تھا..

ٹیلی فون نمبر اس کے پاس موجود تھا کیونکہ ایک روز جانے کس کیفیت میں اُس نے کہا تھا کہ.. تمہارے پاس میرا نمبر تو ہونا چاہئے.. لیکن آج تک وہ اس کی انگلیوں سے ڈائل نہیں ہوا تھا اس لئے کہ وہ اس کی پرائیویسی کا احترام کرتا تھا.. یہ طے تھا کہ صرف وہی اسے ٹیلی فون کرے گی..

لیکن بہت دنوں سے.. اتنے دن کبھی نہیں گزرے تھے.. اس کا فون نہیں آیا تھا۔

بل ڈوزر کے بلیڈ کی آمد سے پہلے جب اس کے آس پاس دیواریں تھیں اور سر پر چھت تھی اور ایک گھر تھا.. خاور نے آخری فون اُسے کیا تھا..

"جی ہیلو.." کسی مرد کی روکھی اور بے روح آواز تھی۔

وہ جھجک گیا.. جواب میں کیا کہے... کہتے کہتے رک گیا اور فون بند کر دیا.. وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا تو وہ کیا کہے کہ کس سے بات کرنی ہے..

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر ڈائل کیا..

"جی ہیلو.."

"آپ.. کون بول رہے ہیں؟"

"آپ نے کس سے بات کرنی ہے.." لہجے میں تھکاوٹ اور بیزاری تھی.. شاید اس کا بیٹا تھا..

"آپ کی والدہ اگر گھر پر ہیں تو..."

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"جی میرا نام خاور ہے اور... میں ان کو جانتا ہوں.. آپ.. آپ ان کے بیٹے بول رہے ہیں؟"

"جی..." لہجے میں شناسائی آگئی۔ "جی.. میں آپ کو جانتا ہوں سر.. آپ سے مل چکا ہوں ایئرپورٹ پر.. جب اماں کراچی جا رہی تھیں اور میں نے آپ سے ریکوئسٹ کی تھی کہ آپ ان کے برابر میں بیٹھ جائیں.. میں سر آپ کو جانتا ہوں.."

"تھینک یو.. تو ان سے بات ہو سکتی ہے؟"

"وہ.. اماں تو.. پچھلے ہفتے ان کا انتقال ہو گیا ہے.."

"جی..."

اس فون پر اس تک آنے والی آواز مخدوش لگتی تھی.. یہ غلط نمبر تھا..

"آپ نہیں جانتے؟"

"نہیں..."

"یہ سب کچھ اچانک تھا.. وہ اکثر آپ کا تذکرہ کرتی تھیں ایک فلکسیشن تھی آپ کے لئے.. اور ابا بہت خوش ہوتے تھے انہیں چھیڑتے تھے اور وہ سرخ ہو جاتی تھیں.. جی سر... آپ نہیں جانتے مگر شی واز اے گریٹ فین آف یورس.. ان کا دسواں ہے پرسوں.. آپ اگر آ سکتے ہیں تو... شی ول بی ویری ہیپی.."

اس کا ذہن منجمد ہو گیا.. جیسے ہزاروں برسوں کی برف انٹارکٹک میں بے حس اور سرد ہوتی ہے اور اس کے نیچے کئی کلومیٹر کی گہرائی میں کوئی ایک جھیل پوشیدہ ہوتی ہے جو اپنے بھید عیاں نہیں کر سکتی.. "آئی ایم سوری بیٹے... یہ کیسے ہوا؟"

"ہمیں ان سے بہت شکایت ہے..." نوجوان جسے اپنے حواس اور آواز پر ابھی تک مکمل اختیار تھا' ہچکیاں لینے لگا۔ "انہیں معلوم تھا لیکن انہوں نے ہمیں بتایا نہیں.. چھپائے رکھا.. ایک پیچیدہ قسم کا کینسر تھا اور اس کی تشخیص ہونے پر انہوں نے ہمیں بتایا نہیں... وہ... ہمیشہ اپنے ہینڈ بیگ میں سے گولیاں اور کیپسول نکال کر پھانکتی رہتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ وٹامن ہیں... اور پھر... دو تین روز کے اندر اندر.. آپ کسی وقت ہمارے ہاں آئیں انکل.. اماں کی وجہ سے ہم بھی آپ کو اپنا اپنا سا محسوس کرتے ہیں.. ابھی لوگ آ رہے ہیں.."

نہ اسے کبھی اس کے وجود کا یقین آیا تھا اور نہ ہی اب اس کے عدمِ وجود سے مفاہمت ہو رہی تھی.. یہ دونوں وہم کے پرندے تھے جو اس کی ذات کے گھونسلے میں اترے تھے..

اس کے ہونے کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا...

اسے بارہ کہو کی پہاڑیوں میں جا کر اس بڑے پتھر کی کوکھ میں جھانکنا چاہئے.. یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا وہاں واقعی خورد و نوش کی کچھ چیزیں ہیں جو شاید وہ آخری بار وہاں رکھ کر

گئی ہو... اپنے ہونے کے نشان کے طور پر...

بس یہی توجیہہ تھی اس کے مختلف اجزاء سے بنے ہوئے کردار کی.. اس کی شخصیت کے الجھاؤ کی.. تشخیص کے بعد ہی اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ وہ اس مہلت کے اندر اندر جو اسے ملی تھی' وہ کچھ کر گزرے جو اس کا جی چاہتا تھا..

تبھی وہ روتی بہت تھی..

اپنی موت کے لئے خود ہی پیشگی روتی رہتی تھی..

غلافی آنکھوں میں اسی لئے آنسو بہت تھے..

موت کے ڈرامے میں نیلے دھبوں کے بدن کے ساتھ وہ... عابدہ سومرو اداکاری کرتی تھی.. اگرچہ ان لمحوں میں جب وہ سٹیج پر ہوتی تھی' اپنے کردار میں ڈوب کر حقیقت ہو جاتی تھی.. اور وہ جسے مرگ کی سٹیج پر دھکیل دیا گیا تھا' ظاہر نہ کرتی تھی.. صرف آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ ایک بڑی اداکارہ ہے.. اسے بہترین اداکاری کا کوئی بھی ایوارڈ نہیں مل سکتا تھا..

وہ اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا..

لاسٹ ٹینگو ان پیرس کی طرح... میں تو اس شخص کا نام بھی نہیں کا نتی...

کل کلاں کسی بھی قبرستان میں کسی کتبے کو پڑھ کر وہ یہی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ.. یہاں دفن ہے...

ملاحا... حا...

ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساڈھے یار دو نجناں

پکھی کا دراوڑی بدن... رات کے سیاہ اکلاپے میں.. کہ الاؤ کی طرف کسی نے دھیان نہیں کیا تھا اور وہ راکھ میں بدل چکا تھا.. تو پکھی کا دراوڑی بدن گھنے سروٹوں پر اپنے سائے بھیجتا تھا' اپنے پچھلے جنم کو لوٹتا تھا' بے خود' بے راہرو اور آزاد ہوتا تھا۔ اس کے کولہوں پر ابھی تک ریت کے ذرے چپٹے ہوئے تھے... اور اس کی چھاتیوں میں موہنجو ڈارو کے پریسٹ کنگ کا تختہ الٹ دینے کی صلاحیت تھی...

فہیم بازو بلند کئے... سرور کی پرات کی تال پر حرکت کرتا ہوا... ماماں جعفر جھکا ہوا

بوٹی کی مُشک میں رچا ہوا اور ان دونوں کے درمیان پکھی اپنے پچھلے جنم میں رات کی سیاہی کو اپنی سیاہ تر آنکھوں سے چیرتی.. ان دونوں کی موجودگی سے لاپرواہ اپنے آپ میں گم ناچتی تھی۔

الاؤ کے گرد جو ہانڈیاں اور برتن خوراک کے دھرے تھے.. اس آس میں پڑے تھے کہ گرم رہیں گے وہ اب ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان پر راکھ کی تہہ جمتی جاتی تھی۔

خاور کو بھی بھوک نہ تھی..

اگرچہ اس نے فہیم سے خصوصی فرمائش کر کے سنگھاڑا مچھلی کا سالن بنوایا تھا حلوے کی خواہش کی تھی لیکن اس کی اشتہا ختم ہو چکی تھی..

وہ تینوں اس کے وجود سے بھی غافل ہو چکے تھے.. وہ ان کے لئے فالتو ہو چکا تھا کیونکہ کوچ کا نقارہ بج چکا تھا وہ اگلی صبح گھروں کو لوٹ رہے تھے اس لئے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی..

ریت کی گرفت میں سے خاور نے اپنے آپ کو ذرا زور لگا کر اٹھایا.. کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا.. یہی وہ لمحے تھے اس بیابان میں.. اس سروٹوں سے گھرے جزیرے میں جو ان تینوں کو اس سے ممتاز کرتے تھے.. وہ برتر ہوتے تھے اور وہ حقیر ہوتا تھا کہ وہ اپنے تہذیبی پس منظر میں اسیر ان کی روح میں شامل نہیں ہو سکتا تھا اور وہ تینوں قیود میں نہ تھے آزاد تھے..

خاور نے ابھی تک پکھی کے کولہوں سے چمٹی ریت کو دیکھا اور پھر اپنی پشت کو جھاڑ کر ان سے پرے ہو کر سروٹوں اور سرکنڈوں کی جانب چلنے لگا..

انہوں نے ذرا دم لے کر اس سے نہیں پوچھا کہ سائیں کدھر جاتے ہو.. کہ وہ اس سے غافل ہو چکے تھے.. ہاں پکھی کے کولہوں نے اور چھاتیوں نے اس پر ایک نظر کی اور پھر سے اپنے پچھلے جنم میں چلے گئے..

سروٹوں پر ان تینوں کے سایوں کا کھیل حرکت کرتا تھا..

وہ ان کی پرچھائیوں سے ان تینوں کو الگ الگ پہچان سکتا تھا..

جو سایہ سرکنڈوں سے بھی اوپر نکلتا تھا وہ فہیم تھا.. جھکا ہوا.. کچھ تلاش کرتا سایہ جعفر کا تھا اور ان کے بیچ پکھی کی پرچھائیاں سرور کی تال کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں..

پرچھائیوں کے اس کھیل کے اندر خاور نے قدم رکھا تو سروٹ شروع ہو گئے..

ان کی شاخیں تیکھی اور تیز دھار کی تھیں.. وہ اندھیرے میں ان میں راہ بناتا' اپنے ہاتھ پھیلائے ان میں سے راہ بناتا آگے ہوتا تھا تو اس کے گالوں اور ہاتھوں پر اُن کی دھاریں وار کرتی تھیں اور خراشوں میں سے خون پھوٹتا تھا..

سروٹوں سے نکل کر ریتلے کنارے کم اندھیرے میں تھے اور کشتی نظر آ رہی تھی متعدد کھونٹوں سے بندھی رسّوں میں جکڑی کشتی اتنی مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی کہ پانیوں میں کسمسا بھی نہیں سکتی تھی.. نہ یہاں سرور کی پرات کی تھاپ سنائی دیتی تھی اور نہ یہ شک ہوتا تھا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ذخیرے کے اندر تین وجود جھومر ڈال رہے ہیں کیونکہ انہیں رہائی کی خبر مل چکی ہے.. کشتی سے ذرا فاصلے پر ریت کا ایک ابھار تھا..

رات میں وہ پوری طرح عیاں تو نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا ابھار ایک گمان کی صورت میں اس کا پتا دیتا تھا اور جب وہ کنارے کی ریت پر چلتا ہوا اس تک پہنچا تھا تو قدم بتاتے تھے کہ اب وہ اوپر اٹھ رہے ہیں..

آلتی پالتی مارے ہوئے وہاں بیٹھا بہت دیر تک وہ ایک تاریک خلا میں رہا.. ایک ریت پر رہ جانے والے ڈولفن کی مانند نابینا رہا.. اور یہاں سے.. اگر ایک شخص بہت دیر تک آنکھیں جھپکاتا رہے تو اسے احساس ہوتا تھا کہ کشتی کے پہلو میں سے نکلتی ایک سیاہ چادر ہے جو دھیرے دھیرے کروٹیں بدلتی ہے.. ہولے ہولے بہتی ہے..

سندھ ساگر اس کے لئے.. ایک عارضی پڑاؤ تھا جہاں سے اس نے کل سویرے کوچ کر جانا تھا.. لیکن کہاں جانا تھا.. اس کے بارے میں مکمل نابینائی تھی.. عابدہ سومرو جانتی تھی کہ ایک عارضی پڑاؤ کے بعد کہاں جاتے ہیں.. غلافی آنکھوں کو بھی خبر مل چکی تھی کہ اس نے کہاں جانا ہے.. ان دونوں نے اسے ایک عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال کیا تھا اور چلی گئی تھیں.. سلطانہ اگرچہ تھی لیکن وہ اسے ناظم الدین روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھا چلے جانے کی خواہش کا اظہار کرنے کے باوجود سب کچھ فراموش کر کے لاتعلق ہو سکتی تھی.. سری لنکا سے واپسی پر ایئرپورٹ پر اسے پہچانے بغیر آگے جا سکتی تھی.. جیسے لاتعلقی سے ایک عارضی پڑاؤ کو چھوڑ کر آگے جایا جاتا ہے...

ہوا پہلو بدلتی ہوئی آئی تو سروٹوں کی جانب سے سرور کی پرات کی تال لمحے بھر

کے لئے تیرتی ہوئی اس کی قربت میں آنکلی اور پھر سناٹے نے اسے نگل کر اجل میں دھکیل دیا...

کل سویرے اُسے کہاں واپس جانا تھا؟..

آنکھیں جھپکاتا خاور سامنے دیکھتا رہا.. ریت ٹھنڈی ہو رہی تھی..

سائیں سندھ اندھیرے کی اجرک میں لپٹا کروٹیں لے رہا تھا..

اور وہاں روشنی تھی..

کائنات کے آغاز میں یہی کروٹیں بدلتے اندھیرے تھے اور ان پر پانیوں کی روح تیرتی تھی جب اذن ہوا کہ روشنی ہو جا.. اور وہاں روشنی تھی..

وہی چادر جو ابھی تاریکیوں میں پوشیدہ تھی ابھی اس پر روشنی بچھنے لگی.. وہ جگمگانے لگی.. اس پر ستارے اترنے لگے.. دائیں جانب سے انڈس کوئین ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح.. جو ہر شب ایک خاص وقت پر سٹیج پر داخل ہوتی ہے.. وہ نمودار ہو رہی تھی۔

عرشے پر رسّوں سے بندھے بلب جھولتے تھے..

اس پر ایک دنیا آباد تھی..

مسافر خوش گپیوں میں مصروف تھے..

ان کے چہرے اور ان کے لبادے پہچانے نہ جاتے تھے کہ وہ گئے وقتوں کے تھے۔

راج کے رکھوالے سفید فام... گورا لوگ اور ان کے غلاموں کی آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی شاہانہ وردیاں.. پر پیچ موم سے اکڑی مونچھیں جو ہر صاحب یا میم صاحب کو دیکھتے ہی پگھل کر ڈھیلی ہوتی گر جاتی تھیں اور وہ انہی کے تناسب سے صاحب بہادر کے سامنے گرتے اور جھکتے چلے جاتے تھے..

کوئی سولا ہیٹ اور خاکی وردی میں ملبوس بظاہر آوارہ گرد سیاح جو بلوچ وحشیوں کی سرزمین کو پہلی بار دریافت کرنے کے لئے آیا تھا اور اپنے سفر کے نقشے اس اہتمام سے بناتا تھا کہ برطانوی راج کو بہ وقت ضرورت تہذیب پھیلانے کے لئے مددگار ثابت ہوں.. اور سرکشی اختیار کرنے والے بلوچوں کو مطیع کرنا آسان ہو..

ایک سفید روسی پوڈل.. کیوٹ اینڈ کڈلی... حیران اور پریشان.. اپنی سفید فام مالکن سے بچھڑا ہوا.. ہجوم سے ہراساں.. عرشے کے ایک کھمبے کے قریب ہو کر ٹانگ اٹھائے اپنے آپ کو ہلکا کرنے میں مصروف.. اور متعدد معززین اسے دیکھ کر لاڈ سے مسکراتے ہوئے اپنی اچکنوں کی بالائی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اور ان میں سجے ریشمی رومالوں کو کھینچ نکالنے کی آرزو میں.. تاکہ خوشنودی کے لئے ان سے عرشے کو پونچھا جا سکے..

لیکن ان سب سے الگ تھلگ..

عرشے کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ جمائے.. اپنے سامنے تاریکی میں گھورتی.. اس ٹیلے کی جانب بے نور آنکھوں سے تکتی.. کچھ شکلیں تھیں..

وہ ہر لحہ بدلتی تھیں.. تغیر سے دوچار ہوتی تھیں.. کبھی وہ عابدہ سومرو تھی جو اسے پہچانتی نہ تھی.. اور کبھی غلافی آنکھیں تھیں جو خاک ہوتی تھیں..

انڈس کوئین.. اس کے سامنے ایک رواں منظر کی طرح... سندھ سائیں کے تاریک سینے پر روشنیاں بکھیرتی 'تیرتی' گزرتی جاتی تھی.. اور پھر اس گزرن میں کوئی ایک لحہ ایسے رکا کہ وہ ٹھہر گئی.. وہیں ایک ہی مقام پر ساکت اور سناٹے میں آ کر جہاں تھی وہیں ٹھہر گئی...

اس کے عرشے پر جو رونق تھی وہ اس کے ٹھہرنے سے ماند نہ ہوئی.. جاری رہی.. کسی کو بھی احساس نہ ہوا کہ وہ سکوت میں چلی گئی ہے.. روانی تھم گئی ہے۔

جیسے اس نے اپنے بھاری لنگر گرا دیے ہوں..

خاور کے سامنے سندھ کی سیاہی میں اس کی روشنیاں ایک ہی مقام پر جگمگاتی رہیں.. رونق میں فرق نہ آیا..

خاور تادیر اس کی پھر سے روانی کا منتظر رہا.. ایک سٹل لائف پینٹنگ کی مانند اسے دیکھتا رہا جس میں جان نہیں ہوتی..

ذخیرے کے اندر پنچھی اپنے پچھلے جنم کو لوٹ کر سروٹوں پر پرچھائیں ہوتی تھی..

وہ صدیوں سے اس ٹیلے پر براجمان اسے دیکھتا رہا اور انڈس کوئین وہیں کھڑی رہی..

اور پھر بغیر کسی اطلاع کے... کسی تشخیص کے بغیر اس کا رکا ہوا وجود نہایت دھیرج سے پانیوں

میں ڈوبنے لگا.. بے جواز... بغیر کسی وجہ کے... کسی برفانی تودے سے ٹکرانے کے بغیر.. وہ آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا.. ڈوبنے لگا..

لیکن عرشے پر کھڑے اور ٹہلتے ہوئے لوگوں کے چہروں پر کوئی تبدیلی ظہور پذیر نہ ہوئی.. وہ جیسے آگاہ ہی نہیں تھے کہ انڈس کوئین اتنی دیر تک اگر ایک ہی مقام پر رکی رہی ہے تو کیوں.. اور اگر اب آہستگی سے ایک بھاری پتھر کی طرح نیچے جا رہی ہے تو کیوں... وہ مشغول تھے اور آگاہ ہی نہیں تھے..

وہ سب اسی طور اپنی اپنی حالتوں اور کیفیتوں میں برقرار رہے اور انڈس کوئین کے عرشے تک پانی آ گئے.. اوپر ہوتے گئے.. ان کے لمبے کوٹ پانی کے ابھرنے سے اٹھتے.. ان کی نیک ٹائز تک پانی آتا تو وہ سطح آب پر چیتھڑوں کی طرح تیرنے لگتیں...

بڑے گھیرے والی بلوچ شلواریں پانی سے بھر کر پھولنے لگیں.. سرداروں کی مونچھوں کے بل کھلنے لگے.. بھاری پگڑیوں پر پانی کی روانی غالب آنے لگی لیکن اس کے باوجود انہیں احساس نہ ہوا کہ ہم ڈوب رہے ہیں..

سفید روسی پوڈل کب کا غائب ہو چکا تھا اس لئے کہ عرشے پر سندھ سائیں کی چادر بہنے لگی تھی..

یہاں تک کہ کموڈ پر اطمینان سے براجمان پھولدار بڑے ہیٹ اور گھٹنوں تک آتے پولکا ڈوٹ ڈریس میں ملبوس معزز لیڈی صاحبہ کو بھی فراغت کے ان لمحوں میں کچھ علم نہ ہوا کہ پانی ایک بے نام آہستگی سے کموڈ کو ڈبو کر اس کے چینی پر لز کے ہار تک پہنچ چکے ہیں۔

وہ اسی اطمینان سے بیٹھی رہی جیسے ایک تصویر اتروا تی ہو..

وہ سب... جو انڈس کوئین کے مسافر تھے.. پانی پر اٹھتے ایک بلبلے ایسی بے آواز کیفیت میں انڈس کوئین کے ساتھ نیچے ہوتے گئے..

سندھ کے تاریک پانیوں کے اوپر انڈس کوئین کی تدفین کا آخری نشان وہ بھونپو تھا جو ایک کھوکھلے ستون کی مانند سطح آب میں سے نکلا ہوا دکھائی دیا.. کچھ دیر اس کی آنکھوں کے سامنے رہا اور پھر وہ بھی پانیوں میں چلا گیا..

سندھ سائیں کی چادر پھر سے اپنی آبائی تاریکی میں چلی گئی..

وہ جس مقام پر رکی تھی.. انڈس کوئین جہاں پانیوں میں آہستگی سے تحلیل ہوئی

تھی.. وہاں اس کے وجود کے کوئی آثار باقی نہ تھے.. جیسے ایک ڈولفن.. دھیرے سے نیچے چلی گئی ہو.. نہ سطح آب پر کوئی تلاطم ہو.. نہ بلبلے ابھرتے ہوں... پانیوں کی وہی تاریک ہموار گی اور روانی ہو جو اس کے منظر میں جگمگاتے ہوئے داخل ہونے سے پہلے تھی..

اور اس لمحے... گھنی گھاس اور سرکنڈوں کے ذخیرے کے اندر سے.. جہاں فہیم جھومر ڈالتا تھا.. پکھی کا ورا وڑی بدن سروٹوں پر اپنی پر چھائیاں ڈالتا پچھلے جنموں کو لوٹتا تھا اور ماماں جعفر کے اندر بوئی مشک مچاتی تھی وہاں.. ایک مور بولا... میں آؤں... میں آؤں...

''موت... مجھے تمہارے قریب لے آئی ہے.. ڈیتھ!''

کسی بھی موت کا ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے.. عمر رسیدہ... کچی... ناگہانی... حادثاتی... بے وجہ... کسی بھی موت کا.. زمین کی پہلی موت پر جب کوے اترے تھے چونچ سے مٹی کھود کر تدفین کی بجھارت سلجھاتے تھے.. تب سے اب تک لحہ موجود کی آخری موت تک... وہی ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے..

بُو ہوتی ہے...

اور بُو کے سوا بین ہوتے ہیں...

اور بُو بتاتی ہے کہ چارپائی پر سفید چادر کے نیچے جو شخص ہے اس نے آخری ہچکی کب لی تھی.. اور اس کے تلووں سے فنا کی جو ٹھنڈک شروع ہوئی تھی وہ اس کے بدن کو مردہ کرتی کب اس کی آنکھوں تک پہنچی تھی اور انہیں بے جان ڈھلکا ہوا شیشہ کر دیا تھا..

عمر رسیدہ موت متوقع ہوتی ہے اور اس کا رد عمل میکانکی ہوتا ہے..

کچی موت میں ہمدردی بہت ہوتی ہے اس تشکر کے ساتھ کہ وہ ان کے گھر نہیں آگئی..

یقین سے ماورا ہو جانے والی موت حادثاتی ہوتی ہے..

اور بے وجہ موت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی..

لیکن ہر مقام پر چار دیواری کے اندر اس کی بُو ضرور موجود ہوتی ہے..

وہ شخص جو سفید چادر تلے عامل معمول ایسے کھیل کی طرح لیٹا ہوتا ہے وہ دم بخود ہوتا ہے اور یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے یا نہیں.. صرف بُو بتاتی ہے۔

اس چادر کا ایک کونہ اٹھا کر اسے دیکھا جائے تو اس کا چہرہ زرد پھسکڑی ہوگا.. اور اس پر ایک عجیب حماقت آمیز تاثر ہوگا' منہ کھلا ہوا.. رگیں ڈھیلی اور ٹھنڈی ہو چکی ہوئیں

اور کھلے منہ کے اندر تالو اور مسوڑھے زردی کی کھنڈت میں..

صرف دو مواقع پر انسان اپنے اختیار سے باہر ہو کر بے بس ہو جاتا ہے اور حماقت کے قریب چلا جاتا ہے.. ایک نسل بڑھانے کے آخری لمحوں میں یا پھر موت کے بعد..

موت بھی چونکہ اختیار سے باہر ہوتی ہے اس لئے اس میں بے اختیاری ہوتی ہے..

اگر یہ کھلی فضاؤں میں آئے.. کسی برفانی دراڑ میں گر کر.. مرنے کے بعد رسوائی کے ڈر سے غرق دریا ہو کر آئے.. صحرا میں پیاس سے بدن خشک ہو جائے.. یا پھر پانیوں کی چادر میں ڈولتی ایک کشتی کے اندر آ جائے تو بھی وہاں بُو ہوتی ہے.. لیکن وہاں اس کا شک نہیں ہوتا.. کہ یہ اکیلی نہیں ہوتی. یہ پانیوں کے دھیرے دھیرے خشک ہونے کی.. بستیوں کے برباد ہونے کی.. ان پرندوں کی جو شکاریوں کے چھروں سے زخمی ہو کر پانیوں اور ٹاپوؤں پر گر کر پھڑپھڑاتے رہے اور پھر جان ہار گئے ان کے مردہ پروں اور سڑتے گوشت کی.. مردہ مچھلیوں اور ٹھہرے ہوئے پانیوں کی بُو بھی ہو سکتی ہے.. اسی لئے صرف مرگ کی مہک ان سے الگ پہچانی نہیں جا سکتی.. اگرچہ وہ وہاں ہوتی ہے..

فہیم سروٹوں 'سرکنڈوں' کاہاں 'سر 'کوندرے' لائی اور لہنا کے بُوٹوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا... اور سروٹوں پر اب پچھلے جنم کے سائے جھومر نہ ڈالتے تھے.. اب وہاں سویر کی دھند میں گھلی ہلکی دھوپ تھی... وہ ملاحا... حا... ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساڑھے یار ونجھاں... گنگناتا.. آخری ناشتے ' آخری پراٹھے اور غروب کی زردی والے دیسی انڈوں کی زردی سنبھالتا اترتا ہے.. سروٹوں کے گھنے وجود میں سے نکل کر ریتلے کنارے پر اترتا ہے.. اور ریت پر اوس کی ٹھنڈک اور جماؤ ہے جس پر پاؤں رکھتا وہ سندھ سائیں کے پانیوں میں ٹھہرتی کشتی کی جانب چلتا جاتا ہے.. اور اپنے گھر واپسی کی مسرت میں دمکتا گنگناتا آتا ہے اور آج پانی کی قید کا آخری دن تھا.. آخری ناشتہ تھا..

صاحب رات کشتی میں ہی رہ گیا تھا..

ان سے جدا ہو کر ادھر آیا تھا اور ادھر ہی رہ گیا تھا..

سویرے ناشتے کے لئے وہ سروٹوں کے ذخیرے کے درمیان پوشیدہ اس آخری پڑاؤ میں واپس نہیں آیا تھا جہاں پچھلے شب آگ کی سرخ توانائی کی بھڑکتی لپکتی اور پھر ٹھنڈی ہوتی

زبانوں کے گرد وہ تینوں جھومر ڈالتے تھے.. اسی لئے وہ صاحب کا ناشتہ لے کر ادھر آ رہا تھا..

ابھی ہلکی دھند تھی جو سندھ کے پانیوں پر تیرتی تھی..

جیسے تخلیق کے پہلے دن تیرتی تھی.. لیکن ابھی یہ حکم نہیں اترا تھا کہ روشنی ہو جا.. صرف طلوع کا مٹیالا سونا تھا جو سندھ سائیں کی آبی چادر پر بچھا ہوا دکھائی دیتا تھا جس کے کنارے وہ کشتی فہیم کے آخری ناشتے کے قریب آتی جاتی تھی جس کے اندر صاحب ابھی تک سوتا تھا..

کشتی کے تختوں پر جو گل بوٹے نقش تھے وہ بھی ہلکی دھند میں دھندلاتے تھے پر آہستہ آہستہ قربت میں آنے پر دکھائی دیتے جاتے تھے..

فہیم نے چھابے میں دھرے پراٹھے کو اپنی پوروں سے چھوا.. ابھی تک گرم تھا.. انڈے کی زردی میں بھی ایک نامعلوم سی حدت قائم تھی اور پھر اس نے اپنا گنگنانا موقوف کر کے کشتی کے اندر جھانکا..

"ناشتہ کریں گے سائیں.."

سائیں.. اپنے سلیپنگ بیگ میں منہ کھولے... بے سدھ پڑا تھا..

سندھ ساگر کی اس سویر میں... انڈس کوئین کو غازی گھاٹ کے پانیوں سے دور ہوئے... بیکار زنگ آلود جنگ میں بدلے.. کھیتوں کی سبز روئیدگی میں خشک اور بے بس پڑے.. زنگ کے ذروں میں روپوش ہوئے.. سٹیرنگ وہیل کے نیچے گنے کے پھوک... ایک مردہ لائف جیکٹ... عرشے پر برہنہ حالت میں ایک کموڈ... صوفوں میں سے نکلتے بگولا سپرنگ... دھجیوں میں بکھرا بے رنگ قالین.. شکستہ اور کھنڈر ہوئے انڈس کوئین کو جب مدتیں گزر چکی تھیں اور وہ کسی دیوانے کے خواب میں ہی دوبارہ سندھ کے پانیوں پر رواں ہو سکتی تھی... وہی خواب جس میں پوا جی کا لکڑی کا جہاز اترتا تھا اور ان کی سفید لٹیں ایک عیبئے کی مانند ان کے ریشمی کندھوں پر لہراتی تھیں..

جب ایک سرخاب کے پر پاؤں کی دھمک سے فضا میں بلند ہوتے تھے اور ہر پر ایک سرخاب میں بدلتا تھا..

اپنی پیاری جان کے بچاؤ کے لئے جب ایک جل مرغی پانی میں بار بار ڈبکی لگاتی تھی اور اجل کی ڈور اس کے پنجے سے بندھی اسے کھینچتی تھی کہ اس ڈور کے آخری سرے پر

شاہ حسین نہ تھا جو لُک چھپ لُک چھپ ڈور کھینچتا تھا بلکہ موٹا بدھا عطا اللہ اپنے تہبند کو سنبھالتا اسے بھونے کو کھینچتا تھا..

ہنسوں کی چراگاہ کے آسمان پر ان کی ڈاروں کو پلٹتے.. شور مچاتے..

سندھ کے کناروں پر پانی پینے کے لئے آنے والے مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی سمفنی بلند ہو کر اسے ایک آبی مندر میں بدلتے.. ٹن ٹن ٹن

اور اندھی ڈولفنوں کی پشتوں پر ہومر کی سویروں کی حنائی انگلیوں کے اترنے کے بعد... مدتیں بیت چکی تھیں.. ایک زمانہ گزر چکا تھا جب فہیم نے کشتی میں جھانک کر کہا تھا۔

"ناشتہ کریں گے سائیں"

سائیں جاگتا نہ تھا.. اور فہیم نے دوبارہ پکارا۔

"ناشتہ کر لیں سائیں.. باہر آ کر منظر کشی کر لیں پھر... آج تو گھر بار کو لوٹنا ہے"

لیکن سائیں.. اپنے سلیپنگ بیگ میں منہ کھولے... بے سدھ پڑا تھا.. اور جاگتا نہ تھا..

کھنڈر میں... ملبے کے اندر... بارہ کہو کے مسمار شدہ بُل ڈوزر کے دانتوں سے کچلے ہوئے بام ودر کی تہہ میں.. دبے ہوئے ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی چلی جاتی تھی۔

چونکہ خاور ایک ہتھیار ڈال دینے والے سپاہی کی مانند ہاتھ کھڑے کر کے.. احتجاج کئے بغیر.. درخواست گزار ہونے اور اپنی محرومی اور ناانصافی کا چرچا کئے بغیر ایک بیگ اٹھا کر چپکے سے رخصت ہو گیا تھا اس لئے اس کا گھر... بلکہ اس کی اینٹیں.. کچھ دیواریں.. ملبے کے ٹیلے آس پاس کے گاؤں کے مکینوں اور ان کے بچوں کے لئے ایک خزانے کی تلاش بن چکے تھے.. وہاں کھوج کرنے سے اور کھودنے سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا.. شکستہ صوفے اور میزیں.. کچن کا سنک.. کموڈ اور پانی کی ٹونٹیاں.. دب چکے قالین.. ایش ٹریز.. دروازے.. کھڑکیاں.. الارم کلاک.. پردے.. ایک نیلا سویٹر.. غرض کہ وہ ہر شے جو کسی بھی گھر میں ہوتی ہے اور ہر گھر میں بچ سکتی ہے اس ملبے میں سے دریافت کی جا سکتی تھی.. اور وہاں کوئی والی وارث نہ تھا جو اس کی رکھوالی کرتا.. اس لئے آس پاس کے لوگوں نے کھود کھود کر اس خزانے کو دریافت کیا اور اپنے گھروں کو لے گئے۔ صرف ملبے کے اندر دفن ٹیلی فون کی گھنٹی

مسلسل بجتی چلی جاتی تھی کیونکہ اس کی تار بل ڈوزر کے دانتوں میں آ کر کٹنے سے بچ گئی تھی..

ایک بچے نے کھنڈر کی خاموشی میں کان لگا کر سنا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے... اس کے دونوں ہاتھ فارغ نہیں تھے.. ایک میں وہ وادی "کالاش کا ایک چوبی گھوڑا تھامے ہوئے تھا جو بالکل محفوظ تھا اور دوسرے ہاتھ میں مٹی سے بھرا ایک پرانا الارم کلاک تھا جس کی سوئیاں ابھی تک درست ہندسوں پر تھیں اور وہ ٹک ٹک کر رہا تھا.. دوسرے بچے خزانے کی تلاش میں ملبے کو کھود رہے تھے لیکن اسے ایک آواز سنائی دے رہی تھی.. اس نے چوبی گھوڑے اور الارم کلاک کو ایک نیلے اور مٹی سے آلودہ چیتھڑا نما سویٹر کے قریب رکھا.. کان لگا کر غور سے سنا.. پھر کچھ اینٹیں ہٹائیں جن کے نیچے خاک بسر ٹیلی فون دبا پڑا تھا اور اس کی گھنٹی کی آواز اینٹوں کے اٹھانے سے بلند ہو گئی تھی.. اور اس کے چونگے کو اٹھا کر... جیسے وہ ایک پلاسٹک کا بنا ہوا کھلونا ٹیلی فون ہو.. بچے نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"ہیلو جی... کون ہے؟"

"خاور... کیا یہ آپ ہیں..؟"

"ہاں جی..." بچے کی خزانے کی تلاش میں یہ کوئی آواز تھی جسے وہ نہیں سمجھتا تھا... اور ہنستا جاتا تھا..

"میں کولمبو سے بات کر رہی ہوں.. سلطانہ..."

"ہاں جی..." بچے نے پھر کہا اور زور سے سر ہلایا کہ یہ تو زبردست کھیل تھا..

"یو ساؤنڈ سٹرینج... لیکن میں پرسوں صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ رہی ہوں... تمہیں... آپ کو وہاں ہونا چاہئے... کیا... تم وہاں ہو گے؟"

بچے نے اپنے ننگے بازو پر اپنی ناک رکھ کر اسے پونچھا اور پھر ریسیور کی تار کھینچ کر اس ٹیلی فون کو بھی چوبی گھوڑے اور الارم کلاک کے ساتھ اپنے خزانے میں شامل کر لیا..

سائیں جاگتا نہ تھا اور فہیم آوازیں دیتا تھا.. کشتی کے اندر جھانکتا ہوا کہ.. صاحب ناشتہ تیار ہے.. صاحب منہ کھولے اپنے سلیپنگ میں بے سدھ پڑا تھا..

اور اس کے چہرے پر ایک مکھی بیٹھتی تھی.. کچھ دیر بیٹھتی تھی... اور بھنبھنا کر اڑتی تھی چہرے سے ذرا اوپر ہو کر اڑتی تھی اور پھر اپنے پروں کی بھنبھناہٹ موقوف کر کے اس کے چہرے پر بیٹھ جاتی تھی..

یہ کسی بھی موت کا.. سب سے پہلی... جہاں کووں نے آ کر راہنمائی کی تھی... یا سب سے آخری... موت کا ماحول تھا یا نہیں.. صرف وہ ایک مکھی جانتی تھی جو سائیں کے ادھ کھلے منہ کے ہونٹوں پر... کبھی ماتھے پر.. اور کبھی بالوں پر بیٹھتی تھی اور بھنبھنا کر اڑ جاتی تھی اور پھر آ بیٹھتی تھی..

اور اس مکھی سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا تھا کہ آیا تم جہاں بیٹھی ہو.. وہاں تمہارے باریک پاؤں تلے یخ بستگی کی مردہ ٹھنڈک اور مرگ ہے... یا تم زندگی کی آخری رمق پر بیٹھتی ہو اور تمہارے پاؤں کے نیچے کوئی ایک رگ پھڑکتی ہے جو زندگی کی علامت ہے۔ زندگی کی راکھ میں کوئی ایک چنگاری باقی ہے یا نہیں.. ایک مکھی سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا تھا..